بانگِ درا

شارح: اسرار زیدی

تشریح الفاظ: نثار اکبر آبادی
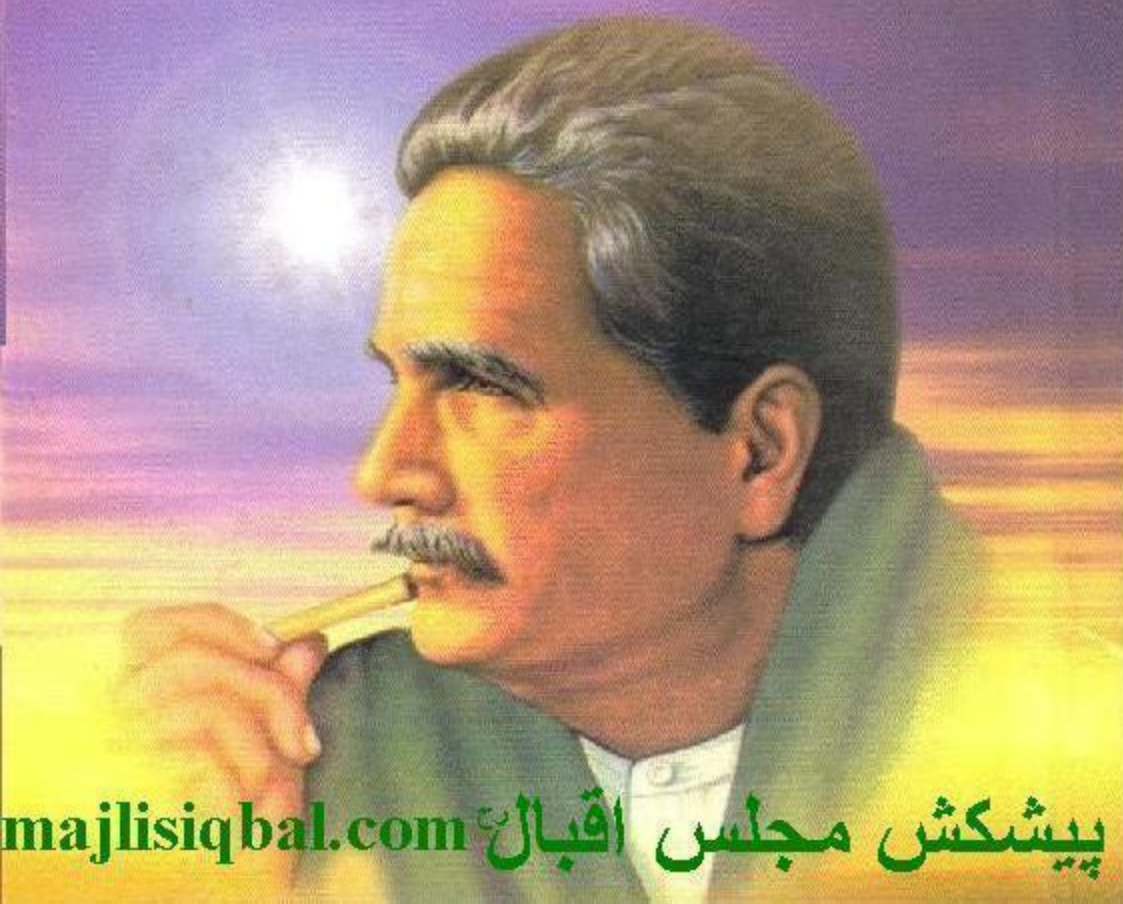
Majlis Iqbal Quaid-e-Azam Town, Lahore
مجلس اقبال مملکۃ البحرین
محمد اقبال
شارح: جناب اسرار زیدی
تشریح الفاظ: جناب نثار اکبرآبادی
بانگ درا ... 356-1
بالِ جبریل ... 584-357
ضربِ کلیم ... 818-585
ارمغان حجاز ... 909-819
محمد ابوبکر صدیق نے یہ کلیاتِ اقبالؒ (ندیم یونس پرنٹرز لاہور سے)
چھپوا کر شیخ محمد بشیر اینڈ سنز لاہور سے شائع کی

فہرست

حصہ سوم

محمد ابوبکر صدیق نے یہ کلیات اقبالؒ (ندیم یونس پرنٹرز لاہور سے)

چھپوا کر شیخ محمد بشیر اینڈ سنز لاہور سے شائع کی

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور فون:7660736

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حصہ اول

ہمالہ

001

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

امتحان دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوار ہندوستاں ہے تو
مطلع اول فلک جس کا ہو، وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہ دل دامن کش انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالم تاب پر

تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے
دامن موج ہوا جس کے لیے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برق سر کوہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی، جسے
دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبش موج نسیم صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبان برگ سے گویا ہے اس کی خامشی
دست گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنج خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراق دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلئی شب کو کھولتی ہے آ کے جب زلف رسا
دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر
اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا داغ جس پہ غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو۔

❁

اس نظم پر بات کرنے سے قبل اس امر کی نشاندہی ناگزیر ہے کہ جس طرح "بانگ درا" علامہ اقبال کی شاعری کا اولین مجموعہ ہے اسی طرح "ہمالہ" ان کی ابتدائی نظموں میں سے ہے اور "بانگ درا" کی بھی پہلی نظم ہے۔ "بانگ درا" کی پوری شاعری کے بارے میں مختصراً اس شرح کے دیباچے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اسی حوالے سے ہمالہ کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس میں اقبال اپنی مخصوص فکری سطح کی بجائے فطرت اور ایک پہلو سے وطنیت کے جذبے کا اظہار کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ دوسرے اردو شاعری کے مجموعوں اور "بال جبریل اور ضرب کلیم" میں اقبال نے جو فلسفیانہ اور فکری نقطہ نظر پیش کیا ہے اجتماعی سطح پر "بانگ درا" کی شاعری اس سے قدرے مختلف نظر آتی ہے۔ چنانچہ "ہمالہ" کو بھی اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔

پہلا بند معنی: ہمالہ: برف کا گھر (مراد پہاڑ)۔ دیرینہ روزی: لمبی عمر۔ **کلیم**: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب۔ وہ کوہ طور پر خدا سے باتیں کرتے تھے۔ **طور سینا**: پہاڑ کا نام۔ **چشم بینا**: دیکھنے والی آنکھ۔

مطلب: جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں نشاندہی کی گئی ہے کہ اس نظم کا پورا منظر نامہ "فطرت نگاری اور وطنیت" کے جذبے سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ اس بند میں اقبال "کوہ ہمالہ" کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو وہ بلند و بالا پہاڑ ہے جو نہ صرف یہ کہ مملکت ہندوستان کے محافظ اور فصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ تیری چوٹیوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ آسمان بھی جھک کر چوم رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیری بلندی آسمان سے بھی قربت رکھتی ہے۔

اے ہمالہ! تیرا وجود ہرچند کہ ابتدائے آفرینش سے قائم ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ تو اس شام و سحر کی گردش کے مابین اسی طرح زندہ و ایستادہ ہے جس طرح کہ ابتداء میں تھا اور لاتعداد صدیاں بیت جانے کے باوجود تجھ میں کسی کمزوری کے آثار نہیں پائے جاتے۔

اس شعر میں اقبال "حضرت موسیٰ علیہ السلام اور کوہ طور کے جلوے کی علامتوں کے حوالے سے ہمالہ سے کہتے ہیں کہ تیرا وجود تو ان کے لیے بھی ایک خصوصی حیثیت کا حامل ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر چشم بینا کے لیے تو ایک تجلی کا مظہر ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیری بلندی اور سرسبز وادیاں انسان کے لیے ایک عجوبہ کی طرح ہیں۔

دوسرا بند معنی: دیدۂ: آنکھ۔ **دامن کش**: دامن کھینچنے والا۔ **دستار فضیلت**: بزرگی کی پگڑی۔ **کلاہ مہر عالم تاب**: دنیا کو روشن کرنے والے سورج کی ٹوپی۔

مطلب: یہ درست ہے کہ اے ہمالہ تو بظاہر ایک پہاڑ ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ تو ہمارا محافظ بھی ہے اور ہندوستان کے لیے بھی ایک حفاظتی دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر تجھے ایک شاعر کا دیوان تصور کر لیا جائے تو اس کا مطلع یعنی اولین شعر آسمان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ تیرا وجود تو ہر انسان کے لیے باعث کشش ہے جس کی قربت اسے سکون فراہم کرتی ہے۔ تیری سطح اور چوٹیوں پر جو برف پڑی رہتی ہے وہ اس سفید رنگ کی دستار فضیلت کے مانند ہے جو بزرگوں کے سروں پر احتراماً باندھی جاتی ہے۔ یہ دستار فضیلت تو سورج کی زریں کلاہ پر بھی خندہ زن نظر آتی ہے۔ اس بند میں بھی علامہ نے مناظر فطرت کی خوبصورت منظر کشی کے ساتھ بلند پایہ علامت نگاری کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

کوہ ہمالہ کو کسی شاعر کے دیوان سے تشبیہ دینے کے علاوہ اس پر برفباری کے مناظر کو کسی بزرگ کی دستار فضیلت قرار دینے کے ساتھ سورج کی زریں کلاہ پر اس دستار کا خندہ زن ہونا یقیناً خوبصورت علامت نگاری کے مظاہر میں سے ہیں۔

تیسرا بند معنی: **ثریا**: وہ سات ستارے جو بہت فاصلے پر ہیں، پروین۔ **پہنائے فلک**: آسمان کی وسعت۔ **آئینہ سیال**: بہنے والا، رواں۔

مطلب: اے ہمالہ! تیری عمر رفتہ کا دور اس قدر طویل ہے کہ عہد ماضی کی شان و شوکت کا مظہر بن گیا ہے۔ تیری بلند و بالا چوٹیوں کا سایہ تیرے گرد و پیش کی وادیوں پر اس طرح پڑ رہا ہے جیسے وہاں خیمے آویزاں ہوں۔ یہی بلند و بالا چوٹیاں یوں لگتا ہے جیسے آسمان پر موجود ستاروں سے باتیں کر رہی ہوں۔ یہ درست ہے کہ تو زمین پر ایستادہ ہے لیکن تیری بلندی آسمان کی وسعتوں سے ہم کنار نظر آتی ہے۔ تیرے دامن میں پانی کے جو چشمے رواں دواں ہیں وہ اس قدر شفاف ہیں جس طرح سیال آئینے ہوں۔ اور یہاں جو ہوا چلتی ہے وہ ان چشموں کے پانیوں کو مزید شفاف بناتی ہے۔

چوتھا بند معنی: **رہوار ہوا**: ہوا کا گھوڑا۔ **کوہسار**: پہاڑ۔ **بازی گاہ**: کھیل کی جگہ۔ **فیل**: ہاتھی۔

مطلب: علامتیں اور استعارے اپنے کلام میں اقبال نے جس خوبی اور چابکدستی کے ساتھ استعمال کیے ہیں یہ اس کی ایک خوبصورت مثال کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اے ہمالہ! تیرے گرد و پیش اور ماحول کو دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ یہاں جو ہوا رواں دواں ہے وہ ایک تیز رو گھوڑے کی مانند ہے۔ اس کی رفتار کو مزید تیز کرنے کے لیے تیری چوٹیوں پر چمکنے والی بجلیوں نے بادلوں کے ہاتھوں میں ایک تازیانہ دے دیا ہے۔ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ تیرا دامن بھی ایک کھیل کے میدان کی طرح ہے۔ ایسا میدان جسے قدرت نے خود اپنے ہاتھوں سے بڑی صناعی کے ساتھ بنایا ہے۔ یہاں کس جوش و مسرت کے ساتھ بادل اس طرح محو پرواز ہیں جیسے وہ بے زنجیر ہاتھی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پانچواں بند معنی: **جنبش موج نسیم**: ہوا کی لہر کی روانی۔ **گہوارہ**: جھولا۔ **برگ**: پتا۔

مطلب: نظم کا یہ بند بھی سابقہ بند کے ساتھ موضوعاتی سطح پر مربوط ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ ایسا ماحول ہے جس صبح کی ہوا کی جنبش ایک گہوارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا گہوارہ جہاں کلیاں زندگی کے نشے میں جھومتی نظر آتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ کلیوں کی خاموشی اپنی پتیوں کی زبان سے یوں کہتی ہو کہ میرا تو پھول توڑنے والے سے بھی کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ مراد یہ ہے کہ ہمالہ کی اس بلندی تک انسان کی رسائی

ممکن نہیں۔ جہاں یہ کلیاں کھل رہی ہیں۔ اس بند کے آخری شعر میں ہمالہ زبان حال سے یوں گویا ہوتا ہے کہ میری خامشی یہی دراصل میری داستان حیات کی مظہر ہے اور قدرت کا بخشا ہوا یہ گوشہ ہی دراصل میری پرسکون آماجگاہ ہے۔

چھٹا بند معنی: فراز کوہ: پہاڑ کی بلندی۔ **شاہد قدرت**: معشوق۔ **عراق**: موسیقی کا ایک راگ۔

مطلب: اس بند میں بھی اقبال نے ایک طرح کی منظر کشی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمالہ کی بلندیوں سے ندی کی شکل میں جو پانی لہریں مارتا نیچے آتا ہے اس کی آواز سننے والوں کو یوں محسوس ہوتی ہے جیسے کوئی گا رہا ہو۔ ندی کا منظر اس درجے خوبصورت ہوتا ہے کہ کوثر و تسنیم کی موجیں بھی اس سے شرما جائیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ ندی مناظر فطرت کے مشاہدہ کرنے والے کو آئینہ دکھاتی ہوئی اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ اس کا انداز کچھ یوں ہوتا ہے کہ راہ میں آنے والے سنگریزوں سے کبھی بچ کر نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو کبھی ان سے ٹکرا بھی جاتی ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں اقبال ندی کو ایک مسافر کے طور پر تصور کر کے اس سے کہتے ہیں کہ تو اسی طرح دل لبھانے والی موسیقی کے ساز کو چھیڑتی جا کہ میرا دل تیری اس صدا کی معنویت سے پوری طرح آشنا ہے۔

ساتواں بند معنی: لیلٰی شب: لیلیٰ یعنی کالی رات۔ **غازہ**: پوڈر۔

مطلب: یہاں بھی اقبال' ہمالہ پر رات کی آمد اور تاریکی کی خوبصورت منظر کشی کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں کہ جب رات کی محبوبہ اپنی لمبی لمبی زلفیں دراز کرتی ہے تو ان لمحات میں آبشاروں کی صدائیں انتہائی دلکش اور دلنواز محسوس ہوتی ہیں کہ ان لمحوں کی خامشی پر گفتگو بھی قربان کی جا سکتی ہے۔ اس لمحے تو یوں لگتا ہے کہ درخت بھی کسی سوچ میں مبتلا ہیں مراد یہ ہے کہ پورا منظر خامشی اور سکوت سے ہم کنار ہے۔

اس بند کے آخری شعر میں ہمالہ پر سرشام شفق کا منظر پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ فطرت شاید اس کے چہرے پر رنگا رنگ غازہ مل رہی ہے اور یہ غازہ بے حد خوشنما محسوس ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب شام کے وقت شفق کی سرخی ہمالہ پر پڑتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے فطرت نے اس کے چہرے پر غازہ مل دیا ہو۔

آٹھواں بند معنی: مسکن: رہنے کی جگہ۔ **آبائے انساں**: انسان کے باپ دادا۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اپنے کلام کو تمام کرتے ہوئے اقبال ہمالہ سے یوں مخاطب ہوتے ہیں کہ "اے ہمالہ! ذرا مجھے اس وقت کا احوال تو بتا جب ہزارہا سال قبل باوا آدم نے یہاں آ کر تیرے دامن میں پناہ لی تھی۔ ظاہر ہے کہ تو ان لمحات کا رازدان ہے۔ ان ایام کی زندگی کس قدر سیدھی سادی ہو گی جس میں کسی نوع کا تکلف نہ تھا۔ اے ہمالہ! ذرا ان دنوں کے بارے میں ہمیں واقعات و حقائق سے آگاہ کر کہ وہ لمحات تو ہر طرح کے تکلفات سے نا آشنا تھے۔ آخری شعر میں اقبال ہمالہ کی خامشی سے مایوس ہو کر خود اپنی تخیلی اور تصوراتی کیفیت کا سہارا لیتے ہوئے اس سے ہی فرماتے ہیں کہ ان ایام کا نقشہ تم ہی مجھ سے بیان کر دو کہ یہ پہاڑ تو آخر ایک خاموش پتھر ہی نکلا۔ جب کہ تم میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ گزرے ہوئے ماضی کو پلٹا کر اس کی پوری داستان منظر عام پر لے آؤ۔

002

گل رنگیں

تو شناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں
اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیب محفل ہے شریک شورش محفل نہیں
یہ فراغت بزم ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں' میں سراپا سوز و ساز آرزو
اور تیری زندگانی بے گداز آرزو
توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں
یہ نظر غیر از نگاہ چشم صورت بیں نہیں
آہ! یہ دست جو اے گل رنگیں نہیں
کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گل چیں نہیں
کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا
سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اک برگ ریاض طور ہے
میں چمن سے دور ہوں' تو بھی چمن سے دور ہے
مطمئن ہے تو' پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں
زخمی شمشیر ذوق جستجو رہتا ہوں میں
یہ پریشانی مری سامان جمعیت نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغ خانہ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایہ قوت نہ ہو
رشک جام جم مرا آئینہ حیرت نہ ہو
یہ تلاش متصل شمع جہاں افروز ہے
توسن ادراک انساں کو خرام آموز ہے

*

یہ نظم بڑی حد تک نازک اور حساس کیفیات و جذبات سے ہم آہنگ ہے۔ جس میں اقبال نے ایک انسان اور پھول کی فطرت کا موازنہ کیا ہے۔ عملاً یہ نظم بھی ان کی ابتدائی نظموں میں سے ہے۔ تاہم اقبال کی اولین نظم "ہمالہ" سے قدرے مختلف نظر آتی ہے۔ اس میں اپنے اپنے مقام پر پھول اور انسان کی نفسی کیفیات کی جانب اشارے کیے گئے ہیں۔ لیکن اول و آخر جملہ مسائل کے باوجود انسان کی افضلیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلا بند **معنی:** **شناسا:** واقف' جاننے والا۔ **عقدۂ مشکل:** وہ گتھی جسے سلجھانا آسان نہ ہو۔ **گل رنگیں:** رنگین پھول۔ **زیب محفل:** محفل کی زینت۔ **فراغت:** مہلت' فرصت۔ **گداز:** نرم' گھلنا۔

مطلب: یہاں اقبال' پھول سے مخاطب ہیں اور فرماتے ہیں کہ تجھے اس حقیقت کا کیا علم کہ زندگی کے مسائل کون کون سے ہیں۔ اس لیے کہ یہ معاملات تو وہی جان سکتا ہے جس کے پہلو میں دل ہو اور شاید یہی چیز تیرے پاس موجود نہیں ہے۔ ہرچند کہ تیرے وجود سے محفل کی زینت میں تو اضافہ ہوتا ہے تاہم عملی سطح پر وہاں جو ہنگامے برپا ہوتے ہیں ان میں تیری شرکت کسی طور پر بھی ممکن نہیں کہ یہی تو انسانی سطح پر عملی جدوجہد کا حصہ ہے جس سے تو بہرحال محروم ہے۔ تو جس انداز سے ساکن و ثابت رہتا ہے وہ

انسانی فطرت سے کسی طور پر بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ کہ انسان تو ہر لمحے زندگی کی گوناگوں مشکلات و مسائل سے دوچار رہتا ہے۔

اس بند کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اے گل رنگیں! اس دنیا میں جہاں میں اور تو دونوں بودوباش رکھتے ہیں، وہاں میری طرح ہر انسان اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مضطرب اور پریشانیوں سے دوچار رہتا ہے جب کہ تیری زندگی میں تو سرے سے ایسی خواہش اور مقصد کا کوئی وجود ہی نہیں ہے کہ اس نوع کی خواہش اور تمنا تو صرف اہل دل کو ہی ہوتی ہے اور بس!

دوسرا بند **معنی**: دیدۂ حکمت: تدبیر والی آنکھ۔

مطلب: اس بند میں اقبال اپنی ذات کے حوالے سے پھول کو بتاتے ہیں کہ میرا یہ دستور نہیں کہ تجھے اپنی چھوٹی موٹی خوشیوں اور ضروریات کے لیے شاخ سے جدا کر دوں کہ یہ شیوہ تو محض ظاہر پرستوں کا ہے۔ جب کہ میں تو صورت اور سیرت دونوں کے حسن کا قائل ہوں۔ میرا ہاتھ کسی سنگدل گلچیں کا بھی نہیں ہے جو تحقیق اور ذاتی مقاصد کے لیے تجھے شاخ سے علیحدہ کر کے پتی پتی میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس میں تو اسی طرح تجھ کو پسند کرتا ہوں جیسے بلبل اپنی چاہت کا اظہار کرتی ہے۔

تیسرا بند **معنی**: مستور: چھپا ہوا۔

مطلب: اگر تیری پتیوں کو زبانوں کے مانند سمجھ لیا جائے تو اس کی کیا وجوہات ہیں کہ تو ہمیشہ خاموش رہتا ہے۔ اس خاموشی کا سبب وہ کون سا راز ہے؟ اے پھول! جو تیرے سینے میں چھپا ہوا ہے اور جس کو تو افشا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تو بھی میری طرح بہشت کا ایک فرد ہے لیکن آدم کی طرح میری طرح تجھے بھی وہاں سے نکالا مل چکا ہے۔ اس کے باوجود تو اس زندگی پر مطمئن ہے۔ جب کہ میں اپنی منزل کو پانے کے لیے بدستور جدوجہد کر رہا ہوں۔

چوتھا بند **معنی**: جام جم: جمشید کا پیالہ۔ سن: گھوڑا۔ ادراک: عقل۔

مطلب: اے پھول! تیرے برعکس میں جو ہر لحہ پریشان و مضطرب رہتا ہوں، کہیں یہی پریشانی میرے لیے وجہ سکوں نہ بن جائے۔ کہ یہ جگر سوزی اور کچھ پانے کی جدوجہد ہی انسان کی دانش و حکمت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور کائنات کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لیے اکساتی ہے۔ پھر میں جو خود کو کمزور و ناتواں سمجھ رہا ہوں شاید یہ کمزوری اور ناتوانی ہی میرے لیے قوت کا سرچشمہ بن جائے اور مجھ میں جو کچھ پانے کی جستجو ہے وہی حصول مقاصد کا ذریعہ بن جائے۔ کہ اس طرح ک مسلسل جستجو پورے زمانے کو روشنی عطا کرتی ہے اور یہی انسانی عقل و شعور میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

عہد طفلی

003

تھے دیار نو زمین و آسماں میرے لیے ... وسعت آغوش مادر اک جہاں میرے لیے

تھی ہر اک جنبش نشان لطف جاں میرے لیے ... حرف بے مطلب تھی خود میری زباں میرے لیے

دور طفلی میں اگر کوئی رلاتا تھا مجھے

شورش زنجیر در میں لطف آتا تھا مجھے

تکتے رہنا ہائے! وہ پہروں تلک سوئے قمر   وہ پھٹے بادل میں بے آواز پا اس کا سفر
پوچھنا رہ رہ کے اس کے کوہ و صحرا کی خبر   اور وہ حیرت دروغ مصلحت آمیز پر

آنکھ وقف دید تھی، لب مائل گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوق استفسار تھا

*

صرف دو بند پر مشتمل یہ مختصر سی نظم عملاً ایک باشعور اور صاحب فکر و نظر شاعر کی ابتدائی داستان حیات کا ایک حصہ ہے۔ اس نظم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے عہد بلوغیت میں جب شاعر اپنے بچپن پر نظر ڈالتا ہے تو اس کے تاثرات کیا ہوتے ہیں اور وہ ان تاثرات کو کس انداز میں بیان کرتا ہے۔

پہلا بند معنی: دیار نو: نیا شہر۔ **آغوش مادر:** ماں کی گود۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ اپنے ایام طفلی میں زمین اور آسمان تو میرے لیے قطعی اجنبی حیثیت کے حامل تھے۔ میری حقیقی پناہ گاہ تو ماں کی آغوش تھی جو فی الواقع ایک وسیع کائنات کے مانند محسوس ہوتی تھی۔ ہر متحرک شے میرے نزدیک دلچسپی کا باعث ہوتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ میری زبان سے بھی جو صدائیں برآمد ہوتی تھیں ان کا مفہوم میں خود بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اگر کسی تکلیف کے سبب رونے لگتا تو دروازے کی زنجیر کے کھنکھنانے سے ہی بہل جاتا تھا۔

دوسرا بند معنی: آوازپا: پاؤں کی آہٹ۔ **دروغ مصلحت آمیز:** اچھا نتیجہ پیدا کرنے والا جھوٹ۔ **وقف دید:** دیکھنے میں مصروف۔

مطلب: رات آتی تھی تو میں آنکھ جھپکے بغیر آسمان پر روشن چاند کو تکتا رہتا تھا۔ چاند جو بادلوں کے ٹکڑوں کے پیچھے بڑی خاموشی اور سکون کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہا ہوتا تھا۔ اپنے عزیز و اقارب سے جب میں چاند کے بارے میں سوالات کرتا تو اپنی لاعلمی کے سبب وہ مجھے اس کے بارے میں ایسی باتیں بتایا کرتے تھے 'اب جن کے بارے میں سوچ کر ہنسی آتی ہے۔ لیکن ان دنوں میں حیرت زدہ ہو کر خاموش ہو جاتا۔ ان دنوں ہر شے کو تکتا رہتا اور میں اپنے دل میں ہی سوال کرتا رہتا تھا۔

مرزا غالب

004

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا   ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزم سخن پیکر ترا   زیب محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفل ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار   جس طرح ندی کے نغموں سے سکوت کوہسار
تیرے فردوس تخیل سے ہے قدرت کی بہار   تیری کشت فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں

تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر ۔۔۔ محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر
شاہد مضموں تصدق ہے ترے انداز پر ۔۔۔ خندہ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر[1] میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطف گویائی میں تیری ہم سری ممکن نہیں ۔۔۔ ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں ۔۔۔ آہ! اے نظارہ آموز نگاہ نکتہ بیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر ۔۔۔ ہیں سراپا نالہ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر ۔۔۔ یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

*

یہ امر ناقابل تردید ہے کہ اردو زبان نے اب تک غالب جیسا شاعر پیدا نہیں کیا۔ عصر جدید میں بھی جب کہ اردو شاعری بے شمار تجرباتی مراحل سے گزر چکی اور گزر رہی ہے۔ اس کے باوجود جدید غزل کے شعراء بھی غالب کے اثر سے باہر نہیں نکل سکے۔ بلکہ اس عظیم شاعر نے غزل کی جو قندیل روشن کی تھی وہ اس کو آج بھی روشن رکھے ہوئے ہیں۔ اقبال کی زیر تشریح نظم مرزا غالب ایک بڑے شاعر کی جانب سے دوسرے بڑے شاعر کی عظمت کا اعتراف ہے۔ اقبال نے اس نظم میں جس طرح مرزا غالب سے اظہار عقیدت کیا ہے' اس سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی نظر میں اس عظیم شاعر کا کیا مقام تھا؟

پہلا بند **معنی**: تا کجا: کب تک۔

مطلب: اقبال یہاں غالب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تیرے وجود نے فکر انسانی پر یہ بات واضح کر دی کہ خیالات کی رو کس بلندی تک پرواز کر سکتی ہے۔ یعنی تیری متخیلہ کی بلندی تک رسائی کے لیے انتہائی فکر کی ضرورت ہے۔ شاعری کی بزم میں تیری ذات اس کی روح معلوم ہوتی ہے اور تیرا وجود اس کی رونق بھی رہا اور ان معنوں میں اس سے پوشیدہ بھی رہا کہ تیرے ہم عصر لوگ فی الواقع تیری شاعرانہ عظمت تک رسائی حاصل نہیں کر سکے۔

دوسرا بند **معنی**: بربط: سارنگی' ایک باجے کا نام۔ **کشت فکر**: سوچ کی کھیتی۔ **مضمر**: چھپا ہوا۔

مطلب: جس طرح رواں دواں گاتی گنگناتی ندی پہاڑوں کے سکوت میں ارتعاش پیدا کرتی ہے' اسی طرح اس کائنات میں تیری متخیلہ نے اہل ذوق کا دامن حکمت و دانش سے بھر دیا۔ تیرے خیالات نے فطرت کے مظاہر کو بھی بہار آشنا کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ تیری شاعرانہ فکر نے ایسی دنیائیں تخلیق کیں جو انسانی ذہن کو تازگی اور سرشاری سے ہمکنار کر گئیں۔

1۔ جرمن کا مشہور شاعر گوئٹے اس جگہ مدفون ہے۔

تیری شعری تخلیقات میں حکمت کے ساتھ ایسی شوخیاں بھی موجود ہیں جو ساکت و جامد تصاویر کو بھی لب کھولنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک غالب کی شاعری میں خیال و فکر اور آہنگ کا طلسم پوشیدہ ہے۔

تیسرا بند معنی: نطق: بولنا، گویائی۔ لب اعجاز: وہ لب جس کی باتیں معجزہ ہوں۔ آرامیدہ: آرام پائے ہوئے۔

مطلب: تیرے کلام میں ایسے اعجاز پوشیدہ ہیں جو انسانی قوت بیان کے لیے باعث فخر و ناز قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اور تیرے تخیل کی بلندی پر آسمان کا سب سے زیادہ بلند اور درخشندہ ستارہ بھی حیرت زدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ شاعری میں تیرا انداز بیان اس قدر منفرد اور دلنشین ہے جس پر مضامین خود نثار ہونے پر آمادہ رہتے ہیں۔ تیرے کلام میں ایسی تازگی اور مٹھاس ہے کہ اس کے بالمقابل شیراز کے حافظ اور سعدی جیسے بلند پایہ شعراء کا رنگ بھی پھیکا پڑ جاتا ہے۔ مراد یہ کہ غالب دوسرے باکمال شعراء سے بھی عظیم ہے۔

لیکن کتنا اندوہگیں انقلاب ہے کہ تو اب اس دلی میں مدفون ہے جو انحطاط و زوال کا نمونہ ہے اور تخلیقی و تہذیبی اعتبار سے اجڑ چکا ہے۔ غالب! تیرے ہم عصر شعراء میں عالمی سطح پر تجھ سا بلند پایہ شاعر تو جرمنی کا گوئٹے ہے جو وہاں کے مشہور اور زندہ شہر "ویمر" میں دفن ہے۔

چوتھا بند معنی: نظارہ آموز: دیدار سکھانے والا۔

مطلب: اے شاعر عظیم! جب تک کوئی تیرے فکر و تخیل کی بلندی سے آشنا نہیں ہوتا وہ تیری ذات سے کس طرح واقف ہو سکتا ہے اور تیرے انداز بیان کی برابری کا کیسے حقدار ہو سکتا ہے؟ نہ جانے تیرے بعد ہندوستان کی سرزمین تخلیقی سطح پر کیوں بنجر ہو گئی اور اب وہاں تجھ سا عظیم شاعر اور دانشور کیوں پیدا نہیں ہو رہا؟

حالانکہ اردو زبان ابھی ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہے اور اس کے عروج و ارتقاء کے لیے تجھ ایسے بلند پایہ شعراء درکار ہیں۔

پانچواں بند معنی: گہوارہ: جھولا۔ گہر: موتی۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال دہلی سے براہ راست مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو جو ابتداء سے ہی علم و ہنر کا گہوارہ رہی ہے۔ اب تیری وہ عظمت کیا ہوئی؟ تیرے گلی کوچے کیوں حکمت و دانش سے خالی نظر آتے ہیں؟ حالانکہ تیری خاک میں بے شمار ایسے ماہرین علم و حکمت دفن ہیں جن کی شہرت و عظمت سے خود تیرا وجود روشن اور درخشندہ ہے۔

لیکن اتنا بتا دے کہ کیا تیری خاک میں غالب سا بھی کوئی بلند پایہ شاعر دفن ہے جو علم و حکمت، تخیل اور شاعرانہ لطافت میں یکتائے روزگار ہے۔

ابر کوہسار

005

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا، کبھی گلزار ہے مسکن میرا شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے در افشاں ہونا ناقۂ شاہد رحمت کا حدی خواں ہونا
غم زدائے دل افسردۂ دہقاں ہونا رونق بزم جوانان گلستاں ہونا
بن کے گیسو رخ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہوں بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سبزۂ مزرع نوخیز کی امید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں

چشمۂ کوہ کو دی شورش قلزم میں نے اور پرندوں کو کیا محو ترنم میں نے
سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے غنچۂ گل کو دیا ذوق تبسم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامن کہسار میں دہقانوں کے

*

اقبال کی یہ نظم بھی مناظر فطرت کی آئینہ دار ہے۔ یہاں انہوں نے جو خوبصورت منظر نگاری کی ہے وہ انتہائی طور پر قابل داد ہے۔ پوری نظم بلند و بالا پہاڑوں پر چھائے ہوئے بادلوں کے مکالموں کی آئینہ دار ہے۔ بادل برستے ہیں تو کھیت سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں۔ کاشتکاری کے عمل میں کسان ان سے استفادہ کرتا ہے۔ باغوں میں پھلوں اور پھولوں کی کاشت بھی ان کے بغیر ممکن نہیں۔

پہلا بند معنی: **فلک بوس:** آسمان کو چومتا، یعنی بلند۔ **گل پاش:** پھول برسانے والا۔

مطلب: نظم کے تمام اشعار میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں ابر کہسار مکالمہ کرتا ہے کہ میری مستقل بود و باش تو آسمانوں کو چھونے والے بلند و بالا پہاڑوں پر رہتی ہے۔ لیکن زمین پر پھول بکھیرتا رہتا ہوں یعنی جب تک نہ برسوں پھولوں کی نمود ممکن نہیں۔ کبھی صحرا میں برستا ہوں اور کبھی باغوں پر بارش برساتا ہوں۔ اس اعتبار سے شہروں کے علاوہ ویران مقامات اور کبھی جنگل پر بھی میرا تسلط رہتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب بادل برستے ہیں تو زمین پر موجود تمام مقامات کو سیراب کرتے ہیں۔

ابر کہسار کہتا ہے کہ کبھی پہاڑوں کی وادیوں میں برستا ہوں تو وہاں اگا ہوا سبزہ جو مخمل کی مانند ہوتا ہے وہی میری آماجگاہ بن جاتا ہے۔

دوسرا بند معنی: **در افشاں:** موتی بکھیرنے والا۔ **ناقہ:** اونٹنی۔

مطلب: اس بند میں بھی ابر کہسار پہلے بند کے تسلسل کے ساتھ یوں مکالمہ کرتا ہے کہ قدرت نے مجھے بارش کی بوندوں کی شکل میں زمین پر موتی برسانا سکھایا ہے کہ یہ بوندیں موتیوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ میں جب برستا ہوں تو ان لمحات میں بوندوں کے گرنے سے جو خوبصورت اور دلکش آوازیں پیدا ہوتی ہیں ان کو رحمت باری کے لیے نغمہ سرائی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور جب خشک و بنجر کھیتوں پر برستا ہوں تو ان کی آبیاری سے کسانوں کے پژمردہ دل مسرتوں اور خوشیوں سے لبریز ہو جاتے ہیں اور جب باغوں پر برستا ہوں تو وہاں پھلوں اور پھولوں پر تازگی اور شباب جھلک اٹھتا ہے۔

میرا وجود تو حیات و کائنات کے لیے ایک دل خوش کن حیثیت کا مالک ہوتا ہے اور جب ہوائیں چلتی ہیں تو مجھے یکجا ہو کر زمین پر برسنے اور اسے نکھارنے میں مدد دیتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ بادل جب برستے ہیں تو نہ صرف یہ کہ فصلوں کی کاشت میں اضافہ ہوتا ہے' باغات میں پھل پھول کو زندگی اور نمو بخشتے ہیں بلکہ زمین کے حسن و زیبائش کا سبب بھی بنتے ہیں۔

تیسرا بند معنی: **مزرع نوخیز:** نئی اگی ہوئی کھیتی۔ **زادۂ بحر:** جو سمندر سے پیدا ہوا ہو۔

مطلب: اس بند میں ابر کہسار یوں مکالمہ کرتا ہے کہ پہلے بیان کے باوصف اگر میں کسی بستی پر سے برسے بغیر گزر جاتا ہوں تو جو کسان اور باغبان میرے برسنے کے منتظر ہوتے ہیں وہ ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس عالم میں رحمت باری کے طلبگار نظر آتے ہیں۔ ان کی امیدیں تشنہ رہ جاتی ہیں اور میرے برسنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ پھر جب کسی ندی پر زور شور کے ساتھ برستا ہوں تو اس کے پانی میں بھنور سے پڑنے لگتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میرے دم سے تازہ اگی ہوئی فصلیں اور باغوں کے سبزہ زار قائم ہیں۔ میں ان کے لیے امید و آس کی حیثیت رکھتا ہوں۔ میں سمندر سے پیدا ہوا ہوں اور سورج نے میری پرورش کی ہے۔ فطری اور سائنسی اصولوں کے مطابق سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے پھر بادل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے اس نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے۔

چوتھا بند معنی: **چشمۂ کوہ:** پانی کا سوتا۔ **قم:** اٹھ' کھڑا ہو۔ **شبستانوں:** امیروں کے سونے کی جگہ۔

مطلب: اس آخری بند میں ابر کہسار یوں گویا ہے کہ پہاڑوں سے برآمد ہونے والے چشموں کو میں نے ہی سمندر جیسا جوش و خروش عطا کیا۔ میرے سبب ہی گرمی کے مارے پرندے سکھ کا سانس لے کر نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ میری وجہ سے ہی پامال اور مرجھایا ہوا سبزہ پھر سے لہلہانے لگتا ہے اور یہ میں ہی ہوں کہ جب باغوں پر برستا ہوں تو غنچے چٹک کر خوشنما اور خوشبودار پھولوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں یعنی میرے بغیر یہ سب کچھ ممکنات سے نہیں ہے۔

میرے ہی فیض و برکت سے پہاڑوں کے دامن میں کسانوں کے جھونپڑوں میں بھی رونق آ جاتی ہے اس لیے کہ میرے سبب ان کی کھیتیاں لہلہاتی ہیں اور انہیں خوشحالی عطا کرتی ہیں۔ میں ان کے لیے مسرتوں کا باعث بنتا ہوں۔

006

ایک مکڑا اور مکھی

(ماخوذ)

(بچوں کے لیے)

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا
اس راہ سے ہوتا ہے گزر روز تمھارا

لیکن مری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت
بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا

غیروں سے نہ ملیے تو کوئی بات نہیں ہے
اپنوں سے مگر چاہیے یوں کھنچ کے نہ رہنا

آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری
وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا

مکھی نے سنی بات جو مکڑے کی تو بولی
حضرت! کسی نادان کو دیجے گا یہ دھوکا

اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا، پھر نہیں اترا

مکڑے نے کہا واہ! فریبی مجھے سمجھے
تم سا کوئی نادان زمانے میں نہ ہو گا

منظور تمھاری مجھے خاطر تھی، وگرنہ
کچھ فائدہ اپنا تو مرا اس میں نہیں تھا

اڑتی ہوئی آئی ہوئی خدا جانے کہاں سے
ٹھہرو جو مرے گھر میں تو ہے اس میں برا کیا!

اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں
باہر سے نظر آتا ہے چھوٹی سی یہ کٹیا

لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے
دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا

مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے
ہر شخص کو ساماں یہ میسر نہیں ہوتا

مکھی نے کہا: خیر یہ سب ٹھیک ہے لیکن
میں آپ کے گھر آؤں، یہ امید نہ رکھنا

ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا

مکڑے نے کہا دل میں، سنی بات جو اس کی
پھانسوں اسے کس طرح یہ کمبخت ہے دانا

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا

یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے بڑی بی
اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رتبا

ہوتی ہے اسے آپ کی صورت سے محبت
ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا

آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں
سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا

یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی!
پھر اس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گانا

مکھی نے سنی جب یہ خوشامد تو پسیجی
بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا

انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں برا میں
سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا

یہ بات کہی اور اڑی اپنی جگہ سے
پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اسے پکڑا

بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اڑایا

*

"بانگ درا" کے حصہ اول میں سات ایسی نظمیں شامل ہیں جو علامہ اقبال نے خصوصی طور پر بچوں کے لیے تخلیق کیں۔ ان نظموں کا بنیادی مقصد اقبال کے نزدیک بچوں کی ذہنی اور نفسیاتی تربیت تھی۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال بچوں کے معاملات میں کس قدر دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ درست ہے کہ ان سات نظموں میں سے بیشتر موضوعاتی سطح پر مغربی ممالک کے بعض شعراء کی تخلیقات سے ماخوذ ہیں۔ تاہم اہم بات یہ ہے کہ ان نظموں کی روح مشرقی ہے۔

پہلا بند معنی: کٹیا: جھونپڑی۔ نادان: بے وقوف۔

مطلب: زیر تشریح نظم "ایک مکڑا اور مکھی" بھی مغربی شاعر کی نظم سے ماخوذ ہے جس کے مطابق ایک مکڑا کسی مکھی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم ہر روز ادھر سے گزرتی ہو لیکن کبھی بھولے سے بھی تم نے میرے غریب خانے میں قدم رکھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔ یہ درست ہے کہ اگر غیروں سے نہ ملا جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اپنوں کے ساتھ اس طرح کی لاتعلقی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ اگر تم میرے گھر میں آؤ تو میری عزت افزائی ہو گی۔ میری یہ دعوت منظور کر لو تو سامنے جو سیڑھی ہے اس سے آجاؤ! مکھی نے مکڑے کی بات کو بغور سنا پھر گویا ہوئی کہ حضرت! یہ دھوکا کسی احمق کو دیجیے! اس لیے کہ میں تو اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہوں کہ جو آپ کی سیڑھی پر چڑھا پھر واپس نہیں آیا۔

دوسرا بند معنی: فریبی: دھوکہ باز۔ کٹیا: جھونپڑی۔

مطلب: اس مرحلے پر مکڑے نے بڑی نخوت کے ساتھ مکھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ تم مجھے دھوکے باز سمجھ کر نادانی کا ثبوت دے رہی ہو۔ میں نے جو تمہیں یہاں آنے کی دعوت دی تو محض تمہاری خاطرداری منظور تھی جب کہ اس میں میرا کوئی فائدہ نہ تھا۔ تم جانے کتنی دور دراز سے اڑتی ہوئی آ رہی ہو۔ اس میں برائی کیا ہے کہ چند لمحوں کے لیے یہاں رک کر سانس لے لو۔

ہر چند کہ میرا گھر باہر سے بالکل معمولی نظر آتا ہے لیکن اس میں کئی ایسی نادر اشیا موجود ہیں جنہیں دیکھ کر تم خوش ہو جاؤ گی۔ اندر جو دروازے موجود ہیں' ان پر میں نے خوش رنگ پردے لٹکائے ہوئے ہیں۔ اور جو دیواریں ہیں ان پر شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مہمانوں کے آرام کے لیے بستر بھی حاضر ہیں۔ تم جانتی ہی ہو کہ ہر شخص کو ایسی آسائشیں میسر نہیں ہوتیں۔ مکھی نے جواباً کہا بے شک تمہاری بات درست ہو گی۔ پھر بھی میں اچھی طرح اس حقیقت سے واقف ہوں کہ ان بستروں پر اگر کوئی بدقسمت سو جائے تو پھر قیامت تک نہیں اٹھ سکتا۔ لہٰذا مجھ سے یہ توقع نہ رکھنا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے تمہارے گھر آجاؤں گی۔

تیسرا بند معنی: کھٹکا: ڈر، خوف۔ مکھی کو اڑایا: مکھی کو کھایا۔

مطلب: مکھی کا جواب سن کر مکڑا حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ کم بخت تو بڑی ہوشیار نکلی۔ چنانچہ سوچنے لگا کہ

اس کو پھانسنے کے لیے کونسا حربہ آزمایا جائے؟ پھر چند لمحوں تک خاموش رہ کر یوں گویا ہوا کہ بی بی! بے شک اللہ نے آپ کو بڑا مرتبہ عطا کیا ہے۔ جو کوئی نظر بھر کر دیکھ لیتا ہے۔ آپ سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں ہیرے کی سی چمک ہے اور سر پہ اللہ نے کلغی سجائی ہے۔ آپ کی خوبصورتی' لباس اور نفاست میں کس کو شک ہو سکتا ہے؟ اور جب پرواز کے دوران جب آپ نغمہ سرا ہوتی ہیں تو قیامت کا سماں بندھ جاتا ہے۔

مکھی نے مکڑے کی جب یہ خوشامدانہ باتیں سنیں تو پسیج گئی اور کہنے لگی مجھے آپ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ اگر کئی اس طرح کی دعوت دے تو میں انکار کو خود بہت برا سمجھتی ہوں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ کسی کا دل توڑنا اچھا فعل تو نہیں۔ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اڑ کر جیسے ہی مکڑے کے پاس پہنچی تو اس نے اچھل کر مکھی کو دبوچ لیا۔ یوں بھی وہ کئی روز سے بھوکا تھا۔ چنانچہ کسی توقف کے بغیر مکھی کو ہڑپ کر گیا۔

ایک پہاڑ اور گلہری

007

(ماخوذ از ایمرسن)

بچوں کے لیے

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
ذرا سی چیز ہے' اس پر غرور! کیا کہنا
خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے؟
جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
کہا یہ سن کے گلہری نے' منہ سنبھال ذرا
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں

تجھے ہو شرم' تو پانی میں جا کے ڈوب مرے
یہ عقل اور یہ سمجھ' یہ شعور! کیا کہنا!
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے
بھلا پہاڑ کہاں! جانور غریب کہاں
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انہیں نکال ذرا
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
کوئی بڑا' کوئی چھوٹا' یہ اس کی حکمت ہے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے
نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

*

نظم بھی ایک مکڑا اور مکھی کی طرح بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کا بنیادی خیال ایمرسن کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ یہاں اس رائے کا اظہار غیر ضروری نہ ہوگا کہ اقبال نے بچوں کے لیے جو نظمیں تخلیق کی ہیں' ان میں خصوصیت کے ساتھ اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ لفظی اور نفسیاتی سطح پر بچوں کی سوچ اور معیار کے مطابق ہوں۔ یہ ایک سادہ سی نظم ہے لیکن بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ بڑوں کے لیے بھی سبق آموز ہے۔ فرماتے ہیں۔

① کسی پہاڑ نے زبانِ حال سے گلہری سے کہا کہ میرے مقابلے پر تو اتنی چھوٹی اور مختصر چیز ہے کہ اگر تجھ میں معمولی سی شرم بھی ہو تو کہیں جا کر ڈوب مرے۔

② ہر چند کہ تو مختصر سی شے ہے۔ اس کے باوجود نہ جانے کس برتے پر اتنا غرور کرتی ہے۔ تو نے تو یہ سمجھ رکھا ہے کہ تجھ سے زیادہ نہ کسی اور میں عقل اور سمجھ موجود ہے بلکہ خود کو ہر شخص سے زیادہ باشعور تصور کرتی ہے۔

③ تجھے دیکھ کر تو خدا کی شان نظر آ جاتی ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کتنی عجیب بات ہے جو بے حیثیت سے خود کو باحیثیت! اور جو بے شعور ہے وہ خود کو باشعور سمجھنے لگ جائے!

④ اے گلہری! میری شان و شوکت کے بالمقابل تیری تو حیثیت کچھ بھی نہیں جب کہ زمیں بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

⑤ جو عز و جاہ مجھ کو نصیب ہے وہ بھلا تیرے مقدر میں کہاں ہے؟ میں تو ایک بلند و بالا پہاڑ ہوں اور تو ننھی سی گلہری! تیری حیثیت میرے نزدیک بے معنی سی ہے۔

⑥ پہاڑ کی باتیں سن کر گلہری کو بھی طیش آ گیا وہ بڑے غصے سے یوں گویا ہوئی کہ تو نے جو کچھ کہا میں نے سن لیا۔ تیرے لیے مناسب تو یہ تھا کہ منہ سنبھال کر بات کرے مگر تو تو خوا مخواہ احساس برتری کا شکار ہے۔ تو نے جو کچھ باتیں کہی ہیں تجھ پر لازم ہے کہ انہیں اپنے دل سے نکال پھینک ورنہ خراب و خستہ ہو گا۔

⑦ اے پہاڑ! غور سے سن لے کہ اگر میں تیری طرح بلند و بالا نہیں تو اس حقیقت سے کیسے انکار کر سکے گا کہ تو بھی تو میری مانند چھوٹا نہیں ہے۔

⑧ اس حقیقت سے کس طرح انکار کر سکے گا کہ کائنات میں جو شے بھی تخلیق کی گئی ہے اس سے قدرت خداوندی ہویدا ہے۔ اور اگر قد و قامت کے اعتبار سے بڑا یا چھوٹا ہے تو اس امر کا تعلق اسی کی حکمت و دانش سے ہے۔

⑨ اس بات کو کیوں بھولتا ہے کہ خدا نے اگر تجھے بڑا بنا دیا تو اس امر سے اختلاف ممکن نہیں تو یہ بتا کہ قدرت نے جہاں تیرے قد کو اس قدر بلند کیا تو مجھے بھی تو درخت کی بلندیوں پر چڑھنا سکھا دیا ہے۔

⑩ یہ بھی جان لے کہ صرف بلندی ہی کوئی خوبی نہیں ہے کہ تو تو اس قدر مجبور و معذور ہے کہ اپنی جگہ سے ایک قدم آگے کی طرف بھی حرکت نہیں کر سکتا۔

(11) اے پہاڑ! اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ تو واقعی بڑا ہے تو میں ایک معمولی سی شے چھالیہ تیرے پاس رکھے دیتی ہوں اگر تجھ میں کوئی ہنر اور طاقت موجود ہے تو اس کو ہی توڑ کر دکھا دے۔

(12) تو اپنی بلندی پر اس قدر غرور نہ کر بلکہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ خدائے عز و جل نے اس عالم رنگ و بو میں جن چیزوں کو بھی پیدا کیا ہے ان میں سے کوئی شے بھی بیکار نہیں بلکہ ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد لیے ہوئے ہے۔

008

ایک گائے اور بکری

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں　　تھی سراپا بہار جس کی زمیں
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں　　ہر طرف ندیاں تھیں صاف رواں
تھے اناروں کے بے شمار درخت　　اور پیپل کے سایہ دار درخت
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں　　طائروں کی صدائیں آتی تھیں
کسی ندی کے پاس اک بکری　　چرتے چرتے کہیں سے آ نکلی
جب ٹھہر کر ادھر ادھر دیکھا　　پاس اک گائے کو کھڑے پایا
پہلے جھک کر اسے سلام کیا　　پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں!　　گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں
کٹ رہی ہے بری بھلی اپنی　　ہے مصیبت میں زندگی اپنی
جان پر آ بنی ہے، کیا کہیے　　اپنی قسمت بری ہے، کیا کہیے
دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں　　رو رہی ہوں بروں کی جان کو میں
زور چلتا نہیں غریبوں کا　　پیش آیا لکھا نصیبوں کا
آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے　　اس سے پالا پڑے، خدا نہ کرے
دودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے　　ہوں جو دبلی، تو بیچ کھاتا ہے
ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے　　کن فریبوں سے رام کرتا ہے
اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں　　دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
بدلے نیکی کے یہ برائی ہے　　میرے اللہ! تری دہائی ہے
سن کے بکری یہ ماجرا سارا　　بولی، ایسا گلہ نہیں اچھا
بات سچی ہے بے مزا لگتی　　میں کہوں گی مگر خدا لگتی
یہ چراگہ، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا　　یہ ہری گھاس اور یہ سایا
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں　　یہ کہاں، بے زباں غریب کہاں
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں　　لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اس کے دم سے ہے اپنی آبادی　　قید ہم کو بھلی، کہ آزادی؟
سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا　　واں کی گزران سے بچائے خدا
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا　　ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا

قدر آرام کی اگر سمجھو آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو
گائے سن کر یہ بات شرمائی آدمی کے گلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بھلا برا اس نے اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

٭

یہ نظم اٹھارھویں صدی کے مشہور برطانوی شاعر ولیم کاؤپر کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ یہ نظم بھی پہلی دو نظموں کی طرح ایک مکالمے پر مشتمل ہے لیکن اس بار مکالمہ "گائے اور بکری" کے مابین ہے۔ نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان کو بلاجواز کسی دوسرے سے گلہ مند نہیں ہونا چاہیے۔
اس نظم کے ابتدائی چار اشعار میں اقبال ایک سرسبز چراگاہ کا منظر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس چراگاہ میں ہرے بھرے درختوں اور پودوں کی فراوانی' بہار کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہر جانب شفاف پانی کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اناروں کے پھل دار اور پیپل کے بے حساب درخت موجود تھے۔ چراگاہ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ہر جانب پرندے چہچہا رہے تھے۔
(1) اسی چراگاہ میں ایک ندی کے پاس ہی کہیں سے ایک بکری چرتے چرتے آگئی۔ ادھر ادھر نظر آئی تو دیکھا کہ قریب ہی ایک گائے بھی اپنا پیٹ بھرنے میں مصروف ہے۔
(2) بکری نے پہلے ادب و احترام کے ساتھ گائے کو سلام کرتے ہوئے اس کی خیر و عافیت کے بارے میں پوچھا پھر بولی! یہ تو فرمایئے' آپ کے مزاج کیسے ہیں؟
(3) گائے نے قدرے بیدلی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اچھے ہیں۔ بری بھلی کٹ ہی رہی ہے۔ البتہ عملی طور پر زندگی مصائب سے دوچار ہے۔
(4) اے بکری! کیا حال پوچھتی ہے۔ جان پر بنی ہوئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قسمت ہی بری ہے۔ ہر جانب خدا کی شان کا مظاہرہ کرتے ہوئے بروں کی جان کو رو رہی ہوں۔ مقدر میں جو لکھا ہے وہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ آخر غریبوں کا زور ہی کس پر چل سکتا ہے؟ اب تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آدمی کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کرنا چاہیے۔ خدا کرے اس سے کسی کا واسطہ نہ پڑے۔
(5) یہ آدمی تو ایسا احسان ناشناس ہے کہ اگر دودھ کم دوں تو ہر لحہ گلے شکوے کرتا رہتا ہے۔ دبلی ہو جاؤں تو مجھے قصابوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالتا ہے۔ میرے ساتھ طرح طرح کے ہاتھ کرتا رہتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بچوں کی پرورش کر رہی ہوں۔ میرا دودھ نہ ہو تو وہ بھوکوں مرجائیں۔ لیکن اس نیکی کا بدلہ وہ برائی ہی سے دیتا ہے۔
(6) گائے کی زبانی یہ احوال سن کر بکری نے کہا کہ اس انداز کی شکایت اور گلہ مناسب نہیں ہے۔ ہر چند کہ سچی بات ہمیشہ کڑوی لگتی ہے لیکن سچ کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتی۔ یہ تو بتایئے کہ جو ہری ہری گھاس آپ چر رہی ہیں اور یہاں جو سایہ دار درخت موجود ہیں جن کے پتوں سے چھن چھن کر ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں کیا یہ محض آدمی کی محنت اور مشقت کے سبب سے وجود میں نہیں آئیں اور کیا ہم غریب اور بے سروسامان مویشی ان سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ یہ آدمی ہی ہے جس کے دم سے ہمیں ایسی سہولتیں میسر

آئی ہیں۔ پھر آپ کا گلہ قطعی بے جا نظر آتا ہے۔
(7) بکری کی حقیقت بیانی سے گائے کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ شرماتے ہوئے بولی، تم مجھ سے بے شک چھوٹی ہو لیکن تمہاری باتیں سچی ہیں اور دل کو بھی لگتی ہیں۔

بچے کی دعا

009

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری — زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے — ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب — علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا — درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

*

اقبال کے بقول اس نظم کا مرکزی خیال مغرب کے ایک شاعر کی نظم سے لیا گیا ہے۔ اس کے باوجود صرف چھ اشعار پر مشتمل دعائیہ نظم بچوں کی مقبول ترین نظم ہے۔ پاکستان کے تو ہر سکول میں دن کی تعلیم کا آغاز اسی نظم سے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی متحدہ ہندوستان کے سکولوں میں بھی یہ دعا بڑی باقاعدگی سے پڑھی جاتی تھی۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔

خدائے عز و جل کی بارگاہ میں بچہ دعا کرتا ہے کہ میرے لبوں پر یہ دعا آرزو بن کر مچل رہی ہے کہ میری زندگی شمع کی مانند ہو۔ شمع جو گھور اندھیرے کو منور کر دیتی ہے لیکن خود جلتی رہتی ہے۔ دنیا میں جہالت کی جو تاریکی چھائی ہے، بار الٰہ! وہ میرے علم کی بدولت دور ہو جائے۔ جس طرح پھول چمن کی زیبائش اور زینت کا سبب ہوتا ہے اسی طرح میری ذات میرے وطن کی زیبائش کا سبب بن جائے۔

خداوندا! جس طرح پروانہ شمع پر نثار ہو کر زندۂ جاوید ہو جاتا ہے اسی طرح مجھ کو بھی صلاحیت عطا کر کہ اپنی جدوجہد اور قربانی سے وطن کو سنوار سکوں۔ میری ذمہ داری یہ ہے کہ ہر شخص سے محبت کروں، غریبوں، کمزوروں اور ضرورتمندوں کے کام آؤں۔

میرے مولا مجھے ہر طرح کی برائی سے بچا کر نیکی کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا کر۔

010

ہمدردی
(ماخوذ از ولیم کوپر)
بچوں کے لیے

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی اڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل چمکا کے مجھے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

*

علامہ اقبال نے خود بتایا ہے کہ بچوں کے لیے اس نظم کا مرکزی خیال انہوں نے برطانیہ کے ایک شاعر ولیم کوپر کی نظم سے لیا ہے۔ بچوں کے لیے اقبال کی دوسری نظموں کی طرح "ہمدردی" بھی ایک سیدھی سادی نظم ہے جس میں ایک بلبل اور جگنو کے مابین مکالمہ ہے۔ اس میں جو اشعار شامل ہیں ان کے مطالعہ سے ہی اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظم کس قدر سبق آموز ہے۔

نظم میں بتایا گیا ہے کہ کسی درخت کی شاخ پر ایک بلبل تنہا اور اداس بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ سارا دن تو دانہ دنکا چگنے میں گذر گیا اور اب رات سر پر آگئی ہے۔ ساری فضا پر تاریکی چھا گئی ہے۔ ایسے میں کس طرح اپنے گھونسلے تک پہنچ سکوں گا؟

بلبل کی یہ دکھ بھری داستان قریب کے درخت پر بیٹھے ہوئے ایک جگنو نے بھی سن لی۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ عود کر آیا' کہنے لگا۔ بے شک میں ایک حقیر سا کیڑا ہوں۔ اس کے باوجود تمہاری مدد کے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں۔ اے بلبل! اس بات کا غم نہ کرو کہ رات تاریک ہے۔ اور ہر سمت اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ تاہم مجھ میں قدرت نے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ اپنی روشنی سے تمہارے راستے کی تاریکی دور کر دوں۔ باری تعالٰی نے تو میرے جسم کو روشنی عطا کر کے دیئے کے مانند بنا دیا ہے۔ چنانچہ تمہاری رہنمائی کا فریضہ اپنے ذمے لیتا ہوں۔ نظم سے یہ سبق ملتا ہے کہ دنیا میں وہی لوگ اچھے ہوتے ہیں جو مشکل میں دوسروں کے کام آتے ہیں۔

ماں کا خواب

011

(ماخوذ)

بچوں کے لئے

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب
بڑھا اور جس سے مرا اضطراب

یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں

لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال
قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال

جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی
تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی

زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے
دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے

وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
خدا جانے جانا تھا ان کو کہاں

اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر
مجھے اس جماعت میں آیا نظر

وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا

کہا میں نے پہچان کر میری جاں
مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟

جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار

نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی
گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی

جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب
دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب

رلاتی ہے تجھ کو جدائی مری
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا
دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا

سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

*

نظم ماں کا خواب بھی بچوں کی دیگر نظموں کی طرح ایک نظم ہے۔ یہ نظم بھی کسی مغربی شاعر کی نظم سے ماخوذ ہے جو ایک ایسی ماں کے خواب پر مشتمل ہے جس کا بچہ وفات پا چکا ہے۔ اس کے غم میں وہ مسلسل آہ و زاری کرتی ہے۔ دوسری نظموں کی طرح بچوں کے لیے یہ نظم بھی ایک پس منظر لیے ہوئے ہے۔ فرماتے ہیں:

ایک ماں اپنا خواب بیان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ رات کو سوتے ہوئے کیا دیکھتی ہوں کہ میں کہیں جا رہی ہوں لیکن اس قدر تاریکی ہے کہ راستہ نظر آتا ہے۔

اس منظر سے میری بے چینی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ خوف کے مارے کانپنے لگی اور قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔

کچھ حوصلہ کر کے آگے بڑھی تو دیکھا لڑکوں کی ایک لمبی قطار ہے جو ایک جانب رواں دواں ہے۔ ان کے لباس سبز ہیں اور وہ ہاتھوں میں جلتے ہوئے چراغ لیے ہوئے ہیں۔ بڑی خاموشی کے ساتھ چل رہے تھے۔ نہ جانے ان کی منزل کونسی تھی؟ اس قطار میں مجھے میرا بیٹا بھی نظر آیا جو قطار کے آخر میں قدرے

آہستگی سے چل رہا تھا۔ اس ہاتھ میں بھی اگرچہ ایک چراغ تھا لیکن بجھا ہوا تھا۔
اس نے بیٹے کو پہچان کر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ تو کہاں چلا گیا تھا۔ تیری جدائی میں میری حالت تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہر وقت روتی رہتی ہوں۔ اس لمحے بیٹے نے قدرے دکھ کے ساتھ منہ پھیر لیا اور جواب میں کہا کہ آپ کی آہ و زاری سے میرا چراغ بجھ کر رہ گیا ہے اور اس سے مجھے تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

پرندے کی فریاد

012

(ماخوذ)

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا' اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا
آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں
کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں' میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں' میں غم سے مر نہ جاؤں
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے' غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجکو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

*

بچوں کے لیے اقبال کی یہ نظم برطانیہ کے شاعر "ولیم کوپر" کی ایک نظم کا آزاد اردو ترجمہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آزادی خواہ انسان کے خواہ پرندے کے لیے بھی ایک نعمت سے کم نہیں۔ غلامی تو ایک لعنت ہے۔ اسی موضوع پر علامہ نے ایک پرندے کے مکالمے کو ان اشعار میں پیش کیا ہے۔ یہ پرندہ پنجرے میں محبوس ہے اور زبان حال سے کہتا ہے۔
آج مجھے وہ گزرا ہوا زمانہ یاد آ رہا ہے' جب میں باغ میں دوسرے پرندوں کے ساتھ مل کر چہچہایا کرتا تھا۔ اب وہ آزادی کہاں نصیب ہے جب میں اپنی مرضی سے گھونسلے میں آیا جایا کرتا تھا۔ جس لمحے ماضی کی باتیں یاد آتی ہیں تو دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ وہ لمحات بھی یاد آتے ہیں جب کلیوں پر شبنم گرتی تھیں اور وہ کھل کر پھول بن جایا کرتی تھیں۔ اب تو میرے ساتھی بلبل کی نہ صورت نظر آتی ہے نہ ہی اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہی تو میرا ہم سفر تھا۔ جس کے دم سے میرا گھر آباد تھا۔ میں پنجرے میں بند ہوں۔

اس کی آواز تک کانوں میں نہیں آتی۔ اے کاش! یہاں سے رہائی میرے بس کی بات ہوتی۔
میں کس قدر بدنصیب پرندہ ہوں جو گھر کے لیے ترس رہا ہوں۔ میرے تمام ساتھی وطن میں ہیں اور میں یہاں قید میں پڑا ہوا ہوں۔ باغ میں بہار آئی ہوئی ہے اور کلیاں مسکرا رہی ہیں جب کہ میں اس تاریک پنجرے میں گرفتار اپنے مقدر کو رو رہا ہوں۔ اس قید کا دکھڑا سننے والا بھی کوئی نہیں۔ مجھے تو اب یہ خدشہ ہے کہ آزادی کے غم میں کہیں اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں!
صورت یہ ہے کہ جس وقت سے اپنا وطن اور گھر چھنا ہے تو غموں سے نڈھال ہو رہا ہوں۔ ہر وقت دل گرفتہ رہتا ہوں۔ میں جس لے میں فریاد کر رہا ہوں اسے گانا سمجھ کر سننے والوں کو لطف اندوز نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ تو ایک دکھے ہوئے دل کی فریاد ہے۔ اے مجھے قید کرنے والے! خدارا اس پنجرے سے آزاد کر دے کہ میں ایک بے زبان قیدی ہوں تو مجھے چھوڑ کر دعا قبول کر لے۔

خفتگان خاک سے استفسار

013

مہر روشن چھپ گیا اٹھی نقاب روئے شام
شانہ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام
یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے
محفل قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے
کر رہا ہے آسماں جادو لب گفتار پر
ساحر شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر
غوطہ زن دریائے خاموشی میں ہے موج ہوا
ہاں، مگر اک دور سے آتی ہے آواز درا
دل کہ ہے بیتابی الفت میں دنیا سے نفور
کھینچ لایا ہے مجھے ہنگامہ عالم سے دور
منظر حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں!
ہم نشین خفتگان کنج تنہائی ہوں میں
تھم ذرا بیتابی دل! بیٹھ جانے دے مجھے
اور اس بستی پہ چار آنسو گرانے دے مجھے
اے مے غفلت کے سرمستو! کہاں رہتے ہو تم!
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
وہ بھی حیرت خانہ امروز و فردا ہے کوئی؟
اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی؟
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا؟
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟
واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا؟
اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا؟
یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل
شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگل جاتا ہے دل؟
رشتہ و پیوندیاں کے جان کا آزار ہیں
اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں؟
اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے
روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟
کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے؟
قافلے والے بھی ہیں، اندیشہ رہزن بھی ہے؟
تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے؟
خشت و گل کی فکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے؟
واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا؟
امتیاز ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟
واں بھی کیا فریاد بلبل پر چمن روتا نہیں؟
اس جہاں کی طرح واں بھی درد دل ہوتا نہیں؟

باغ ہے فردوس یا اک منزلِ آرام ہے؟ یا رخِ بے پردۂ حسنِ ازل کا نام ہے؟
کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے؟ آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصدِ تادیب ہے؟
کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے؟ موت کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں' کیا راز ہے؟
اضطرابِ دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے علمِ انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے؟
دید سے تسکین پاتا ہے دلِ مہجور بھی؟ لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی؟
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا؟ واں بھی انساں ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا؟
آہ! وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے؟ یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

*

چھبیس اشعار کی یہ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے حصے میں صرف چھ اشعار ہیں۔ دوسرے میں بارہ اور آخری حصے میں آٹھ اشعار ہیں۔ پہلے حصے میں اقبال شام کے اوقات میں ایک قبرستان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ دوسرے حصے میں حیات و کائنات کے بالمقابل حیات بعد از ممات کا تقابلی جائزہ ہے جب کہ تیسرا حصہ بھی کم و بیش اسی نوعیت کے جائزے پر مشتمل ہے۔

① **معنی: خفتگانِ خاک**: خاک میں سوئے ہوئے۔ **استفسار**: سوال۔ **مہر**: سورج۔ **روئے شام**: شام کا چہرہ۔ **ساحر**: جادوگر۔ **غوطہ زن**: غوطہ لگانا' ڈبکی لگانا۔ **نفور**: نفرت کرنے والا۔

مطلب: شام ڈھل رہی ہے اور سورج غروب ہو چکا ہے۔ چاروں طرف شام کے سائے پھیل رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت اپنے تمام مناظر کے ساتھ ڈوبنے والے سورج کے غم میں ماتم کناں ہے۔ یوں تو نہیں کہ آسمان نے گفتگو کرنے والے لبوں پر سحر پھونک دیا ہے اور رات کا کردار ایک ایسے ساحر کے مانند ہے جو زندہ انسانوں پر خواب طاری کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ہوا بھی ساکت ہو کر رہ گئی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس کیفیت میں بھی ایک ایسی آواز سنائی دے رہی ہے جیسے کسی سرگرم سفر قافلے میں ہراول دستے کے اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز ہو۔

یہی وہ عالم ہے جس نے مجھے (یعنی اقبال کو) اس عالمِ فانی سے متنفر کر دیا ہے اور اس کو ترک کر کے اس قبرستان میں آگیا ہوں جہاں زندگی سے گزر جانے والے کنجِ تنہائی میں خاموش سو رہے ہیں۔ یہاں میں بھی ان کا ہم نشیں ہوں۔

② **معنی**: **مےِ غفلت**: غفلت کی شراب۔ **امروز و فردا**: آج اور کل۔ **پیکارِ عناصر**: عنصروں کی لڑائی۔ **افتاد**: مصیبت' آفت۔ **امتیازِ ملت و آئیں**: قوم اور شرع کا فرق۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال بڑے دکھ بھرے اور اضطراب انگیز لہجے میں اہلِ قبور سے استفسار کرتے ہیں کہ تمہاری اس غمناک اور اندوہگیں بستی پر میں اشک افشانی کرنے پر مجبور ہوں لیکن اتنا تو بتاؤ کہ جس بستی میں تمہاری بود و باش ہے اس کی کیفیت کیا ہے؟ کیا یہ بستی بھی میری دنیا کی مانند ہے جہاں ہر لمحہ انسان' انسان سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ کیا یہاں بھی تم میری دنیا کے باشندوں کی طرح مجبور و معذور ہونے کے ساتھ ہر طرح کی محرومیوں کا شکار ہو؟

اے اہل قبور! کیا تمہاری بستی میں بھی شمع کی روشنی پر پروانہ اپنی جان' نثار کر دیتا ہے؟ پھول اور بلبل کے بارے میں جو روایتی داستانیں ہماری دنیا میں موجود ہیں کیا تمہاری بستی بھی اسی نوعیت کی داستانوں سے مزین ہے۔ میری دنیا میں تو شاعر کا ایک مصرعہ ہی دل کو تڑپانے کا موجب ہوتا ہے۔ کیا تمہارے ساتھ تمہارا دل بھی شعر کی حدت سے پگھل جاتا ہے۔

جس طرح اس دنیا میں انسانی رشتے باہمی نفرتوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ کیا تم لوگ بھی اسی صورت حال سے دوچار ہو؟ اس دنیا کی معیشت تو بے شمار جھمیلوں میں گھری ہوئی ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ ہمارے معاشرے کی طرح کیا تمہارے بھی بجلی' کسان اور کچے گھروندے ہیں۔ کیا وہاں بھی اہل قافلہ کو رہزنوں سے لٹ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ کیا وہاں کے پرندے بھی اپنے گھونسلوں کے لیے تنکے چنتے ہیں اور کیا ہماری طرح تم لوگ بھی مکانوں کی تعمیر کے لیے اینٹ اور گارے کا استعمال کرتے ہو۔ یہ بھی بتا دو کہ جس طرح ہمارے لوگ اپنی حقیقت کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور ذاتی عقیدوں کے جنون میں مبتلا ہیں۔ کیا تمہارے ہاں بھی یہی معاملات ہیں؟ ہمارے معاشرے میں ظلم و جبر کے خلاف جس طرح آواز بلند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کیا تمہاری دنیا کی صورت حال بھی یہی ہے؟

③ **معنی: معصیت سوزی**: گناہوں کو جلانا۔ **تادیب**: سزا' گوشمالی۔ **ہست و بود**: ہستی اور وجود مراد زندگی۔ **مہجور**: ہجر' جدائی۔ **لن ترانی**: تلمیح ہے۔ مطلب ہے کہ اے موسیٰ! تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ **قتیل**: مارا ہوا۔ **گنبد گرداں**: گھومنے والا گنبد۔

مطلب: یہ اشعار بھی دوسرے حصے کا تسلسل ہیں جن میں اقبال خفتگان خاک سے سوال کرتے ہیں کہ یہ تو بتاؤ! تمہاری دنیا میں جس خطے کا نام بہشت ہے کیا وہ کوئی باغیچہ ہے یا آرامگاہ ہے یا پھر اس مقام پر حسن ازل بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا ہے؟ جہنم جو ہے کیا اس کے شعلوں میں گنہگاروں کو ڈال کر سزا دیتا ہے یا پھر یہی شعلے گناہوں کو بھسم کرنے کا ذریعہ ہیں؟ اس دنیا میں تو انسان اپنے مادی جسم کے باوجود محو پرواز رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن تمہاری دنیا میں بھی کیا یہی صورت ہے؟ یہ بھی بتاؤ! کہ ہم جس شے کو موت کہتے ہیں کیا تم اس راز سے آگاہ ہو؟

اے اہل قبور! ہماری دنیا میں تو زندگی اور موت کا مسئلہ انتہائی اضطراب کا سبب ہے۔ کیا تمہاری دنیا میں بھی علم اتنا ہی محدود ہے؟ محبوب کی ایک جھلک سے کیا وہاں بھی سکون قلب حاصل ہوتا ہے یا پھر کوہ طور پر اس دنیا میں حضرت موسیٰؑ کو خدا نے اپنا جلوہ دکھانے سے انکار کیا تھا کیا وہاں بھی ایسا ہوتا ہے؟ کیا تمہاری دنیا میں بھی تحقیق و جستجو سے روح کو آسودگی نصیب ہوتی ہے اور کیا وہاں بھی فرد عقل و فہم کا ادراک رکھتا ہے؟ مجھے اتنا بتا دو کہ تمہاری محبت کی تجلی سے نور کا سراپا بنی ہوئی ہے یا وہاں بھی نفرتوں کی تاریکی چھائی ہوئی ہے؟ کائنات کا سب سے بڑا راز موت ہے جو منکشف نہ ہونے کے سبب قلب انسان میں کانٹے کی طرح معلق ہے۔

شمع و پروانہ

014

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع! پیار کیوں؟ — یہ جان بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟

سیماب وار رکھتی ہے تیری ادا اسے
آداب عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے؟
کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا
پھونکا ہوا ہے کیا تری برق نگاہ کا؟
آزار موت میں اسے آرام جاں ہے کیا؟
شعلے میں تیرے زندگی جاوداں ہے کیا؟
غم خانہ جہاں میں جو تیری ضیا نہ ہو
اس تفتہ دل کا نخل تمنا ہرا نہ ہو
گرنا ترے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذت سوز و گداز ہے
کچھ اس میں جوش عاشق حسن قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو، یہ ذرا سا کلیم ہے

پروانہ اور ذوق تماشائے روشنی
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی

*

معنی: سیماب وار: پارہ کی طرح بیقرار۔ آزار موت: مرنے کا دکھ۔ تفتہ دل: جلا ہوا دل۔ نخل تمنا: تمنا کا درخت۔

مطلب: اس نظم میں اقبال، شمع سے مکالمہ کرتے ہوئے استفسار کرتے ہیں کہ تجھ میں ایسی کون سی خصوصیت ہے کہ پروانہ تجھ سے اتنی والہانہ محبت کرتا ہے۔ وہ تو اس قدر تیرے لیے بیتاب رہتا ہے کہ اپنی جان بھی تجھ پر قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ حیرت ہے کہ تیرے گرد یہ ہر لحہ طواف کرتا رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تیری محبت اسے پارے کی طرح بیقرار رکھتی ہے۔ تو ہی بتا دے کہ عشق و محبت کے یہ آداب کیا تو نے اسے سکھائے ہیں؟ اور کیا تیری برق نظر نے اسے جلا کر راکھ کر دیا ہے؟ کیا تیرے شعلے میں اسے اپنے لیے حیات جاوداں نظر آتی ہے جو اس طرح موت کو قبول کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔

اے شمع! یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر دنیا کے اس غم کدے میں تیری روشنی موجود نہ ہو تو پروانے کا دل ناصبور کبھی بھی آسودہ نہیں ہو سکتا۔ نا ہی اس کو سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے ننھے سے دل میں عشق و محبت کا سوز و گداز اتنا شدید ہے کہ تجھ پر فدا ہونے کو یہ عبادت تصور کرتا ہے۔ اے شمع! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ پروانے میں ماضی کے روایتی عشق کا جذبہ بھرپور انداز میں موجود ہے اور اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہو گا کہ تیرا وجود ایک چھوٹے سے کوہ طور کے مانند ہے اور یہ پروانہ ایک ننھے سے کلیم کی حیثیت رکھتا ہے کہ جلوہ دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائے۔ یہ پروانہ ہرچند کہ ننھا سا کیڑا ہے تاہم اس میں روشنی پر نثار ہونے کا بلند جذبہ اور ذوق بہر حال موجود ہے۔

عقل و دل

015

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر، گزر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثل خضر خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسر کتاب ہستی کی
مظہر شان کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن
غیرت لعل بے بہا ہوں میں

دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے پر مجھے بھی تو دیکھ، کیا ہوں میں
راز ہستی کو تو سمجھتی ہے اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے، تو معرفت مجھ سے تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش رب جلیل کا ہوں میں

*

تیرہ اشعار پر مشتمل، یہ نظم عملی سطح پر عقل اور دل کے مابین ایک مکالمہ ہے جس میں عقل اور دل اپنی اپنی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ یہ مکالمہ علامہ اقبال نے تخیلی بنیاد پر یہاں منظوم صورت میں پیش کیا ہے۔ نظم کے تیرہ میں سے پانچ اشعار عقل کی زبانی بیان کیے گئے ہیں جب کہ باقی کے آٹھ شعروں میں دل اپنی خصوصیات بیان کرتا ہے۔

عقل

(ایک تا پانچ): معنی خضر: ایک پیغمبر کا نام۔ **خجستہ:** مبارک۔ **مفسر:** تفسیر کرنے والا۔

مطلب: نظم کا آغاز عقل کی زبانی ہوتا ہے جو دل سے ایک دن یوں گویا ہوتی ہے کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو یہ جان لے کہ میں ان لوگوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہوں جو اپنے صحیح راستے سے بھٹک کر غلط راہ پر چل پڑے ہیں۔ بے شک میرا وجود زمین پر قائم ہے۔ اس کے باوجود میری پہنچ آسمان تک ہے کہ میں اپنی قوت استدلال کے سبب زمین پر رہتے ہوئے بھی آسمان کی وسعتوں اور ان کے عوامل سے پوری طرح آگاہ رہتی ہوں۔ اس دنیا میں میرا کام تو ان لوگوں کی صحیح رہبری کرنا ہے جو اپنی راہ سے بھٹک چکے ہیں۔ یوں میری حیثیت حضرت خضر کی سی ہے جن کے ذمے قدرت نے یہ فریضہ لگایا ہے۔ اگر زندگی کو ایک صحیفہ تصور کر لیا جائے تو یہ جان لے کہ میں اس کی تفسیر کی اہلیت رکھتی ہوں۔ یہی نہیں بلکہ شان خداوندی کا اظہار بھی میرے ہی دم سے ہوتا ہے۔ تیری حیثیت تو اے دل بس اتنی ہی ہے کہ تو خون کی ایک بوند کے مانند ہے جب کہ میرا وجود ایک نایاب لعل کی طرح سے ہے جس کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔

دل

(9-6) معنی: **معرفت:** خدا کی پہچان۔ **خدا نما:** خدا کو دکھانے والا۔

مطلب: عقل کی زبان سے یہ الفاظ سن کر دل نے جواب میں کہا، تو نے جو کچھ کہا ہے بے شک درست ہو گا لیکن تو نے میری حقیقت کو جاننے کی بھی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اس امر کا تجزیہ کر سکی کہ فی الواقع میں کیا شے ہوں؟ مانا کہ زندگی کے اسرار کا تجھ کو ادراک ہے لیکن یہ نہ بھول کہ میں تو ان کو خود اپنی نگاہ بصیرت سے دیکھنے کا اہل ہوں۔ تیرا واسطہ تو محض ظاہری اشیاء سے ہے جب کہ میں داخلی سطح پر ہر شے کے باطن سے شنا رہتا ہوں۔ اس حقیقت کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تیرا دائرہ کار علم ہے۔ تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کائنات کے جملہ اسرار کی پہچان کا منبع میں ہوں۔ خدا کو شناخت کرنے کا عمل بھی تیری بجائے میرے وجود سے وابستہ ہے۔

(13-10) معنی: سدرہ: وہ مقام جو جبرائیل کی پرواز کی آخری حد ہے۔

مطلب: اے عقل! یہ بھی جان لے کہ علم جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس کا ردعمل اضطراب اور بے چینی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ تو محض ایک عارضہ ہے۔ چنانچہ میری ذات ہی اس مرض کے لیے مسیحا کی حیثیت رکھتی ہے۔ تو اگر سچائی کی محفل میں شمع کے مانند ہے تو میں بھی حسن کی بزم میں ایک روشن دیئے کی حیثیت رکھتی ہوں۔ اگر شعر میں دل یوں گویا ہوتا ہے کہ اے عقل! اگر تیری رسائی زمان و مکان تک ہے تو یہ حقیقت نہ بھول کہ میری پرواز ان مراحل تک ہے۔ جہاں زمان و مکان کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ بس اس سے زیادہ اور میں کیا کہہ سکتی ہوں کہ میرا مرتبہ انتہائی بلند ہے۔ بس اتنا جان لے کہ میرا وجود تو ربِ جلیل کے عرش کی مانند ہے۔ مراد یہ ہے کہ اے عقل تو بڑی حد تک خوش فہمیوں کا شکار ہے جب کہ میں فطرت کی حقیقتوں سے پوری طرح آشنا ہوں اور ان کا مکمل ادراک رکھتی ہوں۔

صدائے درد

016

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق انگیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

لذت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاط موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

دانہ خرمن نما ہے شاعر معجز بیاں
ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں

حسن ہو کیا خود نما، جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب، جو محفل ہی نہ ہو

ذوق گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

کب زباں کھولی ہماری لذت گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتش پیکار نے

*

پہلا بند معنی: محیط: گھیرنے والا، گھیرا۔ **خرمن:** غلے کا انبار، کھلیان۔ **اختلاط:** میل جول۔

مطلب: نو اشعار پر مشتمل اس نظم کے دو بند ہیں۔ پہلے بند میں پانچ اشعار ہیں اور دوسرے میں چار شعر ہیں۔ "بانگ درا" کی یہ نظم پوری کی پوری وطن پرستی کے جذبات سے عبارت ہے۔ اس میں قومی درد کی وہ جھلک دکھائی دیتی ہے جو خصوصیت کے ساتھ "بال جبریل" "ضرب کلیم" اور اقبال دوسرے مجموعوں میں نظر آتی ہے۔ اس نظم کے پہلے بند کا آغاز وہ اس طرح سے کرتے ہیں۔

ہندوستان کے باشندوں کے مابین نفاق کا جو عالم ہے اس نے مجھے جلا کر رکھ دیا ہے۔ اسی دکھ کے سبب مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اضطراب سے نجات نہیں ملتی۔ اسی دکھ سے میں لحہ بہ لحہ تڑپ رہا ہوں۔ اس سے شاید یوں نجات مل جائے کہ میں دریائے گنگا میں ڈوب کر مرجاؤں۔ شاید یہی عمل میرے سکون کا سبب بن سکے اور اس کرب سے نجات حاصل کرسکوں۔ افسوس کہ میرا وطن عدم اتفاق اور نفاق کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ یہاں جو مختلف قومیں آباد ہیں وہ ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں ہر طرف فرقہ وارانہ فسادات کا زور ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہے جس میں امن و اتحاد کی گنجائش کا قطعی امکان نہیں ہے۔ ایک ساتھ رہنے کے باوجود نفرتوں کا یہ عالم ہے کہ کوئی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔

③ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہاں اتفاق اور باہمی یگانگت کا مظاہرہ ہوتا۔ اس کے برعکس اس سرزمین پر موجود ہر شخص دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ اقبال بڑے دکھ کے ساتھ اس صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک ہی سرزمین پر بود و باش رکھتے ہوئے باہمی سطح پر نفاق اور عداوت کا یہ انداز انتہائی درد انگیز ہے۔ یہاں کی فضاء محبت و اخوت کے جذبوں سے خالی ہے۔ سو میرا جیسا دردمند شاعر ایسی فضا میں کس طرح شعر کی تخلیق کرسکتا ہے؟ کس طرح اپنے نغمے یہاں بکھیر سکتا ہے۔ میں تو ہندوستان کے باشندوں کے مابین حقیقی قرب اور اتحاد کا خواہاں ہوں جب کہ موج اور ساحل کے مابین جو ٹکراؤ اور تصادم کی فضا ہوتی ہے وہ کم از کم میرے لیے اضطراب و بے چینی کا سبب بن جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے یہ نظم واضح رہے کہ تقسیم ہند سے کچھ عرصہ قبل اس وقت کہی جب ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ یقیناً یہی وہ صورت حال تھی جس کے پیش نظر انہوں نے بعد میں تقسیم ہند اور پاکستان تصور پیش کیا۔ علامہ نے یقیناً اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کرلیا تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین شدید نفرت کی ایسی خلیج حائل ہوگئی ہے جس کو پاٹنا مشکل ہے۔ اس کا حل مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ ہی ہوسکتا ہے۔

دوسرا بند **معنی:** **دانہ خرمن:** وہ دانہ جو کھلیان کا پتہ بتائے۔ **خود نما:** اپنے آپ کو نمایاں کرنے والا۔ **آتش پیکار:** لڑائی کی آگ۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح ایک دانے سے پورے کھلیان کی حقیقت اور اس کے معیار کا اندازہ ہو جاتا ہے اسی طرح شاعر اور اس کا کلام کسی قوم کا آئینہ ہوتا ہے لیکن خرمن کی تباہی سے دانے کا وجود بھی برقرار نہیں رہتا اسی طرح قوم ہی یکجا اور باہم نہ ہو تو پھر حقیقی شاعر کا وجود ہی ممکن نہیں ہوتا۔

اقبال اسی خیال کو دوسرے شعر میں یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی توجہ کرنے والا ہی موجود نہ ہو تو

اپنے حسن کی افادیت بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ شمع تو محفل کو منور کرتی ہے اور جب محفل کا کوئی وجود ہی نہ ہو تو شمع کے جلنے کا کیا فائدہ! مراد یہی ہے کہ جب متحد و متفق قوم ہی موجود نہ ہو تو کوئی شاعر ایسی صورت میں اپنے فن کا اظہار کیسے کر سکے گا۔

آخری دو اشعار میں اقبال انتہائی یاس و اضطراب کے عالم میں کہتے ہیں کہ مذکورہ صورت حال میں نہ جانے میں عرض ہنر سے گریز کی راہ کیوں نہیں اختیار کر لیتا۔ نہ جانے مجھ میں جو تخلیقی صفات موجود ہیں ان کا خاتمہ کیوں نہیں ہو جاتا۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس لمحے شعر گوئی کا آغاز کیا ہے جب کہ ہندوستان افتراق و نفاق کی آگ میں جل رہا ہے اس حالت میں میرے نغمے کون سنے گا۔

آفتاب

017

(ترجمہ گایتری)

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو

باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے

ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے

اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے

ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو

تیار کمال ہستی ہر جان دار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

نے ابتدا کوئی، نہ کوئی انتہا تری
آزاد قیدِ اول و آخر ضیا تری

✽

اس نظم کی تشریح سے قبل یہ امر ضروری ہے کہ گایتری کی اصطلاح کو واضح کر دیا جائے۔ "گایتری" اہل ہنود کی مقدس کتاب "رگ وید" کا مشہور و معروف منتر ہے۔ اس نظم میں اقبال نے سنسکرت زبان سے گایتری منتر کا آزاد ترجمہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ گایتری منتر کو اہل ہنود "رگ وید" کی روح سمجھتے ہیں۔ عالم نزع میں اس منتر کا جاپ کیا جاتا ہے۔

معنی: شیرازہ: انتظام۔ ثبات: قیام، پائیداری۔ خرد: عقل۔ کوہسار: پہاڑ۔

مطلب: علامہ اقبال نے اس نظم کو پہلی بار شائع کراتے وقت جو نوٹ تحریر کیا تھا اگر اس کو یہاں شامل کر دیا جائے تو اس سے نظم کی معنویت کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکے گا۔ فرماتے ہیں "ذیل کے اشعار" "رگ وید" کی نہایت ہی قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں۔ جس کو گایتری کہتے ہیں۔ یہ دعا عبودیت کی صورت میں ان تاثرات کا اظہار ہے جنہوں نے نظام عالم کے حیرت ناک مشاہدے سے اول اول انسان

ضعیف البیان کے دل میں ہجوم کیا ہو گا۔ اس قسم کی تحریروں کا مطالعہ علم ملل والنحل کی عالموں کے لیے انتہائی درجہ کا ضروری ہے۔ کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کے ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں "یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے۔ اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ السنہ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ سرولیم جونس کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی لغوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنہ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔

اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ "سوتر" استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اردو لفظ نہ ملنے کے باعث ہم نے لفظ "آفتاب" رکھا ہے۔ لیکن اصل میں اسی آفتاب سے مراد اس آفتاب سے ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیاء کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ "اللہ نور السموت والارض" اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں۔ لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علی ہذا القیاس۔ افلاطون الٰہی کے مصری پیرووں اور ایران کے قدیم انبیاء کا بھی یہی مذہب تھا۔

ترجمے کی مشکلات سے تو ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں دقت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل آواز کی موسیقیت اور وہ طمانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعراء ٹینی سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے لفظ استعمال کیے ہیں جن میں حروف علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل ہونا ناممکنات سے ہے۔

اس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمے کی بنیاد اس سوکت (گفتار زیبا) پر رکھی ہے جس کو سوریا نرائن اپنشد نے گایتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنکسرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو چیپ مین نے پوپ کے ترجمہ ہومر کو پڑھ کر قائم کی تھی۔ یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گایتری نہیں ہے۔

① تا ② اس پس منظر میں یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ زیر تشریح نظم "آفتاب" ایک طرح سے "گایتری" کا آزاد ترجمہ ہے جس میں اقبال' آفتاب سے یوں مخاطب ہیں تو ہی ہے جو اس جہاں کی روح رواں ہے اور تیرے ہی دم سے اس کائنات کا نظام قائم و دائم ہے۔ تو نہ ہو تو یہ نظام درہم و برہم ہو کر رہ جائے۔ یہاں موت اور زندگی کا جو سلسلہ ہے اس کا اظہار تیرے ہی دم سے ہوتا ہے یہی نہیں بلکہ اس دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ بھی تجھ سے ہے۔

③ اے آفتاب! آگ' پانی' مٹی اور ہوا چاروں عناصر کے مابین جو ربط اور شیرازہ بندی ہے اس کی بنیاد بھی تو ہی ہے مزید براں کائنات میں جو بھی جاندار اشیاء موجود ہیں ان میں زندگی کی لہر تیرے ہی دم سے دوڑتی ہے۔

④ عالم رنگ و بو میں جو چیز بھی نظر آتی ہے اس کا وجود تیرے سبب سے ہی قائم ہے تیری شہادت کے بغیر یہ چیزیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ خود تیرے وجود میں جو روشنی اور حرارت ہے وہی ان اشیاء کے لیے حیات کا سبب ہیں۔

⑤ تیرے وجود سے ہی پوری کائنات روشن اور منور رہتی ہے اور اسی روشنی کے سبب دل، عقل اور روح مسرور و شاداں رہتے ہیں۔

⑥ اس شعر میں اقبال ایک دوسرے انداز سے آفتاب سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں بھی اپنے نور سے خرد اور شعور کی روشنی عطا کر اور اسی نور سے ہماری عقل اور خرد کو بھی منور کر دے۔

⑦ اس دنیا کی ترتیب اور نظم و ضبط تیرے بغیر ممکن نہیں۔ تو ہی ہے جو ان کا اہتمام کرتا ہے اس کائنات میں نظم پیدا کرنے والی ذات تیری ہے یہی نہیں بلکہ یہاں جو بھی ادنیٰ و اعلیٰ ہے، چھوٹا بڑا ہے اس کی تخلیق تیرے دم سے ہی ہے۔

⑧ کائنات کی ہر شے تیرے کمال فن کی آئینہ دار ہے یہاں تک کہ پہاڑوں کے جو سلسلے ہیں وہ بھی تیرے فن کا شاہکار ہیں۔

⑨ اے آفتاب! تو تو ہر چیز میں موجود زندگی کا خالق ہے اور دنیا میں جتنی بھی روشن و منور چیزیں ہیں ان کا سرتاج بھی تو ہی ہے۔

⑩ کوئی بھی نہیں جانتا کہ تیری ابتداء اور انتہا کیا ہے۔ تیرا نور تو ان حدود سے قطعی آزاد ہے جن کا تعلق ازل اور ابد سے ہے۔ یہ امر پہلے ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ گائتری کے مطابق اس نور (آفتاب) سے مراد خالق کون و مکاں ہے۔

شمع

018

بزم جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع! دردمند
فریاد در گرہ صفت دانہ سپند
دی عشق نے حرارت سوز دروں تجھے
اور گل فروش اشک شفق گوں کیا مجھے
ہو شمع بزم عیش کہ شمع مزار تو
ہر حال اشک غم سے رہی ہمکنار تو
یک بیں تری نظر صفت عاشقان راز
میری نگاہ مایہ آشوب امتیاز
کعبے میں، بتکدے میں ہے یکساں تری ضیا
میں امتیاز دیر و حرم میں پھنسا ہوا
ہے شان آہ کی ترے دود سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں؟
جلتی ہے تو کہ برق تجلی سے دور ہے
بے درد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے
تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں
بینا ہے اور سوز دروں پر نظر نہیں
میں جوش اضطراب سے سیماب وار بھی
آگاہ اضطراب دل بے قرار بھی
تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار
خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتش کدے ہزار

یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے
گل میں مہک، شراب میں مستی اسی سے ہے

بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی
اصل کشاکش من و تو ہے یہ آگہی

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق
آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق

یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ
ایک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی
شام فراق، صبح تھی میری نمود کی

وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیب درخت طور مرا آشیانہ تھا

قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں
غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

یاد وطن فسردگی بے سبب بنی!
شوق نظر کبھی، کبھی ذوق طلب بنی

اے شمع! انتہائے فریب خیال دیکھ
مسجود ساکنان فلک کا مآل دیکھ

مضموں فراق کا ہوں، ثریا نشاں ہوں میں
آہنگ طبع ناظم کون و مکاں ہوں میں

باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
تحریر کر دیا سر دیوان ہست و بود

گوہر کو مشت خاک میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سست ہے، مضموں بلند ہے

چشم غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
عالم ظہور جلوۂ ذوق شعور ہے

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے
طوق گلوئے حسن تماشا پسند ہے

منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں
اے شمع! میں اسیر فریب نگاہ ہوں

صیاد آپ، حلقۂ دام ستم بھی آپ
بام حرم بھی، طائر بام حرم بھی آپ

میں حسن ہوں کہ سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

✲

پہلا بند　معنی: فریاد در گرہ: جس کی گرہ میں فریاد ہو مراد فریادی۔ **دانہ سپند:** کالا دانہ، حرمل۔ **شفق گوں:** شفق کی مانند، سرخ۔

مطلب: علامہ اقبال کی یہ نظم چھ بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں وہ شمع سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے شمع! تیری طرح میں بھی غم زدہ اور دکھیا ہوں۔ میری کیفیت بھی ہرمل کے اس دانے کی مانند ہے جو آگ کی تپش سے چٹخنے کی آواز پیدا کرتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ میرا دل جب سوز غم سے بھڑک اٹھتا ہے تو اس میں سے درد انگیز نالے اٹھتے ہیں۔ جس طرح عشق نے تجھے داخلی کرب کی آگ میں جلنے پر

مجبور کر دیا ہے یعنی مجھے بھی خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے علم ہے کہ تو کسی عشرت کدے میں روشن ہو یا کسی مزار پر جلے دونوں صورتوں میں تیری آنکھ سے آنسو ٹپکتے رہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ شمع خواہ خوشی کی محفل میں جلے یا کسی غم کدے میں اس کے پگھلنے سے بہرحال موم کے قطرے ٹپکتے رہتے ہیں۔ اقبال نے انہی کو آنسوؤں سے تعبیر کیا ہے۔

دوسرا بند **معنی:** یک بیں: ایک دیکھنے والی۔

مطلب: اے شمع! جس طرح قدرت کے بھید جاننے والے عشاق ہر شے کو کسی جانب داری کے بغیر مساوی سطح پر دیکھتے ہیں تیری کیفیت بھی ان سے ملتی جلتی ہے جب کہ میں اشیاء کے مابین فرق و امتیاز کا جائزہ لیتا ہوں۔ تیری روشنی تو خواہ کعبہ ہو یا بت خانہ' دونوں کو یکساں طور پر منور کرتی ہے جب کہ میری نظر دیر و حرم کے مابین جو فرق ہے اس کی مماثل ہے۔

تیرے جلن سے جو دھواں اٹھتا ہے اس کی کیفیت قلب انسان سے بر آمد ہونے والی آہ کی سی ہے۔ لگتا ہے کہ تیرے اندر بھی انسان کی طرح کوئی دل چھپا ہوا ہے۔

تیسرا بند **معنی:** بینا: دیکھنے والا' بینائی۔

مطلب: شاید تو اس غم میں جل رہی ہے کہ تو روشنی کے حقیقی منبع سے دور ہے لیکن تیرے اس عمل کو بید رد لوگ روشنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال نے جلنے کا لفظ اس بند میں دونوں طرح سے استعمال کیا ہے۔ روشنی کے حوالے سے اور کڑھنے کے حوالے سے! چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ تو جل رہی ہے تاہم حیرت اس امر پر ہے کہ تجھے اپنے جلنے کا بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ اس قدر چشم بینا رکھتے ہوئے بھی تو اپنی داخلی جلن سے آگاہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں اضطراب و بے چینی کے سبب پارے کی طرح تڑپ رہا ہوں۔ اور اس اضطراب و بے چینی سے میرا دل پوری طرح آگاہ ہے۔ شاید مجھے رب اعلیٰ نے جلنے اور پگھلنے کا احساس عطا فرما دیا ہے۔

چوتھا بند **معنی:** آگہی: واقفیت۔ کشاکش: کھینچا تانی' چھینا جھپٹی۔

مطلب: مجھے اپنی ذات کی شناخت کا جو شعور عطا کیا گیا ہے بظاہر یہ ایک معمولی سی چنگاری کے مانند ہے تاہم اس میں بے شمار آتشکدے پوشیدہ ہیں۔ بلندی و پستی میں امتیاز کی خصوصیت اسی کے سبب پائی جاتی ہے۔ آگہی کا یہی وہ شعور ہے جس کے سبب پھولوں میں خوشبو اور شراب میں نشہ کا عنصر برقرار ہے۔ یہی آگہی بلبل' پھول اور اس کی خوشبو کے علاوہ بندہ و آقا کے مابین فرق کا سبب بن جاتی ہے۔

پانچواں بند **معنی:** دلستان عشق: عشق کا دل لینے والا۔

مطلب: اس بند کے چھ اشعار بظاہر پوری نظم کے موضوع سے کچھ علیحدہ نظر آتے ہیں لیکن چوتھے اور چھٹے بند کے آخری اور ابتدائی حصے کے حوالے سے ان میں گہرا ربط نظر آتا ہے۔ زیر تشریح بند میں اقبال نے فلسفہ وجود کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب خالق کون و مکاں نے "کن" کی صدا کے ساتھ کائنات کی تخلیق کی تو حسن عملاً عشق کا گرویدہ ہوا اور اسی کیفیت نے عاشق کے دل میں ایک تڑپ اور اضطراب پیدا کر دیا۔ اس لیے انسان کو حکم دیا گیا کہ اسی جذبے کے تحت کائنات کے مظاہر کا جائزہ لے اور دیکھ کر اس عالم موجودات میں تیرے لیے کن کن اشیاء کو تخلیق کیا گیا ہے۔

خالق ارض و سما نے انسان کو پیدا کر کے اس کے وجود اور جسم کو ایک ایسے حصار میں ڈال دیا جس کے سبب وہ اپنی حقیقت اور وجود سے بے خبر اور بڑی حد تک بے نیاز ہو گیا۔ چنانچہ یہی لمحہ تھا جب تخلیق کے ساتھ ہی حقیقت ازل سے وجود کے ہجر کا آغاز ہو گیا۔ بالفاظ دگر پہلے انسان ان قیود سے آزاد تھا جب کہ اب قدرت نے اس پر بیشتر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال کر اسے ایک محدود حصار میں بند کر دیا۔ اب وہ زمانہ ختم ہو گیا جب انسانی وجود کا مسکن کوہ طور کے ایک درخت پر تھا۔ اس لمحے تو وہ کسی حجاب کے بغیر نور کبریائی کا نظارہ کیا کرتا تھا۔

اب تو صورت حال یہ ہے کہ انسان اپنے وجود میں ہی محصور ہو کر رہ گیا ہے اور المیہ یہ ہے کہ وہ اس قید خانے کو ہی ایک باغ تصور کر بیٹھا ہے۔ اس کے علاوہ جس مقام پر وہ ایک اجنبی کی طرح بود و باش اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہ اپنے حقیقی وطن کی یاد میں افسردہ و پریشان رہتا ہے اور اس خالق حقیقی کی طلب دل و نظر کو مضطرب رکھتی ہے جس سے کبھی اس کا براہ راست رابطہ تھا۔

چھٹا بند　معنی: مسجود: جسے سجدہ کیا جائے۔ **آہنگ:** آواز۔ **کمند:** رسی جس کے ذریعے کوٹھے پر چڑھا جاتا ہے۔ **طوق:** حلقہ، پٹا۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال پھر سے شمع سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس پس منظر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کس قدر فریب خوردہ ہے جو اپنے فانی وجود کو ہی ایک مستقل حقیقت سمجھ بیٹھا ہے حالانکہ ساکنان فلک کو سجدوں کا مال بھی اس کے روبرو ہے۔ ہر چند کہ میرا مقام بہت بلند ہے پھر بھی ہجر کا ستایا ہوا ہوں۔ پھر بھی خالق کون و مکاں کی مشیت سے ہم آہنگ ہوں۔ اس نے مجھ پر جو پابندیاں عائد کیں غالباً ان سے مقصد یہی تھا کہ ان سے زندگی کے ارتقائی مراحل طے کروں۔ اسی سبب رب اعلیٰ نے مجھے حیات و ممات کا عنوان بنا دیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ابدی ہے کہ نایاب موتیوں کا مسکن بھی مٹی اور خاک کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اس کے باوجود وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اب جو گہرائی میں اتر کر دیکھتا ہوں تو اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصور میری بصارت اور بصیرت کا ہے وحقائق کو ان کے صحیح منظرنامے میں دیکھنے سے گریزاں ہے جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ کائنات تخلیقی شعور کی مظہر ہے۔ یہ فریب نہیں تو کیا ہے کہ تمام حقائق کو نظر انداز کر کے فرد اپنے شعور کی نمائش کا خواہاں ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں افتراق و امتیاز کی خلیج وسعت پذیر ہو رہی ہے۔

زمان و مکان کا سلسلہ انسانی حیات کے گرد ایک حصار کے مانند ہے۔ ہر چند کہ اپنی راہ گم کر بیٹھا ہوں۔ پھر بھی منزل تک رسائی میرا مطمع نظر ہے۔ فریب نظر میں مبتلا ہونے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ حقائق کا سامنا کروں۔ لیکن صورت یہ ہے کہ خود ہی صیاد بن چکا ہوں اور اس کے دام میں گرفتار بھی خود ہی ہوں۔ یہ کیا ستم ہے کہ خود کو حرم کی بلندی بھی سمجھتا ہوں اور اس پر ایستادہ پرندہ بھی! فی الواقع میں تو اس حقیقت سے بھی آگاہی نہیں رکھتا کہ حسن ہوں یا عشق کا گداز! مجھ پر تو یہ بھید بھی نہیں کھلتا کہ محبوب ہوں یا میری حیثیت عاشق کی ہے چنانچہ میرے لیے یہ خدشہ بے جا نہیں کہ اپنی زبان پر وہی راز قدیم لے آؤں جس کا نتیجہ پھانسی کے پھندے کے سوا اور کچھ نہیں کہ سچ کا نتیجہ ہمیشہ تلخ ہی ہوتا ہے۔

019

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا!
شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی موذن
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں!
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

✻

یہ نظم بیس اشعار پر مشتمل ہے۔ حمید احمد خاں کے بقول اس نظم کو اگر سیموئیل راجرز کی نظم Wish کا آزاد ترجمہ بھی سمجھ لیا جائے اس صورت میں بھی "ایک آرزو" عملاً ایک شاہکار نظم ٹھہرتی ہے۔ نظم کے ابتدائی دو تین اشعار میں اگرچہ یاسیت کی ایک جھلک ملتی ہے لیکن بعد کے کم و بیش تمام اشعار رجائیت کے آئینہ دار ہیں جن میں اقبال اپنی دلی خواہش کا کمال چابکدستی سے اظہار کرتے ہیں چنانچہ نظم کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے۔

معنی: دل ہی بجھ گیا: دل اداس ہو گیا۔ **شورش:** شور۔ **عزلت:** گوشہ نشینی۔ **جلوت:** جہاں تنہائی نہ ہو۔ **درا:** جرس، گھنٹی۔

مطلب: اقبالؒ رب ذوالجلال کو مخاطب کر کے اس طرح سے گویا ہوتے ہیں کہ اب دنیا کی محفلوں اور ان کے جھمیلوں سے میری طبیعت اکتا گئی ہے اس لیے کہ جب حوادث زمانہ سے دل ہی بجھ کر رہ جائے تو ایسی محفلوں کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب تو دنیا کے شور و شر سے طبیعت بیزار ہو کر رہ گئی ہے چنانچہ مجھے ایسی خامشی اور سکوت کی تلاش ہے جس پر تقریر کو بھی رشک آ جائے۔

میں تو اب پرسکون زندگی پر فدا ہونے کا خواہاں ہوں اور اتنی ہی آرزو ہے کہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک مختصر سا جھونپڑا میسر آ جائے جہاں ساری دنیا سے الگ تھلگ پرسکون زندگی پر فدا ہونے کا خواہاں ہوں اور اتنی ہی آرزو ہے کہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک مختصر سا جھونپڑا میسر آ جائے جہاں ساری دنیا سے الگ تھلگ پرسکون زندگی بسر کر سکوں۔ صورت یہ ہو کہ انتہائی تنہائی میں دن گذارنے کے باوجود ہر قسم کے فکر و فاقے سے آزاد ہو جاؤں اور یہاں دنیا کا ایسا کوئی غم نہ ہو جو میرے سکون کو برباد کر سکے۔

میرے مسکن کے گرد و پیش کی کیفیت یہ ہو کہ چڑیوں کی چہچہاہٹ میں نغمے بکھر رہے ہوں اور بہتے ہوئے چشموں کی صداؤں میں باجا سا بجتا محسوس ہو رہا ہو۔ کلیاں جب چٹکیں تو یوں لگے جیسے وہ کسی کا پیغام مجھ تک پہنچا رہی ہیں۔ کلیوں اور پھولوں کے شگفتہ دہانے میرے لیے ایسے ساغر کی حیثیت اختیار کر لیں جن میں تمام مناظر فطرت کا جائزہ لے سکوں۔

اس جھونپڑے میں جب آرام کی خواہش ہو تو فرش زمین کی سبز سبز گھاس میرا بچھونا ہو اور سرہانا خود میرا ہاتھ ہو۔ اس لمحے ایسی تنہائی کا عالم ہو جو انجمن آرائی سے کہیں دلنشیں محسوس ہو۔ وہاں موجود بلبل اور دوسرے ننھے ننھے پرندے مجھ سے اس طرح مانوس ہو جائیں جس طرح کہ ان کے دل سے ہر طرح کا خوف دور ہو گیا ہو۔

یہی نہیں بلکہ ہر جانب سرسبز پودے پوری شان و شوکت سے ایستادہ ہوں۔ سامنے ندی کا شفاف پانی ایسے بہہ رہا ہو جس طرح کہ اس میں ان پودوں کی تصویر منعکس ہو رہی ہو۔ یہاں موجود پہاڑوں کا نظارہ بھی اتنا دلکش ہو۔ ندی اور چشموں کا پانی موجوں کی صورت میں بلند ہو کر جس کو دیکھ سکے۔

یہاں اس امر کی نشاندہی بھی غیر ضروری نہ ہو گی کہ کم و بیش پوری نظم میں اقبال نے مناظر فطرت کے بیان میں جو امیجری پیش کی ہے وہ بے مثال ہے۔ چنانچہ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ سرسبز گھاس اس طرح سے ایستادہ ہو جیسے کہ وہ زمین کی آغوش میں محو خواب ہو۔ اور جہاں تک بہتے ہوئے پانی کا تعلق ہو وہ جھاڑیوں میں سے گزرتا ہوا شفاف آئینے کے مانند چمک رہا ہو۔ پھر اس بہتے ہوئے پانی کو پھولوں کی ٹہنیاں اس طرح سے چھو رہی ہو جیسے کوئی خوبرو حسینہ آئینہ دیکھ رہی ہو۔

انتہائی خوبصورت منظر نگاری کرتے ہوئے اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ وقت غروب جب سورج کی سرخ اور سنہری کرنیں شام کے وقت عکس ریز ہوں تو یوں محسوس ہو جیسے دلہن کو مہندی لگائی جا رہی ہے۔ پھولوں کی کیفیت بھی ایسی ہو جیسے وہ سرخ اور سنہرے رنگ کی قبا پہنے ہوئے ہوں۔ بلاشبہ غروب ہوتے ہوئے سورج کی عکس ریزی کے حوالے سے اس سے زیادہ خوبصورت منظر کشی ممکن نہیں ہو سکتی۔

آگے چل کر اقبال کہتے ہیں کہ رات کے راہی جب سفر کرتے کرتے تھک کر رہ جائیں تو میرے جھونپڑے کے دیئے کی دھندلی روشنی ان کے لیے امید کی علامت بن جائے اور جب آسمان پر ہر طرف بادل چھائے ہوئے ہوں اور راستہ نظر نہ آئے تو بجلی اس طرح سے چمک اٹھے کہ اس کی روشنی میں ان

تھکے ہوئے مسافروں کو میری کٹیا نظر آ جائے۔

یہی نہیں جب رات کے آخری لمحات میں صبح کے موذن کی طرح کوئل کی صدا بلند ہو تو میں اس کا ساتھ دوں اور اسی طرح وہ میری ہم نوا بھی ہو۔ مسجدوں اور مندروں سے سحر کے عبادت گزاروں کو مطلع کرنے کے لیے جو اذانیں بلند ہوتی ہیں اور ناقوس کی صدا آتی ہے۔ مجھے ان کی ضرورت نہ ہو بلکہ طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں میری جھونپڑی کے روزنوں سے اندر داخل ہو کر مجھے بیداری کا پیغام دیں۔

اور جس لمحے صبح دم شبنم پھولوں پر اس طرح برسے جیسے انہیں وضو کرا رہی ہو تو اس لمحے میری آہ و فغاں میرے لیے وضو اور دعا کا کام دے۔ اس خامشی کے عالم میں میری آہ و فغاں اتنی بلند ہو جائے کہ تاروں کے قافلوں کے لیے آغاز سفر کا سبب بن جائے۔ یوں میرا رونا اس قدر موثر ثابت ہو کہ ہر دردمند دل بھی میرے ہمراہ گریہ کناں ہو جائے اور میری آہ و فغاں سے جو صدا بلند ہو ممکن ہے کہ ان لوگوں کی بیداری کا سبب بن جائے جو ایک عرصے سے مست و بے ہوش پڑے ہیں۔

آفتاب صبح

020

شورش میخانۂ انساں سے بالاتر ہے تو
زینت بزم فلک ہو جس سے وہ ساغر ہے تو
ہو در گوش عروس صبح، وہ گوہر ہے تو
جس پہ سیمائے افق نازاں ہو وہ زیور ہے تو
صفحۂ ایام سے داغ مداد شب مٹا
آسماں سے نقش باطل کی طرح کوکب مٹا

حسن تیرا جب ہوا بام فلک سے جلوہ گر
آنکھ سے اڑتا ہے یکدم خواب کی مے کا اثر
نور سے معمور ہو جاتا ہے دامان نظر
کھولتی ہے چشم ظاہر کو ضیا تیری مگر
ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے
چشم باطن جس سے کھل جائے وہ جلوا چاہیے

شوق آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے
زندگی بھر قید زنجیر تعلق میں رہے
زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کے لیے
آرزو ہے کچھ اسی چشم تماشا کی مجھے
آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
امتیاز ملت و آئیں سے دل آزاد ہو

بستۂ رنگ خصوصیت نہ ہو میری زباں
نوع انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں
دیدۂ باطن پہ راز نظم قدرت ہو عیاں
ہو شناسائے فلک شمع تخیل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے
حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

صدمہ آ جائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر
اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر
دل میں ہو سوز محبت کا وہ چھوٹا سا شرر
نور سے جس کے ملے راز حقیقت کی خبر
شاہد قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو

سر میں جز ہمدردیِ انساں کوئی سودا نہ ہو

تو اگر زحمت کشِ ہنگامۂ عالم نہیں
یہ فضیلت کا نشاں اے نیرِ اعظم نہیں
اپنے حسنِ عالم آرا سے جو تو محرم نہیں
ہمسرِ یک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں
نورِ مسجودِ ملک گرمِ تماشا ہی رہا
اور تو منت پذیرِ صبحِ فردا ہی رہا

آرزو نورِ حقیقت کی ہمارے دل میں ہے
لیلیِ ذوقِ طلب کا گھر اسی محمل میں ہے
کس قدر لذت کشودِ عقدۂ مشکل میں ہے
لطفِ صد حاصل ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
دردِ استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں
جستجوئے رازِ قدرت کا شناسا تو نہیں

*

سات بند پر مشتمل اس نظم میں علامہ اقبال نے صبحدم طلوع ہوتے ہوئے سورج سے مکالمہ کیا ہے اور اپنی ذات کے حوالے سے آفتاب کے ساتھ نوع انسانی کے تعلق اور موخر الذکر کی امتیازی حیثیت کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کی یہ نظم بھی امیجری اور منظر نگاری کے اعتبار سے انتہائی بلند مرتبے کی حامل ہے۔

پہلا بند معنی: **درِ گوش:** کان کا موتی، ایک زیور جو کان میں پہنا جاتا ہے۔ **سیمائے افق:** افق کی پیشانی۔ **مدادِ شب:** رات کی سیاہی۔

مطلب: اس ابتدائی بند میں علامہ اقبال طلوع ہوتے ہوئے آفتاب سے یوں مخاطب کرتے ہیں کہ بے شک تو انسانی دنیا کے ہنگاموں سے بہت زیادہ بلند و بالا ہے اس اعتبار سے بلند ہے کہ تیرا وجود انسانی دنیا سے بہت زیادہ دور ہے اور تیرا تعلق آسمان سے ہے۔ تیرے ہی دم سے وہاں کا حسن اور رونق برقرار ہے۔ اگر صبح کو دلہن کے مانند تصور کر لیا جائے تو اے آفتاب تجھے اس کے کان کو زینت بخشنے والا موتی تصور کیا جائے گا۔ تو ایسے حسین زیور کی طرح ہے جو افق کی پیشانی کے لیے بھی باعث ناز و فخر ہے۔ اے آفتاب! تیرے طلوع ہونے کے ساتھ ہی دنیا سے رات کی تاریکی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آسمان پر ستارے بھی حرفِ غلط کی مانند غائب ہو جاتے ہیں۔

دوسرا بند مطلب: تو جس لمحے طلوع ہوتا ہے اور تیری حسین اور خوبصورت شعاعیں زمیں پر عکس ریز ہوتی ہیں تو دنیا بھر کے لوگوں کی نگاہوں سے نیند کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے اور ان کی نظریں تیری روشنی سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ تیری روشنی بظاہر آنکھوں کو نور عطا کرتی ہے تاہم امر واقع یہ ہے کہ میں وہ منظر دیکھنے کا خواہاں ہوں جس کی بدولت کائنات کے پوشیدہ اسرار مجھ پر وا ہو جائیں اور میں حقیقت کا ادراک کر سکوں۔

تیسرا بند معنی: **زیر و بالا:** اوپر نیچے۔ **سرشک آباد:** آنسوؤں کا گھر۔ **امتیازِ ملت و آئیں:** قوم اور شرع کا فرق۔

مطلب: اے آفتاب! ہر چند کہ میں ہمیشہ سے آزادی کا خواہاں تھا لیکن میری یہ طلب پوری نہ ہو سکی

اس کے برعکس ساری زندگی دنیوی تعلقات کے جھمیلوں میں پھنسا رہا جب کہ تیری روشنی یہاں ہر ادنیٰ و اعلیٰ شخص کے لیے اور ہر کوئی بلا امتیاز اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ مجھے بھی ایسی نگاہ درکار ہے جو تیری مانند ہر پست و بلند اور اپنے بیگانے کو کسی امتیاز کے بغیر دیکھنے کی حامل ہو۔ میں تو ایسی آنکھ چاہتا ہوں جو ہر کہ و مہ کے دکھ درد میں آنسو بہانے کی قائل ہو۔ یہی نہیں بلکہ مختلف اقوام اور وہاں کے قوانین سے منفی انداز کی تکلیف دہ روش سے آزاد ہو۔

چوتھا بند معنی: بستہ رنگ خصوصیت: خصوصیت کے رنگ میں بندھی ہوئی۔ عقدہ: مشکل بات، معمہ۔

مطلب: میرا لب و لہجہ اور زبان ایسی ہو کہ کسی مخصوص جماعت یا گروہ کے اثرات سے ہم آہنگ نہ ہو۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ پوری انسانیت میری قوم ہو اور پوری دنیا میرے وطن کی مانند ہو۔ مجھ پر قدرت کی نعمتوں کے راز سربستہ افشاء ہو جائیں۔ یہی نہیں بلکہ میرا تخیل آسمان کی بلندیوں تک بھی رسائی رکھنے کا اہل ہو۔

اے آفتاب صبح! میری یہ دلی آرزو ہے کہ مجھے اس عالم فانی کے تفرقے اور جھمیلے پریشان نہ کریں۔ اس کے برعکس مجھے ہر شے میں ایسا حسن اور خوبصورتی نظر آئے جو میرے عشق جنوں خیز میں لحہ لحہ اضافہ کر دے یعنی ہر شے سے بے نیاز ہو کر محبت اور وفا کو ہی اپنا مسلک سمجھوں۔

پانچواں بند معنی: شاہد: معشوق۔

مطلب: اے آفتاب صبح! میں تو اس قدر گداز طبع ہوں کہ اگر کسی پھول کی پتی کو بھی کوئی تکلیف پہنچے تو میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جائیں یہی نہیں بلکہ میرے دل میں محبت کی ایسی آگ روشن ہو گئی ہے جس کی روشنی سے مجھ پر راز حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔ جہاں تک میرے دل کا تعلق ہو وہ فطرت کے آئینے کی مانند ہو کہ اس میں سب کچھ نظر آ جائے۔

چھٹا بند معنی: نیر اعظم: بڑا ستارا مراد سورج۔

مطلب: اے آفتاب! اگر تو دنیا کے ہنگاموں اور مصائب کو برداشت کرنے کا اہل نہیں ہے تو یہ امر قطعی فخر و مباہات کا سبب نہیں جب تو اپنے حسن کی حقیقت سے ہی آگاہ نہیں جو پوری کائنات کا منور کرنے کا باعث ہوتا ہے تو اس صورت میں انسان کی ہمسری اور برابری کا اہل نہیں۔ انسانی نگاہ تو اے سورج تجھ کو دیکھتی رہی لیکن تو تھا کہ آنے والی کل کا منتظر ہی رہا۔

ساتواں بند معنی: سعی: کوشش۔ استفہام: سوال۔

مطلب: ہم تو حقائق کے نور کی خواہش دل میں لیے ہوئے ہیں۔ جو کائنات کے رازوں کو بے نقاب کر دے کہ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے تو اس حقیقت سے قطعی طور پر بہرہ ور نہیں ہے کہ مشکل مسائل کو حل کرنے میں کس قدر لطف موجود ہے اور اسی کوشش میں وہ کیفیت موجود ہے جو کچھ پانے کی جستجو سے تعلق رکھتی ہے۔ اے آفتاب! آگاہی کے اس جذبے سے تو قطعی محروم ہے اس لیے کہ فطرت کے اسرار کو پانے کی طلب تجھ میں موجود ہی نہیں ہے۔

021 دردِ عشق

اے دردِ عشق! ہے گہرِ آب دار تو
نامحرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو
پنہاں تہِ نقاب تری جلوہ گاہ ہے
ظاہر پرست محفلِ نو کی نگاہ ہے
آئی نئی ہوا چمنِ ہست و بود میں
اے دردِ عشق! اب نہیں لذت نمود میں
ہاں! خود نمائیوں کی تجھے جستجو نہ ہو
منت پذیر نالۂ بلبل کا تو نہ ہو
خالی شرابِ عشق سے لالے کا جام ہو
پانی کی بوند گریۂ شبنم کا نام ہو
پنہاں درونِ سینہ کہیں راز ہو ترا
اشکِ جگر گداز نہ غماز ہو ترا
گویا زبانِ شاعرِ رنگیں بیاں نہ ہو
آوازِ نے میں شکوۂ فرقت نہاں نہ ہو
یہ دور نکتہ چیں ہے کہیں چھپ کے بیٹھ رہ
جس دل میں تو مکیں ہے وہیں چھپ کے بیٹھ رہ
غافل ہے تجھ سے حیرتِ علم آفریدہ دیکھ
جویا نہیں تری نگہِ نارسیدہ دیکھ
رہنے دے جستجو میں خیالِ بلند کو
حیرت میں چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو
جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہیں
قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں
یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز
مقصد تری نگاہ کا خلوت سرائے راز
ہر دل مئے خیال کی مستی سے چور ہے
کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

٭

معنی : گہرِ آب دار: چمکدار موتی۔ **ظاہر پرست**: چیزوں کے ظاہر پر مرنے والا۔ **ہست و بود**: ہستی اور وجود۔ نے: بانسری۔

مطلب: ①② اس نظم میں اقبال عشق کے جذبے میں جو کسک ہوتی ہے اس سے مخاطبت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تو ایک انتہائی چمکدار موتی کے مانند ہے لہٰذا تجھ پر لازم ہے کہ جو اس جذبے سے آگاہی نہیں رکھتے ان کے روبرو اپنے وجود کو آشکار نہ کرے۔ تیری کیفیت تو اس حسین چہرے کی سی ہے جو نقاب میں چھپا ہونے کے باوجود بھی اپنی تابندگی مظہر ہوتا ہے۔ میں تجھے اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ عہد نو کے لوگ محض ظاہری چیزوں کو ہی اہمیت دیتے ہیں اور باطن تک ان کی نظر نہیں پہنچتی۔

③④ اے دردِ عشق! اس کائنات میں تو ایسی ہوا چل پڑی ہے کہ باشعور لوگ اب اپنے روبرو ظاہر اشیا سے لطف نہیں اٹھا سکتے چنانچہ تیرے لیے لازم ہے کہ اپنے وجود کو ظاہر کرنے کی جستجو نہ کرے اور خود کو اسی طرح ظاہر بیں نگاہوں سے محفوظ رکھے یوں بھی تیرے لیے کیا ضروری ہے کہ خود کو نالہ بلبل کی احسان مندی قبول کرے۔ کہ اس طرح تو تیری ہیئت ظاہر ہونے کا امکان ہے۔

⑤⑥ اے دردِ عشق! موجودہ صورت حال میں تو ایسی کیفیت ہونی چاہیے لالے کے پھول کے حوالے سے بھی جذبہ محبت کے اظہار کا امکان نہ ہو۔ اور انسان پانی کی بوندوں کو بھی شبنم کے قطرے تصور

کرے۔ تیرا راز بدستور سینے کے کسی گوشے میں پوشیدہ رہنا ضروری ہے تا ہی تجھ سے منسوب آہ بھی سنائی دے جو سننے والے کے جگر کو تڑپا کر اور گداز کر کے رکھ دیتی ہے۔

⑦⑧ بالکل اسی طرح سے جیسے کہ شاعر رنگیں نوا اپنے نغموں کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے یا کوئی بانسری بجانے والا اپنے سروں میں جدائی کی کیفیت کا اظہار کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اے درد عشق! تجھ پر بھی یہ لازم ہے کہ اس عہد نکتہ چیں سے خود کو کہیں روپوش کرے۔ تیرے لیے مناسب یہی ہے کہ جو دل تیری آماجگاہ ہے وہیں مستقل طور پر اپنا مسکن بنا لے! مراد یہ ہے جذبہ عشق کی کسک اظہار کے ساتھ ہی اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔ لہٰذا اس باطن تک ہی محدود کرنا لازم ہے۔

⑨⑩ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اے درد عشق! تیرے وجود سے اہل علم و دانش آگاہ نہیں اور تیری کسک کا بھی انہیں ادراک نہیں! لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے تو ان اہل علم و دانش کو اسی طرح سے حیرت زدہ ہی رہنے دے اور جو لوگ خود کو حکمت و آگہی کا مظہر سمجھتے ہیں انہیں بدستور عدم واقفیت کا شکار ہی رہنے دے۔

(12-11) یہ ماحول ایسا نہیں ہے جو تیرے سبب بہار آفریں بن سکے۔ اس لیے کہ یہ تو ایسی جگہ ہے جہاں تیری نمود کی گنجائش ہو۔ مراد یہ ہے کہ اس عالم رنگ و بو کے لوگ عملی طور پر بے حس ہو چکے ہیں اور لطیف جذبوں سے محروم ہیں۔ یہ پورا ماحول باطنی اسرار کی آگہی سے قطعی طور پر نا آشنا ہے جب کہ تیرا ادراک تو وہی کر سکتا ہے جو باطن میں جھانکنے کی صفت کا حامل ہو۔ آج کل کے لوگوں کی کیفیت تو بس ایسی ہے کہ وہ اپنے اپنے خیالات میں گم رہنے والے ہیں اس طرح عصر موجود کے باسیوں کے طور طریقے ہی ماضی کی نسبت بڑی حد تک تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ آج کا دور محض اک مادی دور ہے جس میں باطنی سطح پر معاملات کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ ظاہری حقیقتوں کا ادراک ہی ان کی فطرت ہے سوائے عشق کی کسک تیری اہمیت اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے کہ اپنے وجود کو ایسے لوگوں سے پوشیدہ رکھے۔

گل پژمردہ

022

کس زباں سے اے گل پژمردہ تجھ کو گل کہوں! کس طرح تجھ کو تمنائے دل بلبل کہوں
تھی کبھی موج صبا گہوارۂ جنباں ترا نام تھا صحن گلستاں میں گل خنداں ترا

تیرے احساں کا نسیم صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا ہے نہاں تیری اداسی میں دل ویراں مرا
میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو
ہمچو نے از نیستان خود حکایت می کنم بشنو اے گل! از جدائیہا شکایت می کنم

✻

علامہ اقبال کی زیر تشریح مختصر سی نظم محض دو بند پر مشتمل ہے۔ ان اشعار کے مندرجات سے اس

امر کا بخوبی انداز ہوتا ہے کہ علامہ کی نظر زندگی کے کم و بیش تمام مسائل پر تھی۔

پہلا بند معنی : گل پژمردہ : مرجھایا ہوا پھول۔ **گہوارۂ جنباں** : ہلنے والا جھولا۔ **طبلہ عطار** : عطر فروخت کرنے والے کا صندوقچہ۔

مطلب : اس بند میں اقبال کا مکالمہ ایک ایسے پھول سے ہوتا ہے جو مرجھا چکا ہے اور اس طرح اپنی تازگی کے علاوہ آب و تاب بھی کھو چکا ہے چنانچہ وہ اس مرجھائے ہوئے پھول سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں اب تیری ہیئت ہی تبدیل ہو چکی ہے اس صورت میں تجھے پھول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کیفیت میں تو تو بلبل کے لیے بھی کشش کا سبب نہیں ہو سکتا۔ میں اس دور کو یاد کرتا ہوں کہ موج صبا تجھے ہلکارے دیا کرتی تھی اور اس کی آغوش تیرے لیے ہلتے ہوئے گہوارے کی مانند ہوا کرتی تھی اور باغ میں تیرا وجود مسکاہٹوں کا آئینہ دار رہتا۔ صبح کی نسیم تیری خوشبو سے معطر ہوتی تھی اور یہ خوشبو پھر سارے گلستاں کو معطر کر دیتی تھی۔

دوسرا بند معنی : نیستان : سرکنڈوں کی جگہ (مراد ہے وطن)۔

مطلب : آج تیری صورت دیکھ کر اے مرجھائے پھول ہوئے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ اور یوں لگتا ہے کہ تیری اداسی میں میرا دل ویران پوشیدہ ہے۔ دیکھا جائے تو تیرا وجود میری بربادی کی ایک چھوٹی سی تصویر ہے جس شے کی میری زندگی ایک خواب تھی بظاہر یوں لگتا ہے کہ تو اس خواب کی تعبیر ہے۔

اے مرجھائے ہوئے پھول (غور سے سن کہ میں تجھے اپنی اس کیفیت کا گلہ کر رہا ہوں جو ہجر و فراق سے عبارت ہے۔

سید کی لوحِ تربت

023

اے کہ تیرا مرغ جاں تار نفس میں ہے اسیر　　اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر

اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ　　شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ

فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی　　صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ

چشم باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں!　　ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں　　چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے　　دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

محفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ

رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا　　ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا

عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم

پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

❁

علامہ اقبال کے ہم عصر دانشور اور بعض شارحین کے نزدیک یہ نظم عملی سطح پر "سرسید احمد خاں" کے پیغام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں سرسید کے نظریات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ یہ نظم ایک طرح سے چار بند پر مشتمل ہے۔

پہلا بند معنی: گرویدۂ تقریر: تقریر کا شیدائی۔

مطلب: اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں ان اشعار میں بتایا ہے کہ سرسید احمد خاں کی تربت کا کتبہ زبانِ حال سے ہندوستان کے باشندوں سے یوں گویا ہے کہ تم زندگی کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو اور تمہاری روح بھی شب و روز کے عوامل میں مقید ہے۔ ذرا ان لوگوں کی جانب بھی نظر کرو جو یہاں آزادی سے نغمہ پیرائی تو کر رہے ہیں لیکن یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ میں نے تو اپنی جدوجہد اور فکری کاوشوں سے اس ویرانے میں ایک شہر بسا دیا ہے۔

سن لو کہ جو محفل میرے خوابوں کی ماحصل تھی وہ اپنی تعبیر کی حیثیت سے تمہارے روبرو ہے۔ میں نے جس صبر و استقلال کے ساتھ اپنی جدوجہد سے جو کھیتی کاشت کی تھی اس کا پھل سامنے آ چکا ہے۔ چنانچہ میری لوحِ تربت جن الفاظ میں تجھ سے عالمِ خیال میں مخاطب ہے اپنی چشمِ باطن سے اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرو۔

دوسرا بند معنی: وا نہ کرنا: نہ کھولنا۔

مطلب: اے لوگو! اگر دنیا میں تمہارا مقصد دین کی تعلیم پھیلانا ہے تو خدارا اپنی قوم کو رہبانیت یعنی دنیا کو ترک کرنے کا سبق نہ دینا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ فرقہ بندی کی حمایت میں کبھی اپنی زبان نہ کھولنا۔ اس لیے کہ یہ ایک ایسی لعنت ہے جو ملک و ملت کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس کے برعکس تمہاری ہر تحریر اور تقریر سے اتحاد و اتفاق کا عنصر نمایاں ہونا چاہیے۔ اور نہ ہی ایسی گفتگو کرنا جو دوسروں کے لیے دل دکھانے کا سبب بن جائے۔ مزید یہ کہ آج کے ترقی پذیر معاشرے میں ماضی کی روایات کو دہرانا درست نہیں۔ اس لیے کہ اب اس نوع کی افسانہ طرازی ماحول میں کوئی رنگ نہیں بھر سکتی نا ہی اس سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہو گا۔

تیسرا بند معنی: مدبر: تدبیر کرنے والا۔ **اربابِ سیاست:** سیاسی لوگ۔

مطلب: سرسید کی لوحِ تربت اس بند میں یوں گویا ہے کہ تم لوگوں سے جو مدبر اور سیاستدان ہیں وہ بغور

میرا پیغام سن لیں کہ جراءت مندی اور دلیری ان کا شعار ہونا چاہیے کہ وہ ملک و ملت کے مفاد میں حقیقت پسندی اور راست گوئی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر پیش کریں۔ اور سچائی کے اظہار میں کسی قسم کی جھجک کسی طور پر بھی مناسب نہیں اس لیے کہ اگر ملت درست ہو تو اپنی بات کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ یوں بھی نیک اور حق گو انسان کا دل کسی بھی جھجک اور تذبذب کا شکار نہیں ہوتا اور حکمران خواہ کتنے بھی جابر ہوں ان کے روبرو اپنے نقطہ کا اظہار پوری بیباکی اور جراءت مندی کے ساتھ کرتا ہے۔

چوتھا بند معنی: **خامہ معجز رقم:** ایسا قلم جس کی تحریر معجزہ ہو۔ **تلمیذ رحمانی:** خدا کا شاگرد (مراد ہے خدا سے فیض پانے والا)۔

مطلب: اگر تم میں سے کوئی ادیب یا شاعر ہے تو تیرا دل ہر طرح کی منافقت اور ریاکاری سے پاک ہونا ضروری ہے اس لیے کہ تم لوگ فطرت کے شاگرد ہو لہٰذا تمہارا لب و لہجہ کسی حالت میں بھی بے آبرو نہیں ہونا چاہیے! اپنے اشعار کے اعجاز سے ان لوگوں کو بیدار کر دو جو ایک عرصے سے غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ جھوٹ اور باطل کو اپنی حق گوئی اور راست بازی سے فنا کر دو!

اقبال نے اس نظم میں سرسید احمد خاں کی لوح تربت کے مکالمے کے حوالے سے بعض ایسی حقیقتوں کا اظہار کیا ہے جو سرسید اور خود اقبال کی فکر سے مطابقت رکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی ہی انقلابی کارکردگی کے سبب معاشرے کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک ایسی نظم ہے جو ہر پہلو سے غور طلب اور بے حد اہم ہے۔

ماہِ نو

024

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل — ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب — نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

قافلہ تیرا رواں بے منتِ بانگِ درا — گوشِ انساں سن نہیں سکتا تری آواز پا
گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو — ہے وطن تیرا کدھر؟ کس دیس کو جاتا ہے تو؟
ساتھ اے سیارہ ثابت نما لے چل مجھے — خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بیکل مجھے
نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلکِ سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں

*

پہلا بند معنی: **طشتِ گردوں:** آسمان کا تھال (مراد ہے آسمان)۔ **خونِ ناب:** خالص خون یعنی سرخی۔ **سیمِ خام:** خالص چاندی۔

مطلب: اس انتہائی مختصر سی نظم میں اقبال نے حسب معمول نہایت خوبصورت استعاروں کے ذریعے ماہِ نو کے کردار کا جائزہ لیا ہے اور ان حوالوں سے اپنی بات بھی کی ہے۔ اس بند میں شام کا منظر بیان کرتے

ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ جب سورج اپنا سفر تمام کر کے شام کے دھندلکے میں غرق ہو گیا تو یوں محسوس ہوا کہ اس کے نور کا ایک ٹکڑا سطح آسماں پر ہلال نو کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس لمحے کا منظر بیان کرتے ہئے وہ کہتے ہیں کہ یہ لمحہ وہ ہے کہ شفق کی سرخی اپنی انتہا پر پہنچ چکی ہے بالفاظ دگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فطرت نے سورج کی سرخی انڈیل کر رکھ دی ہے۔ ہلال نو کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے شام ایک دلہن کی مانند ہے اور ہلال نو اس کے کانوں کی بالی ہے یا پھر شفاف پانی میں چاندی کے رنگ جیسی **مچھلی** تیر رہی ہو۔

دوسرا بند **معنی** : **سیارۂ ثابت نما**: وہ سیارہ جو حرکت کرتا ہے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ کھڑا نہیں ہوتا ہے۔

مطلب: اس بند میں اقبال "ہلال نو" کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں تیرا قافلہ گھنٹیوں کے بغیر بڑی خاموشی سے رواں دواں ہے۔ یہ ایسا سکوت ہے جو انسانی کانوں تک جس کی رسائی ممکن نہیں۔ کبھی تو اپنے حجم میں کم ہو جاتا ہے اور کبھی زیادہ! قدرتی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ تیرا سفر کس جانب رواں ہے اور تیری قیام گاہ کہاں ہے؟ اے رواں دواں رہنے والے سیارے مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چل۔ اس لیے کہ میں خود بھی اس ماحول سے پریشان ہوں جو میرے گرد و پیش موجود ہے۔ میں تو تاریکی کی بجائے روشنی کا طالب ہوں اور ایسے بچے کی مانند ہوں جو مدرسے کے نامناسب ماحول سے گھبراتا ہے۔

انسان اور بزم قدرت

025

صبح خورشید درخشاں کو جو دیکھا میں نے
بزم معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے

پرتو مہر کے دم سے ہے اجالا تیرا
سیم سیال ہے پانی ترے دریاؤں کا

مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے
تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے

گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں

سرخ پوشاک ہے پھولوں کی، درختوں کی ہری
تیری محفل میں کوئی سبز، کوئی لال پری

ہے ترے خیمۂ گردوں کی طلائی جھالر
بدلیاں لال سی آتی ہیں افق پر جو نظر

کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی
مے گلرنگ خم شام میں تو نے ڈالی

رتبہ تیرا ہے بڑا، شان بڑی ہے تیری
پردۂ نور میں مستور ہے ہر شے تیری

صبح اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا
زیر خورشید نشاں تک بھی نہیں ظلمت کا

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر
جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیوں کر؟

نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہوں میں

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
بام گردوں سے یا صحن زمیں سے آئی

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
باغباں ہے تری ہستی پئے گلزار وجود

انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں
عشق کا تو ہے صحیفہ، تری تفسیر ہوں میں

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بار جو مجھ سے نہ اٹھا، وہ اٹھایا تو نے

نور خورشید کی محتاج ہے ہستی میری اور بے منت خورشید چمک ہے تیری
ہو نہ خورشید تو ویراں ہو گلستاں میرا منزل عیش کی جا' نام ہو زنداں میرا
آہ! اے راز عیاں کے نہ سمجھنے والے حلقہ دام تمنا میں الجھنے والے
ہائے غفلت! کہ تری آنکھ ہے پابند مجاز ناز زیبا تھا تجھے' تو ہے مگر گرم نیاز
تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر' نہ سیہ کار رہے

*

پہلا حصہ معنی: معمورۂ ہستی: زندگی کی بستی یعنی دنیا۔ پرتو مہر: سورج کی روشنی۔ سیم سیال: بہتی ہوئی چاندی۔ سورۂ والشمس: قرآن پاک کی ایک سورت جو والشمس سے شروع ہوتی ہے۔ سطوت: رعب۔

مطلب: اس نظم کا اگر گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو اس امر کا اندازہ ممکن ہے کہ علامہ نے یہاں پہلی بار فلسفہ خودی کی نشاندہی کی ہے اور یہی فلسفہ آگے جا کر ان کی شاعرانہ فکر کا بنیادی مرکز بنا۔ چنانچہ نظم کے پہلے شعر میں فرماتے ہیں کہ چمکتے ہوئے سورج کے لمحات میں جب میں نے صبح کے وقت کا نظارہ کیا تو اس کائنات سے استفسار کیا جس میں خود میری ذات بھی موجود ہے کہ تجھ میں جو اجالا ہے وہ اسی سورج کی روشنی کے سبب ہے اور تیرے دریاؤں کا چاندی کے مانند شفاف پانی بھی اسی کے دم سے ہے۔ یہ سورج ہی ہے جس نے تجھے نور کا زیور پہنایا ہے اور اسی سورج کا وجود تیری بزم میں ایک روشن شمع کے مانند ہے جس کی روشنی سے ہر شے منور دکھائی دیتی ہے۔ اے کائنات یہ جو تیرے دامن میں گل و گلزار ہیں وہ بہشت کا منظر پیش کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ سب قرآن کریم کے سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں۔ مذکورہ باغات میں جو پھول اور اشجار موجود ہیں' علی الترتیب ان کا لبادہ سرخ اور سبز رنگ کا لگتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ تیری محفل میں کوئی سبز پری اور کوئی لال پری ہو۔

اے دنیا تیرا جو آسمان ہے وہ ایسے خیمے کی طرح سے ہے جس کے گرد سنہری جھالر لٹک رہے ہوں اور افق پر جو سرخی مائل بدلیاں دکھائی دیتی ہیں ان کے ساتھ شفق کی سرخی بھی انتہائی بھلی لگتی ہے جس کے سبب شام کا وقت بھی سرخی مائل دکھائی دیتا ہے۔ اے دنیا تیرا مرتبہ بہت بلند ہے اور تیری شان بھی بڑی ہے۔ اسی لیے تیرے دامن میں جو بھی چیز موجود ہے وہ نور کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ صبح کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی تیری عظمت کے گیت گا رہی ہے اور جہاں تک خورشید کا تعلق ہے تو اس کے منظرنامے میں تاریکی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تیری اس نور کی بستی میں ہرچند کہ میں بھی رہائش پذیر ہوں لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ میری قسمت کا ستارہ روشنی سے محروم ہے تیری ان روشنیوں سے دور ہوتے ہوئے میرا وجود ظلمت کے محبس میں ایک قیدی کے مانند ہے چنانچہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ پھر کیا وجہ ہے کہ میں ہی تیرے دامن میں رہتے ہوئے بدنصیبی اور بدقسمتی کا شکار ہوں؟

دوسرا حصہ معنی: بود و نبود: ہونا نہ ہونا۔ صحیفہ: آسمانی کتاب۔

مطلب: نظم کے اس حصے کا آغاز اقبال پہلے استفسارات کے جوابات کی صورت میں یوں کرتے ہیں کہ میں ابھی اپنے انہی خیالات میں گم تھا کہ معاً کہیں سے میرے کانوں میں آواز آئی تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا

کہ یہ آواز آسمان سے یا پھر زمین سے بلند ہوئی۔

اے انسان! اس حقیقت کو جان لے کہ کائنات کا عدم یا وجود صبح دم طلوع ہوتے ہوئے سورج کے دم سے نہیں بلکہ تیری ذات سے ہے کہ تیری ہی ذات ہے جو میرے گلستاں کے لیے ایک باغبان کی مانند ہے۔ اے انسان! تیرا وجود ہی ہر نوع کی خوبصورتیوں کا مجموعہ ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو ان خوبصورتیوں اور مظاہر فطرت کے عکس کی طرح سے ہوں تو ہی عشق کا وہ صحیفہ ہے جس کی تفسیر میری ذات ہے۔ تو ہی ہے جس نے میرے بگڑے ہوئے کاموں کی مثبت انداز میں تکمیل کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کارکردگی کے ضمن میں جو بوجھ میں نہ اٹھا سکی وہ تو نے ہی اٹھایا ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے دیکھا جائے تو وہ سورج کی روشنی کی محتاج ٹھہرتی ہے جب کہ تجھ میں جو چمک اور تابندگی ہے اس کے لیے سورج کی روشنی قطعی طور پر درکار نہیں۔ اگر سورج کا وجود نہ ہو تو میرا گلستاں اور میری ہستی ایک ویران صحرا میں تبدیل ہو کر رہ جائے اس کے برعکس تیری ذات سورج کے کسی جوہر کی محتاج نہیں۔ سورج کے بغیر تو میرے تمام عشرت کدے، عملاً زندانوں میں تبدیل ہو کر رہ جائیں۔

افسوس! اے انسان تو اس راز کو بھی نہ سمجھ سکا جو عملاً بالکل واضح ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تو خود ہی اپنی خواہشوں کے دام میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ یہ کیسی غفلت ہے اور مقام افسوس بھی ہے کہ تیری آنکھ محض ظاہر پرست ہے اور اس کے ساتھ ہی حقائق سے نا آشنا بھی ہے تیری حیثیت تو محبوب و مطلوب کی ہے جب کہ اپنی کج فہمی کے سبب تو طالب بن کر رہ گیا ہے آخری بات یہ ہے کہ اگر تو اپنی حقیقتوں کا پوری طرح ادراک کر لے تو اس کے بعد تیری بدبختی اور بدنصیبی ختم ہو کر رہ جائے۔

پیامِ صبح
(ماخوذ از لانگ فیلو)

026

اجالا جب ہوا رخصت جبین شب کی افشاں کا
نسیم زندگی پیغام لائی صبح خنداں کا

جگایا بلبل رنگیں نوا کو آشیانے میں
کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دہقاں کا

طلسم ظلمت شب سورۂ والنور سے توڑا
اندھیرے میں اڑایا تاج زر شمع شبستاں کا

پڑھا خوابیدگان دیر پر افسون بیداری
برہمن کو دیا پیغام خورشید درخشاں کا

ہوئی بام حرم پر آ کے یوں گویا موذن سے
نہیں کھٹکا ترے دل میں نمود مہر تاباں کا

پکاری اس طرح دیوار گلشن پر کھڑے ہو کر
چٹک او غنچۂ گل! تو موذن ہے گلستاں کا

دیا یہ حکم صحرا میں، چلو اے قافلے والو!
چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا

سوئے گور غریباں جب گئی زندوں کی بستی سے
تو یوں بولی نظارا دیکھ کر شہر خموشاں کا

ابھی آرام سے لیٹے رہو میں پھر بھی آؤں گی
سلا دوں گی جہاں کو خواب سے تم کو جگاؤں گی

❋

معنی : افشاں: ستارے سے جو عورتیں آرائش کے لیے اپنے بالوں پر چھڑکتی ہیں۔ **دہقاں**: کسان۔ **سورۂ والنور**: یہاں مراد ہے سورج کا اجالا۔ **خوابیدگان دیر**: بت خانے میں سونے والے۔ **شہر خموشاں**: چپ رہنے والوں کی بستی یعنی قبرستان۔

مطلب : نو اشعار پر مشتمل یہ نظم مشہور زمانہ امریکی شاعر "لانگ فیلو" کی تخلیق (The Day Break) دی ڈے بریک کا آزاد ترجمہ تو نہیں کہی جا سکتی البتہ بقول علامہ اقبال اس سے ماخوذ ضرور ہے اس نظم میں اقبال نے جس نوع کی امیجری اور فطرت نگاری سے کام لیا ہے وہ ان کی فن پر مکمل گرفت اور قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جب آسمان پر ستارے ڈوب گئے اور شب کا اختتام ہوا تو ہنستی کھیلتی زندگی پیغام سحر لے کر نمودار ہو گئی یعنی صبح اپنے اجالے کے ساتھ وارد ہو گئی اور اپنے عمل میں اس طرح مصروف ہوئی کہ بلبل جو اپنے گھونسلے میں محو استراحت ہوئی پہلے اسے جگایا اس کے بعد کسان جو کھیت کے کنارے پر محو خواب تھا اسے بھی بیدار کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے سورۂ والنور کی قوت سے ظلمت شب کا طلسم توڑ ڈالا اور عشرت گاہوں میں روشن ہونے والی شمعوں کو بھی بجھا دیا۔ جو برہمن مندروں میں سو رہے تھے ان کو بھی بیدار کیا اور طلوع ہونے والے سورج کا پیغام بھی دیا۔ دوسری جانب اس نے موذن سے مسجد میں پہنچ کر یوں مکالمہ کیا کہ سورج نکلنے کے بعد نہ اذان کا وقت باقی رہے گا نا ہی نماز کا! اس لیے بیدار ہو کر اذان بھی دے اور نماز بھی ادا کر۔ پھر وہ باغ میں آئی اور غنچوں کو چٹکنے کی طرف راغب کیا۔ اس کے بعد صحرا کی جانب نکل گئی اور تھکے ماندے قافلوں کو پھر سے آغاز سفر کے لیے آمادہ کیا کہ اب دھوپ نکلنے والی ہے اس لیے روانہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد وہ قبرستان میں جا پہنچی تو وہاں سناٹے کو دیکھ کر اہل قبور سے یوں گویا ہوئی کہ ابھی تم آرام سے لیٹے رہو کہ میں بعد میں پھر یہاں آؤں گی اور زمانے بھر کو بیدار کرنے کے بعد تمہاری بیداری کا اہتمام کروں گی۔

عشق اور موت
(ماخوذ از ٹینی سن)

027

سہانی نمود جہاں کی گھڑی تھی ۔۔۔ تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاج زر مل رہا تھا ۔۔۔ عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے ۔۔۔ ستاروں کو تعلیم تابندگی تھی
کہیں شاخ ہستی کو لگتے تھے پتے ۔۔۔ کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا ۔۔۔ ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی
عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو ۔۔۔ خودی تشنہ کام مے بیخودی تھی
اٹھی اول اول گھٹا کالی کالی ۔۔۔ کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں
مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہوں

غرض اس قدر یہ نظارا تھا پیارا — کہ نظارگی ہو سراپا نظارا
ملک آزماتے تھے پرواز اپنی — جبینوں سے نور ازل آشکارا
فرشتہ تھا اک، عشق تھا نام جس کا — کہ تھی رہبری اس کی سب کا سہارا
فرشتہ کہ پتلا تھا بیتابیوں کا — ملک کا ملک اور پارے کا پارا
پے سیر فردوس کو جا رہا تھا — قضا سے ملا راہ میں وہ قضارا
یہ پوچھا "ترا نام کیا؟ کام کیا ہے؟ — نہیں آنکھ کو دید تیری گوارا"
ہوا سن کے گویا قضا کا فرشتہ — اجل ہوں، مرا کام ہے آشکارا
اڑاتی ہوں میں رخت ہستی کے پرزے — بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا
مری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے — پیام فنا ہے اسی کا اشارا
مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی — وہ آتش ہے، میں سامنے اس کے پارا
شرر بن کے رہتی ہے انساں کے دل میں — وہ ہے نور مطلق کی آنکھوں کا تارا
ٹپکتی ہے آنکھوں سے بن بن کے آنسو — وہ آنسو کہ ہو جن کی تلخی گوارا
سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی — ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا
گری اس تبسم کی بجلی اجل پر — اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا؟

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی، شکار قضا ہو گئی وہ

*

یہ نظم ممتاز برطانوی شاعر ٹینی سن کی نظم "Love and Death" سے ماخوذ ہے۔ اقبال نے نظم کے مرکزی اور بنیادی خیال کو پوری مہارت کے ساتھ اپنے مخصوص خوبصورت انداز میں اپنے ہاں منتقل کیا ہے۔ یہ نظم عملاً دو بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں اقبال نے آغاز کائنات کے حوالے سے مختلف عناصر کی صورت حال کو پیش کیا ہے جب کہ دوسرے بند میں عشق اور موت کے مابین جو مراحل ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پہلا بند معنی: تبسم فشاں: مسکراتی ہوئی۔ تشنہ کام: پیاسی۔

مطلب: نظم کے اس حصے میں اقبال آغاز کائنات کے ان لمحات کا ذکر کرتے ہیں جب تخلیق کے عمل کا آغاز ہوا تھا اور زندگی کی کلی کھل رہی تھی۔ ان لمحات میں خالق لم یزل کی جانب سے کہیں آفتاب کو کائنات پر دھوپ اور روشنی بکھیرنے کی صلاحیت ملی تھی اور کہیں ماہتاب کو چاندنی پھیلانے کی قوت عطا ہو رہی تھی۔ شام کے وقت کو سیہ لباس فراہم کیا جا رہا تھا جب کہ ستاروں کو چمک کا تحفہ دیا جا رہا تھا۔ کرہ ارض پر زندگی اور تخلیق کے جذبوں سے نوازا جا رہا تھا۔ ان لمحات میں فرشتے شبنم کو آنسو بہانے کی تربیت دے رہے تھے اور کہیں پہلی بار کلی چٹک کر پھول کے لبوں کو خندہ زن کر رہی تھی۔ شاعر کے دل میں درد کی لذت بھی اسی لیے فراہم کی گئی اور خودی کو بھی بے خودی کے جذبے سے مسحور کیا جا رہا تھا۔
پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہلی بار کالی کالی گھٹاؤں کی اس طرح آمد ہوئی کہ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی حور اپنے گھنیرے بال کھولے ہوئے کھڑی ہے۔

دوسرا بند معنی: نظارگی: دیکھنا' نظارہ کرنا۔ **قضارا:** اتفاق سے۔
مطلب: آغاز کائنات کے لمحات بقول اقبال اس قدر خوبصورت اور نظر فریب تھے کہ یہ مناظر سراپا ایک دیکھنے کی چیز بنے ہوئے تھے۔ ان لمحات میں آسمانوں پر فرشتے بھی اس قدر مسرور تھے کہ چاروں جانب اس طرح رواں دواں تھے جیسے اپنی قوت پرواز کی آزمائش کر رہے ہوں۔ ان کی پیشانیوں سے نور ازل آشکار ہو رہا تھا۔ ان میں ایک فرشتہ عشق کے جذبے کا بھی تھا جو دوسرے فرشتوں کی رہنمائی کیا کرتا تھا۔ اس فرشتے میں اضطراب کا عنصر اس طرح نمایاں تھا جیسے اس کے وجود میں پارا متحرک ہو۔
عشق کا یہ فرشتہ جنت کی سیر کو جا رہا تھا کہ اچانک اسے راستے میں موت کا فرشتہ یعنی ملک الموت مل گیا۔ عشق کے فرشتے نے اس سے استفسار کیا کہ بتاؤ تو سہی! تو کون ہے اور تیرا کام کیا ہے؟ تجھے دیکھ کر مجھے کچھ ناگوار سی کیفیت محسوس ہو رہی ہے۔ اس مرحلے پر ملک الموت نے جواباً کہا! حیرت ہے کہ تو میری ذات سے واقف نہیں۔ میں ہی تو وہ ہوں جو ہر زندہ شے کو فنا کے گھاٹ اتارنے پر قادر ہوں۔ میں ہی زندگی کے پرزے اڑاتی ہوں اور اسے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیتی ہوں۔ میری آنکھوں میں وہ جادو ہے جو وجود کو عدم وجود سے آشنا کرتا ہے اور جس کا پیغام فنا ہے۔ مگر ایک ہستی ایسی بھی ہے جو اس دنیا میں آگ کی مانند ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میں اس کے مقابلے میں پارے کی حیثیت رکھتا ہوں۔ یہ ہستی قلب انسان میں ایک شعلے کی مانند پوشیدہ رہتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہی خدائے لم یزل کی آنکھوں کا تارا ہے۔ مراد یہ کہ خداوند عالم اسے بہت عزیز رکھتا ہے۔
یہی ہستی یعنی عشق انسان کے دل میں موجزن رہتا ہے اور اس کا وجود اس کے لیے تلخ ہونے کے باوجود ایک خوش گوار حیثیت رکھتا ہے۔
عشق کے فرشتے نے جب ملک الموت کی گفتگو سنی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور اس کا یہی تبسم بجلی بن کر موت کے فرشتے پر گرا۔ اس لیے کہ روشنی کے روبرو تاریکی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ عشق تو زندگی کا مظہر ہے۔ ظاہر ہے موت اس کے روبرو کیسے ٹھہر سکتی تھی۔

زہد اور رندی

028

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی
لبریز مے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہ میں کہیں درد خیال ہمہ دانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی
پابندی احکام شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشک کلیم ہمدانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اس کی زبانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی
مجموعۂ اضداد ہے اقبال نہیں ہے دل دفترِ حکمت ہے، طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی ہو گا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی
القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے تادیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی
اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی ہے سب میں میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی
اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
فرمایا، شکایت وہ محبت کے سبب تھی تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے یہ آپ کا حق تھا زرہِ قربِ مکانی
خم ہے سرِ تسلیم مرا آپ کے آگے پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے؟
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

*

زہد اور رندی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک جانب تو علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت اور واضح انداز میں اپنے عقائد کا ذکر کیا ہے اور دوسری جانب ان تضادات کی نشاندہی بھی کی ہے جو ملا ازم اور پاپائیت کے تعصبات کی پیداوار ہیں۔ اس نظم کے عملی سطح پر دو کردار ہیں۔ ایک مولوی اور دوسرا ایسا آزاد خیال مسلمان جو اسلام کو انتہائی وسیع المشرب مذہب تصور کرتا ہے جب کہ مولوی اسے اپنے ذاتی تعصبات کی عینک سے ہی دیکھتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں!

معنی: صوفی منش: صوفی مزاج۔ **اعالی**: اعلیٰ کی جمع، بڑے لوگ۔ **وردِ خیال**: تجھٹ۔ **ہمہ دانی**: سب کچھ جاننا۔ **کلیم ہمدانی**: ایران کے شہر ہمدان کا ایک شاعر۔ **قربِ مکانی**: مکان کی نزدیکی یعنی پڑوس۔ **تمسخر**: مذاق۔

مطلب: میں یہاں آپ کو ایک مولوی صاحب کی داستان سنانے لگا ہوں۔ میرے اس عمل کا مقصد قطعی طور پر یہ نہیں ہے کہ محض اپنی طبع کی تیزی کا اظہار کروں بلکہ کچھ ایسے حقائق ہیں جن کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ جن مولوی صاحب کی داستان سنائی جا رہی ہے ان کے بارے میں یہی شہرت تھی کہ وہ تصوف کے فلسفہ سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اسی سبب ہر چھوٹا بڑا موصوف کا بہت احترام کرتا تھا۔

ان مولوی صاحب کا عقیدہ یہ تھا کہ تصوف کے فلسفے میں شریعت اس طرح پوشیدہ ہے جیسے کہ الفاظ میں معانی چھپے ہوتے ہیں۔ ان کا دل بھی کہا جاتا ہے کہ زہد سے لبریز تھا یوں بھی وہ خود کو بہت خیرو عاقل تصور کرتے تھے۔ اور کسی دوسرے کو خاطر میں بھی نہیں لاتے تھے۔ ان کے اس رویے کا بنیادی مقصد فی الواقع اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اپنے مریدوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ مولوی صاحب عرصہ دراز سے میرے پڑوس میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ میں تو خیر رند ہی تھا لیکن زہد کے ان دعویدار سے پڑوسی ہونے کے ناطے میری پرانی واقفیت تھی۔ ایک روز انہوں نے میری بجائے میرے ایک واقف کار سے استفسار کیا کہ یہ شخص اقبال جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بلند پایہ شاعر ہے اس کے متعلق سنا گیا ہے کہ ہندو کو کافر نہیں سمجھتا اس نوع کا عقیدہ تو محض ایسے شخص کا ہو سکتا ہے جو محض فلسفے پر یقین رکھتا ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اقبال اگرچہ شاعر تو بہت اچھا ہے تاہم احکام شریعت کی پابندی بھی کرتا ہے یا نہیں؟

مزید براں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اقبال کی فطرت میں شیعیت کے عقیدے کا بھی کچھ عمل وخل ہے۔ اس لیے کہ وہ خلفاء میں حضرت علیؓ کو افضل تصور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ راگ رنگ کو بھی عبادت کا ایک حصہ خیال کرتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ مذہب کا مذاق اڑاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ تو طوائفیت کو بھی برا نہیں سمجھتا۔ مگر محض اقبال سے ہی یہ شکایت نہ ہونی چاہیے اس لیے کہ ہمیشہ سے ہمارے شعراء کا یہی وطیرہ رہا ہے۔

وہ یہی تو کرتے ہیں کہ رات کو گانے سے محظوظ ہونا اور صبح دم قرآن کریم کی تلاوت کرنا! یہ صورت حال بحرال ایک ایسا راز ہے جس کی تعبیر سے کم از کم ہم ابھی تک آگاہ نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے مریدوں سے یہ بھی سنا ہے کہ وہ عالم شباب میں بھی بے داغ کردار کا مالک ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال اضداد کا مجموعہ ہے یعنی اس کا دل تو حکمت و دانش کا خزینہ ہے جب کہ طبیعت میں قدرے جنون کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔: مولوی صاحب اپنے استفسارات کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھ پر اس شخص کی حقیقت واضح نہیں ہوتی کیا وہ کسی نئے اسلام کا بانی تو نہیں ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ ان کی لمبی چوڑی تقریر کافی دیر تک جاری رہی چونکہ اس شہر میں کوئی بات چھپی نہیں رہتی اس لیے مولوی صاحب کے ارشادات کا ہر طرف چرچا ہوا اس کی داستان مجھ تک بھی پہنچی۔

اقبال کہتے ہیں کہ بعد میں ایک روز مولوی صاحب سر راہ اچانک مل گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولے برا نہ منانا! وہ باتیں جو تم تک پہنچیں دراصل وہ تو محبت کے سبب کہی گئی تھیں۔ میرا مقصد تو تمہیں محض شیعت کی راہ سے آگاہ کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اقبال کہتے ہیں اس مرحلے پر میں نے جواباً کہا کہ پڑوسی ہونے کے ناطے آپ نے جو کچھ فرمایا وہ یقیناً آپ کا حق تھا مجھے اس پر کوئی گلہ اور شکایت نہیں!

مولانا! میں تو آپ کا نیاز مند ہوں۔ ویسے بھی آپ میرے بزرگ ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ اگر آپ میری حقیقت سے آگاہ نہیں تو اس پر حیرت بھی نہیں ہوتی نا ہی اس میں کسی دانش کا دخل ہے۔ اس لیے کہ میں تو خود بھی اپنی حقیقت سے واقفیت نہیں رکھتا۔ میرے خیالات میں جو گہرائی ہے اس کا علم تو مجھے بھی نہیں۔ میری بھی یہی خواہش ہے کہ اقبال کو خود بھی دیکھوں۔ میں نہیں جانتا کہ میں کیا شے ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اقبال خود بھی اقبال کی حقیقت سے آگاہ نہیں۔ اور اس معاملے میں کسی طرح کے طنز و مزاح کی گنجائش نہیں ہے۔

شاعر

029

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظم حکومت، چہرۂ زیبائے قوم شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

*

① معنی: رہ پیما: راستہ چلنے والے۔ عضو: حصہ۔

مطلب: تین اشعار پر مشتمل یہ نظم اقبال کی انتہائی خوبصورت جامع اور مختصر نظموں میں سے ہے۔ ان اشعار میں انہوں نے انتہائی جاندار الفاظ میں شاعر کی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق قوم کو اگر ایک جسم تصور کر لیا جائے تو افراد کو اس کے اعضاء سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان افراد میں سے جو لوگ صنعت و حرفت کے پیشے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ عملاً قوم کے دست و بازو کی حیثیت کے حامل ہیں۔

② اس کے علاوہ جو لوگ نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے ہوئے نظام حکومت چلاتے ہیں وہ قوم کے چہرے پر حسن و خوبصورتی کے مظہر ہوتے ہیں۔ مراد یہ کہ جس طرح کسی شخص کی خوبصورتی کا اندازہ اس کے چہرے کو دیکھ کر ہوتا ہے اسی طرح کسی قوم کی خوبیوں کو بر سر اقتدار طبقے کی صلاحیت اور کردار سے پرکھا جا سکتا ہے تاہم شاعر کی حیثیت ان سب سے بلند ہے کہ وہ قوم کے لیے دیدۂ بینا کی طرح سے ہے۔

③ مشاہدے اور تجربے کے مطابق یہ بات بڑے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جسم کے کسی حصے کو بھی تکلیف پہنچے تو اس کا اظہار آنکھ سے ہی ہوتا ہے۔ مراد یہ کہ اس تکلیف کے سبب آنکھ میں ہی آنسو آ جاتے ہیں۔ اس امر سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ آنکھ جسم کی کس قدر ہمدرد ہوتی ہے مطلب یہ کہ شاعر کو اگر قوم کی آنکھ تسلیم کر لیا جائے تو پوری قوم کو اسے غم گسار بھی ماننا پڑے گا۔

دل

030

قصۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل التجائے ارنی سرخیِ افسانۂ دل
یا رب! اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہو گی جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل
ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یا رب! جل گئی مزرعِ ہستی تو اگا دانۂ دل
حسن کا گنجِ گرانمایہ تجھے مل جاتا تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر کس کی منزل ہے الٰہی! مرا کاشانۂ دل
اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانۂ دل
تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں! اس کو رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل
خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے وہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل
عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے

برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

*

معنی: بازی طفلانہ: بچوں کا کھیل۔ مزرع: کھیتی۔ حسن: محبوب۔ خاک کے ڈھیر: مراد انسان ہے۔

مطلب: اقبال اس نظم کے دل کے محاسن و خصائص بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عام لوگوں کے لئے اپنی جان پر کھیل جانا بے شک ناممکنات سے ہے لیکن جو اہل دل ہیں یعنی عشاق ہیں ان کے لیے یہ عمل بچوں کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ دل کی ماہیت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب بس اتنا ہی ہے کہ خدائے عزوجل کا جلوہ دیکھنے کی خواہش اس داستان کا عنوان بنتا ہے۔

① تا ③ اقبال نے اس شعر کی دوسرے مصرع میں کوہ طور کے واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ کہ یہ عمل تو دل کے لیے ایک سہل کام ہے۔ اور ایسا دل جو معرفت کی شراب سے لبریز ہو۔ سوچئے تو سہی اس کی قیمت کیا ہو گی؟ کہ یہ تو انسان کے لیے بقائے دوام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر انسان دل کو اپنا رہبر بنا لے تو جذبہ عشق اسے بقائے دوام عطا کر دیتا ہے۔ دراصل اقبال کے نزدیک عشق ایسا جذبہ ہے جس کا تعلق دل سے ہے۔ نہ جانے یہ ابر رحمت تھا یا عشق کی بجلی کہ آخر الذکر کا کام جلانا اور فنا کر دینا ہے جب کہ ابر رحمت تو تخلیق کی علامت ہے۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ عشق کے جذبے نے تو زندگی کو فنا کر کے رکھ دیا تھا پھر یہی جذبہ ابر رحمت کی صورت میں ظاہر ہوا اور یوں دل کی تخلیق وجود میں آئی۔

④ یہاں فرہاد سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ تو اگر دل کی گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت رکھتا تو اپنے عشق میں یقیناً کامیاب ہو جاتا پھر تجھے مشروط بنیاد پر جوئے شیر لانے کے لیے پہاڑ کو کھودنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔

⑤ اس شعر میں اقبال عالم حیرت میں کہتے ہیں کہ کبھی تو دل پر عرش کا دھوکا ہوتا ہے اور کبھی یہ کعبہ کے مانند لگتا ہے۔ دوسرے مصرع میں وہ رب ذوالجلال سے استفسار کرتے ہیں کہ تو ہی مجھ پر یہ راز ظاہر کر دے کہ میرا یہ دل آخر کس فرد کی آماجگاہ ہے؟ اس شعر سے باسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر نے یہ اشارہ ذات خداوندی کی جانب کیا ہے کہ وہی انسان کے دل میں مقیم ہوتی ہے۔

⑥ اقبال کے اس شعر میں تغزل پوری انتہا پر پہنچا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں دل اور میں عملی سطح پر دونوں ہی مجنوں اور سودائی ہیں تاہم فرق اتنا ہی ہے کہ یہ دل تو کسی اور کا دیوانہ ہے جب کہ میں دل پر فریفتہ ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ میرا دل کائنات کو پیدا کرنے والے کے عشق میں سرشار ہے۔ لہذا اس پر میرا فدا ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ عشق کا یہ تعلق بالواسطہ ہے۔

⑦ وہ کہ جسے زہد کا دعویٰ ہے وہ اس حقیقت کا ادراک کیسے کرے گا عشق کی ایک لغزش عملی سطح پر سینکڑوں سجدوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔

⑧ عشق میں جلنے والے دل کی راکھ تو ایک ایسی اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے جو مٹی کے ڈھیر پر ڈال دی جائے تو اس کو بھی سونا بنا دے۔ مراد یہ کہ عشق میں وہ کیفیت ہے جو انسان کو بلند مدارج بخشتی ہے۔

⑨ اس شعر میں دل کو متضاد کیفیتوں کا اہل بتایا گیا ہے کہ عشق کے دام میں پھنس جانے کے باوجود وہ خود کو آزاد سمجھتا ہے اور اگر اسے ایک پودا تصور کر لیا جائے اور اس پر بجلی گر جائے تو دل خاک ہونے کی بجائے سرسبز ہو جاتا ہے۔

موج دریا

031

مضطرب رکھتا ہے میرا دل بیتاب مجھے
عین ہستی ہے تڑپ صورت سیماب مجھے
موج ہے نام مرا، بحر ہے پایاب مجھے
ہو نہ زنجیر کبھی حلقہ گرداب مجھے
آب میں مثل ہوا جاتا ہے توسن میرا
خار ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

میں اچھلتی ہوں کبھی جذب مہ کامل سے
جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے
کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
زحمت تنگی دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعت بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

*

پہلا بند معنی: پایاب: تھوڑا پانی جس سے آدمی پیدل گذر جائے۔ توسن: گھوڑا۔ خار ماہی: مچھلی کا کانٹا۔

مطلب: دو بند پر مشتمل اس نظم میں اقبال نے دریا کی زبان سے ایک مکالمے کو اپنی اس تخلیق کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے بقول پہلے بند میں دریا یوں گویا ہوتا ہے کہ میرا بے چین دل ہر لمحے مجھے مضطرب رکھتا ہے اس لیے کہ پارے کی مانند تڑپ اور متحرک رہنا ہی میری حقیقی زندگی ہے۔ میرا نام موج ہے اور سمندر کا گہرا پانی میرا ذخیرہ ہے جس میں رونما ہونے والے بھنور عملی سطح پر میرے لیے زنجیر نہیں بن سکتے۔ اس لیے کہ میں طبعاً" آزاد ہوں اور کوئی پابندی میرے لیے ناقابل قبول ہے۔ اسی سبب کوئی شے میری راہ میں کسی طور پر بھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ میں پانی میں تیز گھوڑے کی مانند ہوا کی رفتار سے سفر کرتی ہوں۔ اس سفر کے دوران وہ مچھلی بھی میری راہ میں حائل نہیں ہو سکتی جس کی پشت پر ایک بڑی ہڈی ہوتی ہے۔

دوسرا بند معنی: جذب: کھنچنا۔ گریزاں: بھاگنے والی۔ وسعت بحر: سمندر کی وسعت۔

مطلب: اس بند میں موج دریا یوں گویا ہوتی ہے کہ کبھی تو چودھویں رات کے چاند کی کشش سے مدوجزر سے ہمکنار ہوتی ہوں اور کبھی جوش و خروش کے عالم میں ساحل کے کناروں سے ٹکراتی ہوں۔ میں تو دراصل اس مسافر کے مانند ہوں جس کو منزل ہی راس آتی ہے اور اسی سے اس کا تعلق خاطر ہوتا ہے۔ لیکن مجھ میں یہ بے چینی اور اضطراب کیوں ہے اس کو کوئی میرے دل سے ہی پوچھے تو اس کا جواب ممکن ہو سکتا ہے۔ امرواقع یہ ہے کہ میں جو فطری سطح پر وسیع المشرب ہوں۔ دریا کی تنگ دامانی سے نجات حاصل کرنے کی خواہاں رہتی ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سمندر کی وسعت اور فراخی کو پانے کے لیے میرا دل ہمیشہ مضطرب رہتا ہے۔

032

رخصت اے بزم جہاں

(ماخوذ از ایمرسن)

رخصت اے بزم جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

بسکہ میں افسردہ دل ہوں، در خور محفل نہیں
تو مرے قابل نہیں ہے، میں ترے قابل نہیں!

قید ہے دربار سلطان و شبستان وزیر
توڑ کر نکلے گا زنجیر طلائی کا اسیر

گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا
مدتوں بے تاب موج بحر کی صورت رہا

مدتوں بیٹھا ترے ہنگامہ عشرت میں میں
روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں میں

مدتوں ڈھونڈا کیا نظارۂ گل خار میں
آہ! وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں

چشم حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے
آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے

چھوڑ کر مانند بو، تیرا چمن جاتا ہوں میں
رخصت اے بزم جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں

گھر بنایا ہے سکوت دامن کہسار میں
آہ! یہ لذت کہاں موسیقی گفتار میں

ہمنشین نرگس شہلا، رفیق گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن، ہمسایہ بلبل ہوں میں

شام کو آواز چشموں کی سلاتی ہے مجھے
صبح فرش سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھے

بزم ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دل شاعر کو لیکن کنج تنہائی پسند

ہے جنوں مجھکو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو، کوہ کی وادی میں میں

شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے؟
اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے

طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنج عزلت کا ہوں میں
دیکھ اے غافل! پیامی بزم قدرت کا ہوں میں

ہم وطن شمشاد کا، قمری کا میں ہمراز ہوں
اس چمن کی خامشی میں گوش بر آواز ہوں

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لیے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لیے

عاشق عزلت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسند دارا و اسکندر پہ میں

لیٹنا زیر شجر رکھتا ہے جادو کا اثر
شام کے تارے پہ جب پڑتی ہے رہ رہ کر نظر

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود؟
گل کی پتی میں نظر آتا ہے راز ہست و بود

*

① تا⑤ **معنی**: در خور محفل: محفل کے قابل۔ خود آراؤں: خود پسند لوگ۔ موج بحر: سمندر کی لہر۔

مطلب: جیسا کہ بتایا گیا ہے یہ نظم اقبال کی طبع زاد نہیں بلکہ ایمرسن کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ اس کے باوجود اکثر مقامات پر اس نظم میں علامہ کے فکر و نظریات کی جھلک موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا سے میرا دل اچاٹ ہو چکا ہے۔ یہ دنیا تو ایک ایسی آبادی کی مانند ہے۔ عملی سطح پر جو ایک ویرانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا دل اس سے گھبرانے لگا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اتنا افسردہ دل ہو چکا ہوں کہ کسی طرح کی محفل آرائی کو پسند نہیں کر سکتا بس اے دنیا اب تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نہ ہی تو

میرے قابل ہے اور نا ہی میں تیرے قابل ہوں۔ یہ دنیا امیر و وزیر اور بادشاہوں کے درباروں میں گرفتار ہو کر رہ گئی ہے اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد فضا میں سانس لینے کا خواہاں ہوں۔

یہ تسلیم کہ تجھ میں جو زندگی اور رونق ہے وہ ہر شخص کے لیے بیشک کشش انگیز ہے اس کے برعکس میرے لیے تو تیرا وجود اجنبی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک عرصے تک ان خود پسند اور متکبر لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہا ہوں جو تیرے دامن میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ہر ممکن برداشت کے باوجود ان کے مابین اس طرح سے مضطرب اور تڑپتا رہا جس طرح کہ سمندر کی بے چین موج مضطرب اور پریشان رہتی ہے۔ مراد یہ کہ یہ ماحول سدا سے میرے لیے ناقابل برداشت ہی رہا۔

⑥ تا ⑨ **معنی: یوسف:** تلمیح ہے حضرت یوسفؑ کی۔ **نرگس شہلا:** نرگس کے پھول کی ایک قسم۔

مطلب: "بزم جہاں" سے مخاطب ہوتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک مدت تک تیرے ہنگاموں میں شریک رہا ہوں لیکن یہ عرصہ ایک طرح سے بیکار ہی ضائع ہوا۔ میں نے ہرچند کوشش کی کہ اس ظلمت کدے سے روشنی پا لوں لیکن کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ یہ میری راہ کے کانٹے تھے جن میں مدتوں پھول کے نظارے تلاش کرتا رہا لیکن تیرے بازار میں اس یوسفؑ کو نہ پا سکا۔ مراد یہ ہے کہ ہر ممکن سعی کے باوجود میں حصول مدعا میں ناکام رہا۔ اب تو یہ کیفیت ہو چکی ہے کہ میری آنکھیں ایک اور نظارے کی متلاشی ہیں جو اس امر کی آرزومند ہیں کہ میں جو طوفان میں گھرا ہوا ہوں اس کی ساحل تک رسائی ہو جائے۔ چنانچہ تیرے چمن کو اس طرح سے چھوڑ کر جا رہا ہوں جس طرح سے کہ پھول سے خوشبو رخصت ہوتی ہے۔ اس صورت میں تجھ سے اے بزم جہاں رخصت ہو کر اپنے حقیقی وطن جا رہا ہوں۔

⑩ تا (13) **معنی: گوش بر آواز:** جس کے کان صدا پر لگے ہوتے ہیں۔ **عاشق عزلت:** تنہائی کا عاشق۔

مطلب: نظم کے اس حصے میں اس دوسرے منظر کی نشاندہی کرتے ہیں جو بقول ان کے حقیقی وطن بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اس وطن میں رہنے کے لیے جو گھر بنایا ہے وہ دامن کہسار میں واقع ہے اور وہاں ایسا سکوت ہے جس کے مقابلے پر آواز کی موسیقیت میں بھی لطف نہیں ہوتا۔ یہاں میں نرگس اور گلاب کے پھولوں کی ہم نشینی اور رفاقت حاصل ہے۔ یہاں کا گلستاں ہی میرا وطن ہے جہاں بلبل کے گھونسلے کی قربت میں میرا گھر واقع ہے اس خوبصورت ماحول میں چشموں کی مست آوازیں مجھے نیند سے ہم کنار کرتی ہیں اور صبحدم کوئل کی کوک میرے لیے بیداری کا پیغام دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی زندگی میں خواص و عوام ہر لمحے محفل آرائی اور ہنگاموں کو پسند کرتے ہیں اس کے برعکس مجھ ایسے شاعر کو تو ایسا گوشہ مرغوب ہے جو ہر طرح سے پر سکون ہو۔

(14): نظم کے اس حصے میں اقبال ایک بار پھر اپنی کیفیت اور اضطراب کا احوال بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ میں تو شاید سودائی ہو گیا ہوں کہ آبادی سے گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ بار بار خود ہی اس سوچ میں گم ہو رہا ہوں کہ وہ کون سی ہستی ہے جس کو دامن کوہ میں تلاش کرنے آنکلا ہوں۔ ایسا کس چیز کا

شوق ہے جو مجھے ان سبزہ زاروں میں سرگرداں کیے ہوئے ہے اور جس کے سبب میں چشموں کے کناروں پر محو استراحت ہوتا ہوں۔

اے بزم جہاں! تو مجھے یہ طعنہ دے رہی ہے کہ میں تنہائی کا عادی ہو گیا ہوں حالانکہ تجھے اس حقیقت کا علم ہی نہیں کہ میں تو فطرت اور اس کے مظاہر کو پیش کرنے والا ہوں۔ میں تو صنوبر کے درخت کی قربت سے استفادہ کر رہا ہوں اور قمری کے رازوں سے بھی آگاہی رکھتا ہوں۔ ہر چند کہ یہ چمن جہاں میں مقیم ہوں پر سکوت ہے لیکن اس کی خاموشی میں بھی کچھ ایسی آوازیں ہیں جن کو میں سننے کا اہل ہوں اور یہاں جو کچھ سنتا ہوں اس کو دوسروں تک بھی پہنچاتا ہوں۔ مزید بر آں جو کچھ دیکھتا ہوں وہ دوسروں کو دکھانے کی سعی بھی کرتا ہوں۔ بے شک میں تنہائی کا عاشق ہوں لیکن میرا دل اپنے اسی گھر پر ناز کرتا ہے۔ اس کے مقابلے پر دارا اور سکندر جیسے شان و شوکت رکھنے والے بادشاہوں کے عشرت کدے میرے نزدیک انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ جب کسی درخت کے زیر سایہ شب کو محو استراحت ہوتا ہوں اور اس عالم میں آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں پر نظر پڑتی ہے تو مسحور ہو کر رہ جاتا ہوں۔ مجھے تو پھول کی پتی سے ہی موت اور زندگی کے پوشیدہ اسرار کا انکشاف ہو جاتا ہے جب کہ علم و فلسفے میں میرے نزدیک یہ خصوصیت ناپید ہے۔

طفل شیر خوار

033

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو

پھر پڑا روئے گا اے نووارد اقلیم غم
چبھ نہ جائے دیکھنا! باریک ہے نوک قلم

آہ! کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے؟
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے

گیند ہے تیری کہاں؟ چینی کی بلی ہے کدھر؟
وہ ذرا سا جانور ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر

تیرا آئینہ تھا آزاد غبار آرزو!
آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرار آرزو

ہاتھ کی جنبش میں، طرز دید میں پوشیدہ ہے
تیری صورت آرزو بھی تیری نوزائیدہ ہے

زندگانی ہے تری آزاد قید امتیاز
تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے، چلاتا ہے تو
کیا تماشا ہے ردی کاغذ سے من جاتا ہے تو

آہ! اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا
تو تلون آشنا، میں بھی تلون آشنا

عارضی لذت کا شیدائی ہوں، چلاتا ہوں میں
جلد آ جاتا ہے غصہ، جلد من جاتا ہوں میں

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسن ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری

تیری صورت گاہ گریاں، گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں، طفل ناداں میں بھی ہوں

٭

① تا ③ معنی: نووارد اقلیم غم: غم کے ملک میں نیا نیا آنے والا وجود۔

مطلب: علامہ اقبال ننھے بلکہ دودھ پیتے بچوں کی نفسیات پر بھی کتنی گہری نظر رکھتے تھے اور اس حوالے

سے اور اپنے نقطہ نظر کے اظہار میں جو طرز عمل اختیار کرتے تھے اس کا اندازہ زیر تشریح نظم سے ہوتا ہے۔ یہاں وہ ایک دودھ پیتے بچے سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے طفل ناداں! تیرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ چنانچہ میں نے اسے تیرے ہاتھ سے چھین لیا اس پر تو چیخ پڑا اس لیے کہ تجھے اس حقیقت کا علم نہ تھا کہ اس تیز دھار ہتھیار سے تجھے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے مگر تو نے تو میرے اس عمل کو نامہربانی پر محمول کیا حالانکہ میرا یہ فعل تو خالصتاً مہربانی کا حامل تھا۔

اس کے بعد تو نے قریب پڑا ہوا قلم اٹھا لیا تجھے تو اس امر کا علم بھی نہ تھا کہ اس قلم کی نوک کتنی تیز اور باریک ہے۔ کہیں چبھ گئی تو تکلیف سے رونے لگے گا۔ نہ جانے تو ان تکلیف دینے والی اشیاء کا اتنا گرویدہ کیوں ہے؟ کھیلنا ہی ہے تو اس کاغذ کے ٹکڑے سے کھیل! کہ اس کے لمس سے تجھے قطعی طور پر تکلیف نہیں پہنچے گی۔

④ **مطلب**: پیارے بچے! مجھے یہ تو بتا کہ تیرے کھلونے کیا ہوئے۔ تیری گیند کہاں ہے اور چینی کی وہ خوبصورت بلی کیا ہوئی جس کا سر ٹوٹا ہوا ہے۔ پیدا ہونے سے قبل تو تجھ میں کسی خواہش کا وجود نہ تھا کہیں اس عالم رنگ و بو کی فضا میں آتے ہی خواہشات نے تجھے گھیر لیا۔ لیکن جس طرح تو ابھی اپنی نقل و حرکت میں آزاد نہیں اسی طرح تیری خواہشات بھی ہاتھوں کی حرکت اور دیکھنے کے انداز میں پوشیدہ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جو چیز تجھے پسند آ جاتی ہے اسی کو ہتھیانے کی کوشش کرتا ہے کہ تیری خواہشات بھی تیری طرح نئی نئی وجود میں آئی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تیرا وجود ابھی ہر نوع کے اختلاف و امتیاز سے یکسر آزاد ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اب بھی قدرت کے بیشتر اسرار تجھ پر آشکار ہیں۔ ہر چند کہ تو ان کا اظہار اپنی زبان سے نہیں کر سکتا۔

⑧ سے (12) **معنی**: **آزاد غبار آرزو**: آرزو کی گرد سے آزاد۔ **نوزائیدہ**: جو نئی نئی پیدا ہوئی ہو۔ **قید امتیاز**: تمیز کی پابندی سے آزاد۔ **ہویدا**: ظاہر۔ **ہم آہنگ**: ہم نوا، ساتھی۔ **تلون آشنا**: جس کا مزاج ایک حالت پر قائم نہ رہے اور لحہ بہ لحہ بدلتا جائے۔

مطلب: اے بچے! جب بھی کسی چیز کے چھینے جانے کی بنا پر مجھ سے بگڑتا ہے اور غم و غصے کی حالت میں گریہ و زاری کے ساتھ چلانے لگتا ہے تو میں تجھے بہلانے کے لیے تیرے ہاتھ میں ردی کاغذ کا ایک ٹکڑا تھما دیتا ہوں۔ عجب تماشا یہ ہے کہ اس عمل سے ہی تو بہل کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اے عزیز تیری یہ عادت بالکل میری عادت سے ملتی جلتی ہے یعنی تیری طرح میں بھی تغیر پذیر فطرت کا حامل ہوں۔ میں بھی تو عارضی خوشی میں مست ہو جاتا ہوں اور صورت حال اس کے برعکس ہو تو چیخنے چلانے لگتا ہوں۔ میری بھی کیفیت یہی ہے کہ غصہ بھی جلد آ جاتا ہے اور اس کے بعد جلد ہی من جاتا ہوں۔ میری آنکھوں کو بھی ظاہری حسن پوری طرح مسحور کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری نادانیاں بھی تیری نادانی سے کسی طرح کم نہیں! میں بھی تیری مانند کبھی روتا ہوں تو کسی مرحلے پر ہنسنے اور قہقہے لگاتا ہوں اگر دیکھنے کو بے شک نوجوان ہوں لیکن عملی سطح پر تیری مانند طفل ناداں ہوں یعنی میری حالت بھی بالکل ننھے بچوں کی سی ہے۔

تصویر درد

034

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے' بے زبانی ہے زباں میری

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اٹھائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے' کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اڑا لی قمریوں نے' طوطیوں نے' عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں' حسرت بھری ہے داستاں میری

الہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا؟
حیات جاوداں میری' نہ مرگ ناگہاں میری

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں' خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

"دریں حسرت سرا عمریست افسون جرس دارم
زفیض دل طپیدنہا خروش بے نفس دارم"

ریاض دہر میں نا آشنائے بزم عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو' میں وہ محروم مسرت ہوں

مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی
میں حرف زیر لب' شرمندۂ گوش سماعت ہوں

پریشاں ہوں میں مشت خاک' لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گرد کدورت ہوں

یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں

خزینہ ہوں' چھپایا مجھ کو مشت خاک صحرا نے
کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں' کس کی دولت ہوں؟

نظر میری نہیں ممنون سیر عرصہ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں

نہ صہبا ہوں' نہ ساقی ہوں' نہ مستی ہوں' نہ پیمانہ
میں اس میخانہ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بام عرش کے طائر ہیں میرے ہمزبانوں میں

اثر یہ بھی ہے اک میرے جنون فتنہ ساماں کا
مرا آئینہ دل ہے قضا کے رازدانوں میں

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

سن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے' ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک؟ لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو' اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے' یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دل درد آشنا پیدا
چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

مجھے اے ہم نشیں! رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

جو ہے پردوں میں پنہاں، چشم بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گزاری عمر پستی میں مثال نقش پا تو نے

رہا دل بستۂ محفل، مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرون محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

تعصب چھوڑ ناداں، دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

سراپا نالۂ بیداد سوز زندگی ہو جا؟
سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے

صفائے دل کو کیا آرائش رنگ تعلق سے
کف آئینہ پر باندھی ہے او ناداں! حنا تو نے

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطر قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بت پندار کو اپنا خدا تو نے

کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل! جو مطلق تھا مقید کر دیا تو نے

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی

دکھا وہ حسن عالم سوز اپنی چشم پرنم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو، رلواتا ہے شبنم کو

ترا نظارہ ہی اے بوالہوس! مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشم آدم کو

اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگ گل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو

پھرا کرتے نہیں مجروح الفت فکر درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے!
ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے

دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا
علاج زخم ہے آزاد احساں رفو رہنا

شراب بیخودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکست رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا

تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثل حباب آبجو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی　　سکھایا اس نے مجھکو مست بے جام و سبو رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے　　کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے
بیابان محبت دشت غربت بھی' وطن بھی ہے　　یہ ویرانہ قفس بھی' آشیانہ بھی' چمن بھی ہے
محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے' صحرا بھی　　جرس بھی' کارواں بھی' راہبر بھی' راہزن بھی ہے
مرض کہتے ہیں سب اس کو' یہ ہے لیکن مرض ایسا　　چھپا جس میں علاج گردش چرخ کہن بھی ہے
جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا　　یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمع انجمن بھی ہے
وہی اک حسن ہے' لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں　　یہ شیریں بھی ہے گویا' بیستوں بھی' کوہکن بھی ہے
اجاڑا ہے تمیز ملت و آئیں نے قوموں کو　　مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے؟
سکوت آموز طول داستان درد ہے ورنہ　　زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے
سکوت آموز طول داستان درد ہے ورنہ　　زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے

"نمیگردید کوتہ رشتہ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں' بخاموشی ادا کردم"

*

انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں اقبال جو نظمیں پڑھتے رہے "تصویر درد" بھی انہی میں سے ایک نظم ہے۔ اس نظم میں انہوں نے عصری صورت حال کے حوالے سے اہل وطن کی بے حسی پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ اگر انہوں نے اپنی روش نہ بدلی تو تباہی ان کا مقدر بن جائے گی۔ لہٰذا ان کے لیے لازم ہے کہ اپنی بہتری کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کریں۔ فرماتے ہیں کہ

① سے ④　**معنی:** منت کش تاب شنیدن: کوئی سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ دستور زباں بندی: بات کرنے کا حکم نہیں۔

مطلب: مجھے اس امر کا شدید دکھ ہے کہ میں نے جو داستان بیان کی ہے اس پر کسی نے بھی توجہ نہیں دی۔ اس صورت حال کے سبب میں نے خاموشی اختیار کر لی ہے کہ بعض حالات میں اس نوع کی بے زبانی ہی زبان بن جاتی ہے۔ دوسرے شعر میں وہ قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ تیری بزم میں تو زباں بندی کا دستور اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اب یہاں میری زبان کسی سے بات کرنے کے لیے بھی ترس گئی ہے۔ اس کے باوجود میرے لیے یہ حقیقت بھی قدرے واضح ہے کہ میری داستان کے کچھ اوراق مختلف پھولوں یعنی افراد نے اٹھا لیے جب کہ یہ سارے چمن میں بکھرے پڑے تھے اس طرح کچھ لوگوں نے میرے طرز سخن اور افکار پر ڈاکہ ڈال دیا اور اس طرح میری متاع کو لوٹ لیا۔

⑤ سے ⑧　**مطلب:** اس مرحلے پر اقبال شمع سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں تو سراپا درد بن کر رہ گیا ہوں اور میری داستان میں اب حسرتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اے شمع! تو ہی میری غم گسار بن جا اور پروانے کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک جا۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح قوم کے درد میں میں آنسو بہاتا ہوں۔ تو بھی میرا ساتھ دے۔ اگلے شعر میں اقبال خدا سے کہتے ہیں کہ یہ بتا! میرے لیے تیری اس دنیا میں قیام کرنے کا کیا لطف ہے جب کہ میرا نہ زندگی پر اختیار ہے نا ہی موت پر! یعنی میں تو عملاً بے دست و پا

فرد ہوں اور یہ صرف میری اپنی فریاد ہی نہیں بلکہ سارے زمانے کی اجتماعی فریاد ہے۔ میں تو ایک ایسے پھول کے مانند ہوں جو پورے چمن کی خزاں اور بربادی کو اپنی خزاں تصور کرتا ہے۔ اس حسرت و مایوسی کی دنیا میں میری ذات تو ایک انتباہ کرنے والی گھنٹی کی طرح سے ہے اس لیے کہ جب تڑپتا ہوں تو اس کا اظہار بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے اشعار میں کرتا ہوں لیکن افسوس یہ ہے کہ انتباہ کے باوجود میری آہ و زاری پر کوئی کان نہیں دھرتا۔

⑨ سے (16) معنی: **حرفِ زیرِ لب:** آہستہ بات جو سنائی نہ دے سکے۔ **شرمندۂ گوشِ سماعت:** جو بات کان تک نہ پہنچے۔ **سیرِ عرصۂ ہستی:** زندگی کے میدان کی سیر۔ **صہبا:** شراب۔

مطلب: میں تو باغِ دنیا میں ایک ایسی شخصیت ہوں جو مسرت و خوشی سے یکسر محروم ہوں۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جن پر مسرت اور خوشی بھی آنسو بہاتی ہے۔ میری تقدیر تو اس قدر بگڑ چکی ہے جس کی کیفیت کا اظہار بھی انتہائی الم انگیز ہے۔ میری آواز تو ہونٹوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور ہر کوئی اس کو سننے سے قاصر ہے۔ میں بظاہر ایک مشتِ خاک کی مانند ہوں جب کہ آج تک مجھ پر اس امر کا انکشاف نہیں ہو سکا کہ نصف دنیا کو فتح کرنے والے سکندر کی مانند ہوں یا جمشید کا وہ پیالہ جس میں وہ ساری دنیا کے مناظر دیکھ لیتا تھا یا پھر غبار کے مانند بے حقیقت شے ہوں۔ مراد یہ کہ اس دارِ فانی میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے باوجود خود کو شناخت نہیں کر سکا۔ ان ساری کیفیتوں کے باوجود اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ میرے وجود کو برقرار رکھنا قدرت کے بنیادی مقاصد کا حصہ ہے اور اسی سبب میں خود کو ایک ایسی ظلمت سے تعبیر کر سکتا ہوں جو عملی سطح پر سراپا نور کی حیثیت رکھتی ہو۔ دراصل میں ایک ایسے خزانے کی طرح ہوں جو کسی صحرا کی خاک میں چھپا ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ میری حقیقت کیا ہے اور میں کس کی متاع ہوں؟ ایسی صورت میں مجھ سے کون استفادہ کر سکے گا۔ میری نظر کو کیا غرض پڑی ہے کہ زندگی کے ساتھ پوری کائنات پر نظر رکھے جب کہ میری ذات تو بذاتِ خود ایک چھوٹی سی دنیا کے مانند ہے اور یہ چھوٹی سی دنیا میں میری اپنی سلطنت کی طرح سے ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں نہ تو شراب ہوں نہ ساقی نہ ہی مستی اور نہ ہی پیمانہ ہوں۔ اس کے برعکس یہ زندگی کا جو میخانہ ہے اس میں موجود ہر چیز کی حقیقت کا مظہر ہوں۔ مراد یہ ہے کہ اس پورے نظامِ کائنات میں باری تعالیٰ نے انسان کو مختارِ کل بنا کر بھیجا ہے۔ اس کے بغیر تو زندگی نامکمل اور ناکارہ شے ہے۔

میرا دل تو ایک ایسے آئینے کی مانند ہے جس میں دونوں جہانوں کے رازہائے سربستہ واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں اپنے اشعار میں ان حقائق کو سامنے لاتا ہوں۔ جو عملی سطح پر میرے مشاہدے میں آتے ہیں۔

(17 سے 20) معنی: **جنونِ فتنہ ساماں:** وہ جنون جو فتنہ اٹھائے۔ **رزم آرائیاں:** لڑائیوں کے لیے صفیں باندھنا۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جو لوگ بڑے رنگین بیاں تھے فطرت نے مجھے ان میں سب سے علی حدہ ایسی طرزِ بیاں عطا کی ہے کہ آسمانوں پر جو خوش الحان فرشتے ہیں وہ بھی میرے ہمنوا بن گئے ہیں۔ مجھ میں جو عشق کا جذبہ موجود ہے اس کے سبب میں اپنی شعری تخلیقات میں قضا و قدر کے تمام سربستہ راز پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ اس شعر میں اقبال اپنے عہد کے ہندوستان کا نقشہ کھینچتے ہوئے بڑے افسردہ

لہجے میں کہتے ہیں کہ تیری افسوسناک صورت حال پر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے اس لیے کہ دنیا کے دوسرے افسانوں میں تیرا افسانہ سب سے زیادہ عبرت انگیز دکھائی دیتا ہے۔ تیری حالت پر میں جو افسردہ ہوں تو یوں لگتا ہے کہ قدرت نے میرا نام تیرے نوحہ خوانوں میں شامل کر دیا ہے۔

(21 سے 24) **مطلب**: یہاں اقبال بڑے دکھ کے ساتھ پھول توڑنے والے یعنی دشمن سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب باغ کے مالی اور رکھوالے ہی آپس میں دست و گریباں ہوں تو اس باغ کو برباد کرنے کے عمل میں تجھے کونسی قباحت محسوس ہو گی۔ یوں بھی آسمان نے اپنے دامن میں بجلیاں چھپا کر رکھی ہیں۔ اس صورت میں اہل چمن کو انہوں نے انتباہ کیا ہے کہ اسی مرحلے پر اگر تم نے غفلت سے کام لیا تو نتیجہ بربادی کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔ میری آواز کو غور سے سنو! کہ یہ ایسی چیز ہے جس کو غیر وظیفہ جان کر سنتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ دوسرے تو میری بات کا بے حد احترام کرتے ہیں جب کہ تم اہل وطن اس سے غفلت برت رہے ہو۔ اے میرے عزیز! تو کتنا نادان ہے کہ اپنے وطن کے تحفظ کا خیال نہیں کرتا جب کہ آسمانوں پر تیری بربادیوں کے مشورے جاری ہیں۔

(25 سے 29) **معنی**: **اسلوب فطرت**: قدرت کا دستور۔ **ہویدا**: ظاہر۔ **مشت خاک**: مٹھی بھر خاک۔ **شغل سینہ کاوی**: تڑپنے میں مشغول۔

مطلب: ذرا اس منظر کا جائزہ لے کہ اب تک یہاں کیا ہو چکا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ تو ماضی کی داستانوں میں گھرا ہوا ہے۔ حالانکہ عصر نو میں ان داستانوں کی اہمیت ہی ختم ہو چکی ہے۔ بتا کہ تو اس طرح کب تک خاموش رہے گا۔ اپنی آواز اس طرح بلند کر کہ تیری صدا زمیں سے آسمان تک رسائی حاصل کر لے۔ زیر تشریح اشعار میں اقبال اہل ہند سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میرے انتباہ کے باوجود اب بھی تم بیدار نہ ہوئے اور اپنے معاملات کو نمٹانے کے لیے جدوجہد کا آغاز نہ کیا تو جان لو کہ ماضی اور حال سے متعلق داستانوں میں تمہاری داستان کا ذکر تک نہ ہو گا کہ قدرت کا نظام بھی یہی ہے اور فطرت کے اصول بھی اسی طرح کے ہیں کہ جو راہ عمل پر گامزن رہتا ہے خدا اسے ہی محبوب رکھتا ہے۔

(29 سے 32) **معنی**: **مثال نقش پا**: پاؤں کے نشان کی طرح یعنی پست۔ **دل بستہ محفل**: محفل کا شیدائی۔ **سپند آسا**: حرمل کے دانے کی طرح۔ **چلیپا**: صلیب۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال انتہائی رنج و الم مگر جوش اور جذبے کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ آج اپنے چھپے ہوئے زخموں کو نمایاں ہی کر کے چھوڑوں گا۔ میری آنکھوں سے لہو بہے گا جو پورے باغ وطن میں پھیل جائے گا۔ میرے دل میں جو درد چھپا ہے اس کی آنچ ہر دل کی شمع کو روشن کر دوں گا۔ اور اسی شمع سے میں اے وطن تیری تاریک راتوں کو جگمگا دوں گا۔ میں تو اپنی جان بھی قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوں بشرطیکہ تیرے باسیوں کے سینوں میں دل درد آشنا پیدا ہو جائے۔ میرے اہل وطن نفاق اور نفرت کی آگ میں جل رہے ہیں۔ میں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہوں تاہم خود پر اتنا اعتماد بھی ہے کہ اگر یہ کام مشکل ہے تو اس کو آسان بھی کر دوں گا۔

(33 سے 35) **معنی**: **مطلق تھا**: پوری طرح آزاد۔ **بوالہوس**: ہوس میں الجھا ہوا۔ **ریاض**: باغ۔

مطلب: اے میرے ہم نشیں! مجھے اپنے سینے کو کھرچنے کے عمل میں ہی مصروف رہنے دے کہ اس طرح میں ان داغوں کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں جو فی الواقع محبت کے داغ ہیں۔ میری نگاہ حقیقت بیں نے اب تک جو منظر دیکھے ہیں ساری دنیا کو ان کا نظارہ کرا دوں گا۔ تاکہ وہ نفاق اور نفرتوں کو چھوڑ کر اتحاد و یگانگت سے بہرہ ور ہو سکے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمام احساسات اپنی تخلیقات کے ذریعے لوگوں تک پہنچا دوں گا۔ مجھے اس امر پر مکمل اعتماد ہے کہ جب لوگ میرے مشاہدات' تجربات اور احساسات سے واقف ہوں گے تو دم بخود ہو کر رہ جائیں گے۔

اس بند کے آخری شعر میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ ہر نگاہ حقیقت بیں کی ان مناظر تک رسائی ہو جاتی ہے جو ابھی تک پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایسی حقیقت شناس نظریں اپنے عہد کے تقاضوں کو بھی پوری طرح پہچان لیتی ہیں۔

(36 سے 40) **معنی:** آزاد احسان رفو: زخم سلوانے کا احسان نہ لینا۔ **امتیاز ما و تو:** ایک دوسرے میں فرق۔ **استغنا:** بے پروائی۔

مطلب: اس پورے بند میں اقبال اس عالم بے عمل سے براہ راست مخاطب ہیں جو مذہب کا اجارہ دار بنا ہوا ہے۔ بعض شارحین نے زیر تشریح اشعار کو وطن کے حوالے سے دیکھا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان کا مخاطب مذہب کا اجارہ دار وہ بر خود تسلط ملا ہی ہے جس نے معمولی اختلافات کو ہوا دے کر دلوں میں نفرتوں کے بیج بو دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تو نے کسی مرحلے پر بھی وسعت قلبی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نا ہی تیری نگاہوں میں وہ رفعت پیدا ہوئی جو فرد کو فرشتے سے بھی افضل بنا دیتی ہے اس کے برعکس تو نے تو تمام عمر نفاق اور نفرت کی پستیوں میں گذار دی۔ ہر چند کہ تیرے دم سے محفلوں میں دل بستگی کا سامان تو پیدا ہوا لیکن تو اس قدر داخلیت پسند تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ محفلوں سے باہر بھی تو بہت کچھ ہے۔ تو دوسروں کی خوبصورتیوں اور اداؤں پر قربان تو ہوتا رہا لیکن تیرے اندر اگر کوئی خوبصورتی چھپی ہوئی تھی اس کی جانب کوئی توجہ نہ کی۔ خدا کے اپنے متعصبانہ نقطہ نظر سے گریز کر کہ تو جن چیزوں کو برا سمجھ رہا ہے وہ تو اس دنیا کی زندہ حقیقت ہیں۔ وطن اور اہل وطن پر جو ظلم و ستم ہو رہے ہیں ان کے خلاف تو تجھے سراپا احتجاج بن جانا چاہیے تھا لیکن تو نے تو اس صورت حال کے خلاف اپنی زبان اس طرح بند کر رکھی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مراد یہ ہے کہ غیر ضروری اور نفاق انگیز باتوں پر تو تو چیخ اٹھتا ہے لیکن جن باتوں پر احتجاج کرنا چاہیے ان پر اپنی زبان بند رکھتا ہے اور احتجاج کی جراءت نہیں کرتا۔

(41 سے 45) **معنی:** **بخت خفتہ:** سوئی ہوئی قسمت۔ **وشت غربت:** بے وطنی کا صحرا۔

مطلب: اگر دل و ضمیر صاف ہوں تو ان کے بارے میں کسی قسم کی رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن تو نے تو اے عالم بے عمل آئینے کی شفاف سطح پر بھی مہندی لگا کر اسے رنگنے کی کوشش کی ہے۔ تو اس قدر کج بیں ہے کہ زمین ہی نہیں بلکہ آسمان بھی تیرے اس رویے کے خلاف مضطرب اور مضمحل ہے کہ تو نے تو قرآن کی آیات کو بھی اپنے زیر مفاد غلط معنی پہنا دیئے ہیں۔ اپنی زبان سے تو تو خدا کی وحدانیت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن عملی سطح پر اپنے مفاد کے تحت کئی بت پال رکھے ہیں۔ اے عالم بے عمل تو نے حضرت یوسف کی حقیقت بیان کرتے ہوئے حدود و قیود سے آزاد چیزوں کو حدود و قیود کا پابند بنا کر رکھ

دیا ہے۔ تیرا مقصود تو محض یہی ہے کہ منبر پر اپنی رنگین بیانی کے جوہر دکھائے۔ حد تو یہ ہے کہ تو جو نصیحتیں کرتا ہے وہ محض افسانہ خوانی سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتیں۔

(46 سے 52) **مطلب**: ان اشعار میں اقبال اپنے عہد کے عالم بے عمل کو مشورہ دیتے ہیں کہ اپنی نمناک آنکھوں کو اس حسن سے آشنا کر جو پروانے کے دل میں اضطراب و تڑپ پیدا کرتا ہے اور جس کے سبب شبنم کو اشک آلودہ ہونا پڑتا ہے۔ تو جس انداز سے کائنات کے معاملات کو دیکھتا ہے وہ قدرت کے مقاصد کی نفی کا حامل ہے حالانکہ خدائے عز و جل نے بالاخر سوچ سمجھ کر انسان کی آنکھوں کو بنایا ہے۔ جمشید نے بے شک جو پیالہ تیار کیا تھا اس کے ذریعے وہ پوری دنیا کے مناظر کو دیکھتا رہا اس کے باوجود وہ حقائق کا نظارہ کرنے سے محروم ہی رہا۔ سو اس عمل سے کچھ فائدہ نہ تھا۔ سن لے کہ فرقہ آرائی ایک ایسے درخت کے مانند ہے جس کا پھل تعصب کے سوا اور کچھ نہیں! مراد یہ ہے کہ فرقہ بندی سے معاشرے کو توڑ پھوڑ اور منافرت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تفرقہ بازی کے سبب ہی یہ صورت بنی کہ حضرت آدمؑ جنت سے نکالے گئے۔ اقبال اس شعر میں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ فرشتوں اور آدم کے مابین نفرت کی جو فضا پیدا ہوئی اس کے ردعمل کے طور پر آدم جنت سے نکالے گئے۔ اقبال اگلے شعر میں کہتے ہیں کہ سورج اتنی بلندی پر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے اس کے باوجود وہ ایک پھول کی پتی کو بھی زمین سے اوپر اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس یہ شبنم ہے جو اڑ کر بلند فضاؤں سے جا ملتی ہے اس لیے کہ وہ بلند فطرت کی مالک ہے۔ مزید یہ کہ اہل محبت کو اپنے زخم بھرنے کی قطعی پروا نہیں ہوتی کہ یہ لوگ تو خود ہی اپنے زخموں کے لیے مرہم پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کو کسی بھی دوسرے معالج اور دوا کی حاجت نہیں ہوا کرتی۔ یہ محبت کا شعلہ ہی ہے جو عملی سطح پر نور مطلق کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محبت ہے جو ایک معمولی بیج کے طور پر اس امر کی اہل ہے جو طور کے باغات کی تخلیق کرے۔ اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ محبت کے جذبے کی بنیاد پر قلب انسانی عملی طور پر باری تعالٰی کے نور سے منور ہو جاتا ہے۔

(53 سے 61) **معنی**: داستان درد: درد بھری داستاں۔ رشتہ معنی: مدعا کا رشتہ۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال عہد کی صورت حال کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی دکھ ہیں ان کا ازالہ محبت کے جذبے سے ہی ممکن ہے کہ کسی زخم کا حتمی علاج اس کو سلوانے میں نہیں بلکہ مرہم کے ذریعے ہوتا ہے۔ اور انسانی دکھوں کے زخم کا بہترین علاج محبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ میرے تخیل کی پرواز جو آسمان تک ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے پھولوں کی ماہیت سے کچھ نتائج اخذ کیے ہیں۔ بے شک پھولوں کا رنگ تو کسی نہ کسی مرحلے پر اڑ جاتا ہے تاہم ان میں جو خوشبو ہوتی ہے وہ فضاؤں کو اکثر و بیشتر معطر کرتی رہتی ہے۔ میں جو وطن اور اہل وطن کی بے حسی اور بے عملی پر ہر دم گریہ کناں رہتا ہوں وہ ایک فطری امر ہے اس لیے کہ میرے لیے ہی نہیں بلکہ ہر شاعر کے لیے یہ عمل عبادت سے کم نہیں کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے اس صورت حال کا چرچا کرے۔

اس سارے پس منظر میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب وطن اور اہل وطن کی بے عملی اپنے انتہائی عروج پر ہو تو ایک باشعور اور غیرت مند تخلیق کار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جہاں عزت و آبرو کا تصور ہی مفقود ہو کر رہ جائے وہاں بود و باش اختیار کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ آزادی کے حصول کے لیے محبت بنیادی جذبہ ہے اس کے برعکس جہاں تک نفرت کا تعلق ہے وہ تو اسے

غلامی سے ہمکنار کرتی ہے۔
یہ بے نیازی کا طور ہی ہے جو پیالے کو پانی میں ڈبوئے رکھتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی ندی میں پانی کے بلبلے اوپر نیچے حرکت کرتے رہتے ہیں لیکن ڈوبتے نہیں تیرے لیے بھی لازم ہے کہ شان بے نیازی اختیار کر لے۔ تو نے تو نفرتوں اور افتراق کے ذریعے خود کو دوسروں سے الگ تھلگ کر رکھا ہے۔ تاہم دنیا میں رہنا ہے تو یہ انداز ترک کر دے اور سب سے مل کر رہ۔ اس لیے کہ محبت و یگانگت کے طفیل ہی نوع انساں خوش حال اور مطمئن رہ سکتی ہے۔ میں جو شراب کے بغیر ہی مست و مخمور رہتا ہوں تو اس کا سبب محبت ہے۔ محبت ہی فی الواقع ایسا جذبہ ہے جس کے سبب ذہنی اور نفسیاتی سطح پر بیمار قومیں شفا پاتی ہیں۔ اور اسی کے سبب ان میں بیداری کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ یہاں اقبال کی مراد یہی ہے کہ نفرت اور افتراق قوموں کو تباہی کے اندھیرے میں دھکیل دیتے ہیں۔ یہ محبت ہی ہے جو انہیں دنیا میں کامیاب و کامران کرتی ہے۔

(62سے69)

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ محبت ہی اس عالم رنگ و بو میں سب کچھ ہے اور اسی سے یہ کائنات قائم ہے۔ یہ درست ہے کہ محبت کسی مرحلے پر صحرا اور ویرانے کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے اور کہیں وطن بھی اس کا مظہر بن جاتا ہے۔ کہیں قفس، کہیں ویرانہ، کہیں آشیانہ اور کسی مرحلے پر چمن کا روپ محبت ہی دھار لیتی ہے۔ محبت ہی وہ جذبہ ہے کہ جو منزل اور کہیں صحرا، کہیں اہل کارواں کے لیے آواز جرس کی مانند تو کہیں رہبری بھی کرتی ہے اور کبھی راہزنی بھی۔
یوں تو سب لوگ محبت کو ایک مرض سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ ایسا مرض ہے جس میں کائنات کے جملہ امراض کا علاج پوشیدہ ہے۔ اس جذبے سے جب دل جلتا ہے تو سراپا نور میں ڈھل جاتا ہے اس لیے کہ یہ ایسا پروانہ ہے جو جل کر شمع محفل کی تقویت کا سبب بنتا ہے۔
محب تو ایسا حسن ہے جو ہر شے میں نظر آتا ہے۔ دیکھا جائے تو شیریں، کوہ بیتوں اور فرہاد میں بڑا فرق ہے تاہم محبت کے جذبے نے ہی انہی ایک دوسرے سے منسلک کر رکھا ہے۔ نفرت و افتراق نے ہی قوموں کی بربادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن میرے اہل وطن اس حقیقت سے بے خبر نظر آتے ہیں۔ انہیں وطن کی کوئی فکر نہیں۔ یہ داستان درد اور بھی طویل ہو سکتی تھی کہ میرے تخیل میں بڑی وسعت ہے۔ نظم کو وہ نظیری کے فارسی شعر پر ختم کرتے ہیں کہ مضمون کا سلسلہ مختصر نہ ہوتا تھا اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ یہ ایسا بیان تھا جو لامحدود تھا۔ لہذا اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ خاموشی اختیار کر لوں۔

نالہ فراق

035

(آرنلڈ کی یاد میں)

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

آ گیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں — ظلمت شب سے ضیائے روز فرقت کم نہیں

"تا ز آغوش وداعش داغ حیرت چیدہ است
ہمچو شمع کشتہ در چشم نگہ خوابیدہ است"

کشتہ عزلت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں — شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں
یاد ایام سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں — بہر تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں

آنکھ گو مانوس ہے تیرے در و دیوار سے
اجنبیت ہے مگر پیدا مری رفتار سے

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا — آئنہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا — آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

ابر رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت
اند کے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم — تھی تری موج نفس باد نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم — تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

شور لیلیٰ کو کہ باز آرائش سودا کند
خاک مجنوں را غبار خاطر صحرا کند

کھول دے گا دست وحشت عقدۂ تقدیر کو — توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو — کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو؟

"تاب گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا"

*

پانچ بند پر مشتمل یہ نظم اقبال اپنے استاد پروفیسر ٹامس آرنلڈ کی یاد میں اس وقت لکھی جب وہ 1904ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت ترک کر کے واپس انگلستان چلے گئے۔ وہ 1897ء سے اس کالج میں فلسفے کے استاد تھے۔ لاہور آنے سے قبل پروفیسر ٹامس آرنلڈ علیگڑھ کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے۔ جہاں بے شمار طلباء کے علاوہ علامہ شبلی نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ واضح رہے کہ علامہ شبلی بھی بحیثیت استاد اس کالج سے وابستہ تھے۔

پہلا بند **معنی**: چیدہ است: چنے ہیں۔ **شمع کشتہ**: بجھی ہوئی شمع۔

مطلب: نظم کے پہلے بند میں اقبال لاہور میں پروفیسر آرنلڈ کی قیام گاہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ تیرا مکیں بالآخر مغرب میں جا بسا۔ افسوس یہ ہے کہ اس کو مشرق کی یہ سرزمین پسند نہ آئی۔ استاد کی جدائی میں آج مجھے اس صداقت پر پوری طرح سے یقین آ گیا ہے کہ بچھڑنے کے لمحات، رات کی تاریکی سے کسی طور پر بھی کم نہیں ہوتے۔ یعنی جس طرح رات کی تاریکی میں انسان کو کچھ دکھائی نہیں دیتا اسی طرح کسی سے جدائی کے لمحات میں بھی دل و دماغ مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس بند کے تیسرے شعر سے مراد یہ ہے کہ اپنے عزیز استاد آرنلڈ کی جدائی کے صدمے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری بینائی

رخصت ہو گئی۔

دوسرا بند معنی: یاد ایام سلف: گذرے ہوئے دنوں کی یاد۔

مطلب: دوسرے بند میں فرماتے ہیں کہ میں تو پہلے ہی تنہائی کا مارا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ آبادی سے گھبراتا رہا ہوں۔ گذرے ہوئے دنوں کی یاد سے دل کو تڑپاتا رہتا ہوں۔ اور جب کہیں بھی سکون نہیں ملتا تو اے استاد کی قیامگاہ تیری جانب دوڑتا ہوا آجاتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ تیرے در و دیوار سے میری آنکھیں مانوس ہیں اس کے باوجود تیرے مکین کی عدم موجودگی میں یہاں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

تیسرا بند معنی: خورشید آشنا: سورج سے فیض پانے والا۔ عالم نما: جس میں سارا جہان نظر آئے۔

مطلب: اقبال تیسرے بند میں کہتے ہیں کہ اپنے استاد کی شفقت اور فیضان محبت سے میں ذرۂ ناچیز آفتاب کی مانند تابانی سے ہمکنار ہونے والا تھا۔ مرا دل لاکھ ٹوٹے ہوئے آئینے کے مانند ہے اس کے باوجود اس امر کا قطعی امکان تھا کہ استاد کی تربیت کے طفیل اس شکستہ آئینے میں ساری دنیا کا نظارہ کر سکوں۔ اس امر کی توقع بھی تھی کہ میری آرزوؤں اور خواہشات کی تکمیل ہو جائے۔ کون جانے کہ میں آئندہ ترقی کر کے کیا سے کیا ہونے والا تھا۔ تیسرے فارسی شعر سے مراد یہ ہے کہ بقول اقبال میں نے ابھی اپنے عظیم استاد سے بہت کچھ سیکھنا تھا کہ وہ داغ مفارقت دے گئے۔

چوتھا بند معنی: ذروہ: کنگرہ یعنی چوٹی 'بلندی۔ باد نشاط افزائے: خوشی بڑھانے والی ہوا۔

مطلب: چوتھے اور پانچویں بند کے اشعار میں اقبال آرنلڈ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ علم کو اگر کوہ طور سمجھ لیا جائے تو ذات بھی علم و حکمت کے کلیم کے مانند ہے۔ تیری گفتگو سے میرے علم اور مسرت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ تیرے بغیر تو جیسے حصول علم کا شوق ہی ناپید ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے کہ تیری موجودگی کے طفیل ہی میرے سر میں حصول علم کا جنون تھا لیکن تیرے جانے کے بعد تو یہ جنون جیسے ختم ہو گیا۔ اب وہ فضا ہی نہ رہی جس سے علم و حکمت کا چرچا تھا۔ اے محترم استاد تو نہیں تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔

پانچواں بند مطلب: اس بند میں علامہ اپنے عزم اور خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک روز یقیناً ایسا آئے گا جب میں حسب خواہش پنجاب کو چھوڑ کر' اے عظیم استاد پھر تیرے سایہ التفات تک رسائی حاصل کر سکوں گا۔ میری نگاہیں تو یہاں بھی تیری تصویر کو بغور دیکھتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ اطمینان حاصل نہیں ہوتا جو تیری تصویر اور گفتگو سے حاصل ہوتا تھا۔ میں اس امر کا ادراک تو رکھتا ہوں کہ تصویر قوت گویائی سے محروم ہوتی ہے بالفاظ دگر یہ خامشی ہی عملی سطح پر کسی تصویر کی گفتگو ہوتی ہے۔

چاند

036

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن ہے مگر دریائے دل' تیری کشش سے موجزن

قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو — زرد رو شاید ہوا رنجِ رہ منزل سے تو
آفرینش میں سراپا نور تو، ظلمت ہوں میں — اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں
آہ! میں جلتا ہوں سوز اشتیاق دید سے — تو سراپا سوز داغِ منت خورشید سے
ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے — میری گردش بھی مثال گردش پرکار ہے
زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو، حیراں ہوں میں — تو فروزاں محفل ہستی میں ہے، سوزاں ہوں میں
میں رہ منزل میں ہوں، تو بھی رہ منزل میں ہے — تیری محفل میں جو خاموشی ہے، میرے دل میں ہے
تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے — چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا نور ہے
انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں — بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو، تنہا ہوں میں
مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغام اجل — محو کر دیتا ہے مجھکو جلوۂ حسن ازل
پھر بھی اے ماہ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے — درد جس پہلو سے اٹھتا ہو وہ پہلو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو — سینکڑوں منزل ہے ذوق آگہی سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے، جبیں جس سے تری محروم ہے

*

① سے ④ **معنی:** موجزن: لہریں لے رہا ہے۔ **رنج رہ منزل:** لمبے سفر کی زحمت۔ **آفرینش:** پیدائش کے لحاظ سے۔ **سیہ روزی:** بدنصیبی۔

مطلب: اس نظم میں اقبال چاند سے یوں مکالمہ کرتے ہیں کہ اے **چاند!** ہر چند کہ تیری آماجگاہ میرے وطن سے بہت دور ہے اس کے باوجود میرے دل میں ہر لمحے تیری کشش موجزن رہتی ہے۔ ذرا مجھے اتنا بتا دے کہ تو کس مقام سے آتا ہے اور وہ کون سی جگہ ہے جہاں جا کر قیام کرے گا۔ تیرے چہرے پر جو زردی پھیلی ہوئی ہے یوں لگتا ہے کہ زیادہ مسافت طے کرنے کے ضمن میں اس کی تھکن سے تیرا چہرہ زرد ہو کر رہ گیا ہے۔ تخلیقی سطح پر بے شک تیرا وجود سراپا نور ہے اس کے برعکس میری ذات اندھیرے کے مانند ہے لیکن جہاں تک بدبختی کا تعلق ہے ہم دونوں میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے کہ دونوں کے مقدر میں جلنے کے سوا اور کیا ہے۔ میں اپنے محبوب کے ہجر میں اور تو اس لیے کبیدہ خاطر رہتا ہے کہ روشنی حاصل کرنے کے لیے تجھے سورج کا شرمندۂ احسان بننا پڑتا ہے۔

⑤ سے ⑦ **معنی:** گردش پرکار: ایک ہی دائرہ میں گھومنا۔

مطلب: بے شک اے **چاند!** یہ درست ہے کہ جس طرح تیرا سفر ایک دائرے کی طرح محدود ہے تو میری حرکت بھی پرکار کے مانند ہے کہ ایک مقام سے چل کر ادھر ادھر گھومنے کے بعد پھر اسی مقام پر واپس آ جاتا ہوں۔ تو اگر اس کائنات میں سرگرداں ہے تو میں بھی حیرتوں میں ڈوبا ہوا ہوں۔ یہ درست ہے کہ تو اس کائنات میں روشن رہتا ہے جب کہ میں بھی آتش عشق سے جلتا رہتا ہوں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ طویل مسافتوں کے باوجود تو بھی راستے میں سرگرداں ہے اور یہی کیفیت میری بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ تو اس صورت حال پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔

⑧ سے ⑩ **معنی:** مہر کا پرتو: سورج کی روشنی۔ **ماہ مبیں:** روشن چاند۔

مطلب: اے چاند! جان لے کہ اگر تو کسی کو چاہتا ہے تو خود میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اگر روشنی تیرا نور ہے تو میرا عشق بھی نور کے مانند ہے۔ میں جس دنیا میں رہائش پذیر ہوں وہاں میرے گرد و پیش انجمن آرائی کے لیے ہزارہا انسان موجود ہیں۔ مگر بے شمار ستاروں میں گھرا ہونے کے باوجود جس طرح تو بھی خود کو تنہا اور بے مثال محسوس کرتا ہے کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی ہے۔ آفتاب کا طلوع ہونا جس طرح تیرے لیے موت کی مانند ہے اسی طرح خالق کائنات کا جلوہ مجھے اپنے وجود سے غافل کر دیتا ہے۔

(11)

مطلب: اے چاند! تجھ میں اور مجھ میں اگرچہ بہت سی باتیں اور خصوصیات مشترک حیثیت کی حامل ہیں۔ اس کے باوجود عملی سطح پر تو کچھ اور شے ہے میں کچھ اور شے ہوں۔ یعنی تجھ میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے کہ جو پہلو درد کا حامل ہو اس سے تو واقف نہیں جب کہ میں پوری طرح آشنا ہوں اور یہ بھی جان لے کہ بے شک میں سراپا تاریکی کے مانند ہوں اور تیرا وجود نور اور روشنی کا حامل ہے۔ اس کے باوجود یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ تو اپنی حقیقت سے بیگانہ ہے جب کہ میں اس کا پورا پورا شعور رکھتا ہوں۔ مراد یہ کہ تو اپنی شناخت سے بیگانہ ہے جب کہ میں اپنے وجود سے مکمل آگاہی رکھتا ہوں۔ میں تجھ پر یوں بھی فضیلت رکھتا ہوں کہ مجھے اپنی تخلیق کے مقصد کا پوری طرح سے علم ہے۔ میری انفرادیت یہی ہے جس سے تجھے محروم رکھا گیا ہے۔

بلالؓ

037

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا   حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی   تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے   کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

نظر تھی صورت سلمانؓ ادا شناس تری   شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثل کلیمؑ سودا تھا   اویسؓ طاقت دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا   ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرت دید   خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید
گری وہ برق تری جان ناشکیبا پر   کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دست موسیٰؑ پر

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دل تو زدند
چہ برق جلوہ بخاشاک حاصل تو زدند

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری   کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

*

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ بلال حبشیؓ کا شمار حضور سرور کائناتؐ کے ممتاز صحابیوں میں ہوتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ مسجد نبویؐ میں باقاعدہ طور پر اذان دیا کرتے تھے۔ تاریخی سطح پر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بڑے خوش الحان تھے۔ علامہ اقبال نے یہ نظم ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر کہی ہے۔ پوری نظم تین بند پر مشتمل ہے۔ جس میں تیرا اشعار ہیں۔

پہلا بند معنی: آستاں: چوکھٹ۔

مطلب: اس نظم میں اقبال صحابی رسولؐ مقبول حضرت بلال حبشیؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ تیرے مقدر کا ستارہ ہی چمک اٹھا تھا کہ تو حضورؐ کی دید اور خدمت کے لیے حبشہ سے حجاز میں آ بسا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت بلال سیہ فام حبشی ہونے کے باوجود اس قدر خوش الحان تھے کہ سرور کائناتؐ نے انہیں مسجد نبویؐ میں اذان دینے کی خدمت پر مامور کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ اے بلالؓ حبشی تو جو اپنے وطن میں بے کیف زندگی گذار رہا تھا حضورؐ کی غلامی میں پہنچ کر اس سعادت کا اہل ہوا کہ اس غلام پر ہزار آزادیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ پیغمبرؐ اسلام پر اعدائے دیں کی یلغار اور تجھ پر ظلم و ستم کے باوجود تو نے حضورؐ کے آستانے کو تا زندگی ایک لمحے کے لیے نہیں چھوڑا۔ اس لیے کہ تو اس رمز سے آگاہی حاصل کر چکا تھا جو محبوب کے عشق میں غیروں کی جو جفائیں برداشت کرنی پڑتی ہیں وہ اہل دل کے لیے جفا نہیں ہوتیں اس لیے کہ ان کے بغیر محبت میں کچھ لطف حاصل نہیں ہوتا۔

دوسرا بند معنی: سلمانؓ: عاشق رسولؐ۔ مثل کلیمؑ سودا: حضرت موسیؑ کی طرح جنون۔ اویسؓ: عاشق رسولؐ۔ جان ناشکیبا: بے صبر جان۔

مطلب: اے بلالؓ حبشی! امر واقع یہ ہے کہ صحابی رسولؐ حضرت سلمان فارسیؓ کی طرح تیری نظر بھی ادا شناس تھی اور حضورؐ کی عظمتوں سے پوری طرح سے آگاہی رکھتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ پیغمبرؐ اسلام کی قربت میں تیرا جذبہ وارفتگی مزید فروغ پاتا تھا۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ کو دیدار خداوندی کا جنون تھا اور حضرت اویس قرنیؓ جس طرح نبی اکرمؐ کی زیارت کے لیے ترستے رہے اسی طرح تو نے مدینے کو محض اس لیے نور حقیقت تصور کر لیا تھا مزید یہ کہ اس صحرا کو کوہ طور کی مانند سمجھ لیا تھا کہ حضور سرور کائناتؐ اس شہر بے مثال میں اقامت پذیر تھے۔ تجھے بیشک حضورؐ کا دیدار حاصل رہا اس کے باوجود تیرا ذوق دید تشنگی محسوس کرتا رہا۔ بے شک وہ دل خوش قسمت ہے جو ہمیشہ عشق رسول مقبولؐ میں تڑپتا رہا۔ عشق رسولؐ نے تیری شخصیت کو اس طرح منور کر دیا تھا کہ تیرا سیاہ رنگ حضرت موسیٰؑ کے ید بیضا پر خندہ زن رہا۔ تیرا دل شعلے کی مانند تھا اور عشق رسولؐ نے تجھ وہ سوز عطا کیا جو تیرا سرمایہ حیات بن گیا۔

تیسرا بند معنی: یثرب: مدینہ کی ایک بستی کا نام (مراد مدینہ)۔

مطلب: حضور اکرمؐ کے روئے مبارک کی زیارت تیرے لیے سراسر عجز و انکساری کے جذبے پر مبنی تھا

اور دیکھا جائے تو تیرے لیے یہ عمل سراسر نماز اور سجدۂ خداوندی سے کم نہ تھا۔ تیری اذان محض اذان نہ تھی بلکہ اسے عشق محبوب کے لیے ترانے سے تشبیہ دی جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ اے بلال حبشیؓ! نماز تو حضورؐ کی زیارت کا بہانہ تھی کہ وہ لمحات کتنے باعث رحمت تھے جب حضورؐ یثرب میں مقیم تھے اور عام لوگ ان کی زیارت سے استفادہ کرتے تھے۔

سرگزشت آدم

038

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصہ پیمان اولیں میں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاض جنت میں
پیا شعور کا جب جام آتشیں میں نے

رہی حقیقت عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوج خیال فلک نشیں میں نے

ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیر فلک کہیں میں نے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کبھی میں ذوق تکلم میں طور پر پہنچا
چھپایا نور ازل زیر آستیں میں نے

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی میں غار حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جام آخریں میں نے

سنایا ہند میں آ کر سرود ربانی
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے

دیار ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بسایا خطہ جاپان و ملک چیں میں نے

بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلاف معنی تعلیم اہل دیں میں نے

لہو سے لال کیا سیکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکار عقل و دیں میں نے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلہ گردش زمیں میں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئنہ عقل دوربیں میں نے

کیا اسیر شعاعوں کو، برق مضطر کو
بنا دی غیرت جنت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ! راز ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہ نگیں میں نے

ہوئی جو چشم مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانہ دل میں اسے مکیں میں نے

*

دیکھا جائے تو زیر شرح نظم میں اقبال نے ایک طرح سے ازل سے ابد تک انسان کے عروج و زوال کی داستانیں رقم کی ہیں۔ انہوں نے پیغمبروں اور بعض دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کی عظمت اور قربانیوں کے حوالے سے ایسے نقشے پیش کیے ہیں جن سے انسانیت کا منظر نامہ ترتیب پاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اٹھارہ اشعار پر مشتمل یہ نظم تخلیق کائنات اور اس کے بعد عہد بہ عہد عروج زوال کی نشاندہی کرتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے! علامہ فرماتے ہیں!

① سے ③ معنی: پیمان اولیں: پہلا عہد (مراد روز ازل)۔ جام آتشیں: تیز شراب کے پیالہ سے مراد

ہے۔ خیال فلک نشیں: آسماں تک پہنچنے والا خیال۔

مطلب: یہاں انسان یوں گویا ہوتا ہے کہ میری وطن سے دوری اور غربت کا احوال سننا ہے تو سنو! کہ جس مرحلے پر میں نے خالق دو جہاں کی ربوبیت کا اقرار کیا اور میری دانش نے مجھے اپنی حقیقت کے طلسم سے آگاہ کیا تو عجیب کیفیت رونما ہوئی کہ میرا دل جنت کی قیام گاہ سے اکتا کر رہ گیا۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا جب میرا شعور بیدار ہوا تھا۔ اس لمحے دل میں یہ لگن پیدا ہوئی کہ کائنات کی جملہ حقیقتوں سے آگاہی حاصل کروں! اس لمحے میرا دماغ عرش معلی پر تھا۔

④ سے ⑧ **معنی:** تغیر پسند: بدلنے والا۔

مطلب: انسان کہتا ہے کہ کائنات کی حقیقتوں سے آگاہی کے جذبے کے علاوہ میرا مزاج اس قدر تغیر پسند واقع ہوا تھا کہ میں نے زمین پر پہنچنے کے بعد کسی ایک مقام پر قیام کو گوارا نہ کیا۔ چنانچہ کبھی تو پیغمبر خدا حضرت ابراہیمؑ کا وجود اختیار کر کے بتوں سے کعبہ کو پاک کیا اور کبھی آذر بن کر کعبے کو بتوں سے مزین کر دیا۔ کسی مرحلے پر خدائے لم یزل سے مکالمے کا جنون پیدا ہوا تو حضرت موسیٰؑ کی شکل میں کوہ طور پر جا پہنچا اور کبھی آستین میں نور خداوندی کو چھپا لیا۔ کوہ طور پر ید بیضا کے استعارے حضرت موسیٰؑ کی ذات و صفات کے استعارے بنتے ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ اپنے ہی عزیز و اقارب نے مجھے صلیب پر چڑھا دیا۔ یہاں اشارہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب ہے۔ اس کے بعد وہ مرحلہ بھی آیا جب ایک بار پھر زمین سے پرواز کر کے آسمان کی جانب رخ کیا۔ اس مصرع میں اشارہ سفر معراج کی جانب بھی ہے۔ اس شعر میں پیغمبر آخر الزماںؐ کے غار میں پوشیدہ ہونے کے واقعہ کے ساتھ اس امر کی نشاندہی بھی کہ حضورؐ کے ساتھ ہی نبوت ختم ہو گئی یعنی یہ کہ وہ آخری نبیؐ تھے۔

⑨ سے (13) **معنی:** تہ نگیں: زیر نگیں۔

مطلب: انسان ان اشعار میں یوں گویا ہوتا ہے کہ سرور کائناتؐ کے بعد ہندوستان میں خالق حقیقی کے پیغام کی ترسیل کے لیے کرشن اور مہاتما بدھ جیسے اوتاروں کا روپ دھار لیا۔ اور کبھی یونان کی سرزمین پر سقراط جیسے جراءت مند اور سچ بولنے والے فلسفی کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستان میں جب مہاتما بدھ کی حیثیت سے وہاں کے باشندوں نے میری صدا پر لبیک نہ کہا تو پھر میں نے جاپان اور چین جا کر وہاں کے لوگوں کو اپنی تعلیم سے آراستہ کیا۔

کبھی میں نے ایک سائنسدان کی حیثیت سے اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کائنات کا وجود مادہ کے ذریعے عمل میں آیا اور روح کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظران لوگوں کے نظریات کی نفی کرتا ہے جو مذہب اور دین پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ تعقل پرست اور مذاہب پر یقین رکھنے والے لوگوں میں جنگ و جدل کا بازار ایسا گرم ہوا جس میں لاتعداد لوگوں کے خون سے زمین سرخ ہو گئی۔ پھر یوں بھی ہوا کہ میں نے ستارہ شناسی اور اس کی حقیقت کے ادراک کے لیے نہ جانے کتنی راتوں تک بیدار رہ کر ریاضت کی۔

14- سے 18 **معنی:** مظاہر پرست: قدرت کے مظاہر کو پوجنے والی۔

مطلب: برنیکس نے جب زمین کی گردش کا انکشاف کیا تو مسیحی پادریوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ اس

لیے اکثر مذاہب کی طرح عیسائی بھی اس عقیدے کے حامل تھے کہ زمین ساکن ہے لیکن برنیکس نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دکھایا کہ زمین ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے۔ پھر جب اس نظریے کی مخالفت میں تلواریں نکل آئیں پھر بھی برنیکس نے مزید تحقیقات جاری رکھیں اور وہ اس نوع کی مخالفت کے روبرو ڈٹ گیا۔

انسان کہتا ہے کہ اس کے بعد میں نے بحیثیت سائنس دان اپنی دانش و جستجو سے یہ راز آشکار کیا کہ اشیا جو فضا میں موجود ہیں وہ اوپر کی طرف جانے کی بجائے زمین کی طرف ہی کیوں راغب ہوتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے میں نے شعاعوں اور برق سے سبق حاصل کر کے بجلی پیدا کی جو ہر طرف روشنی کا ذریعہ بنی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے فہم وادراک سے میں نے ساری دنیا کو تسخیر تو کر لیا لیکن یہ راز نہ پا سکا کہ ہستی کیا شے ہے؟ لیکن میری ظاہر پرست آنکھ جب حقیقت کو پانے کے قابل ہو سکی تو پتہ چلا کہ حسن ازل اور حقیقت زندگی تو خود میرے دل کے اندر مقام کیے ہوئے ہے۔

ترانہ ہندی

039

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا

اے آب رود گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

*

یہ ترانہ اقبال نے اس وقت لکھا تھا جب وہ ایک وطن پرست انسان کے مانند متحدہ ہندوستان کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔ ایک محب وطن شاعر کی حیثیت سے ان کا ذہن ان اشعار میں ہر نوع کے اختلافات اور تعصبات سے پاک نظر آتا ہے۔ ان کے ذہن میں بنیادی مسئلہ اس وقت صرف اور صرف انگریز کی غلامی کا تھا چنانچہ ان اشعار میں بھی کہیں کہیں اس طرف اشارے ملتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

معنی: پربت: پہاڑ۔ رشک جناں: جنت سے بڑھ کر خوبصورت۔ آب رود گنگا: گنگا کے دریا کا پانی۔ دور زماں: زمانے کی گردش۔

مطلب: ہندوستان ہمارا ایسا وطن ہے جو ساری دنیا سے اعلیٰ اور خوبصورت نظر آتا ہے۔ اگر اس کو گلستان تصور کر لیا جائے تو ہماری حیثیت اس میں مقیم ان بلبلوں کی سی ہے جو خوشیوں کے نغمے گاتی رہتی

ہیں۔ اقبال دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ اگر ہم سفر میں یا کسی دوسرے ملک میں ہوں تو بھی دل میں وطن کی محبت موجزن رہتی ہے۔ چنانچہ پردیس میں رہتے ہوئے بھی ہم خود کو اپنے وطن میں ہی محسوس کرتے ہیں۔

یقیناً یہ قابل فخر حقیقت ہے کہ ہمالہ جیسا بلند پہاڑ جس کی چوٹیاں آسمانوں کو چھوتی رہتی ہیں وہ ہمارے محافظ اور پاسباں کی طرح سے استادہ ہے۔ ہزاروں ندی نالے وطن عزیز کے طول و عرض میں موجزن رہتے ہیں۔ جن کے سبب یہاں کی سرزمین ایسی سرسبز و شاداب رہتی ہے جو جنت کے لیے بھی باعث رشک ہے۔ اس شعر میں اقبال دریائے گنگا کو مخاطب کر کے استفسار کرتے ہیں کہ کیا تجھے وہ دن یاد ہے جب ہمارا قافلہ تیرے کنارے پر وارد ہوا تھا۔ واضح رہے کہ علامہ کے آباء و اجداد برہمن تھے اور ہزاروں سال قبل جنوبی ایشیا سے نقل وطن کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ان کا اشارہ اسی واقعہ کی جانب ہے۔

اس شعر میں اقبال اپنے عہد کے مذہبی تعصبات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی مذہب بھی آپس کی دشمنی نہیں سکھاتا بلکہ باہمی سلوک و اتحاد کی تلقین کرتا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہمارا وطن ہندوستان ہے اور ہم سب ہندی ہیں یعنی اس کے باشندے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تم بڑی اور قدیم تہذیبیں جو یونان' مصر اور روم کا طرۂ امتیاز تھیں وہ امتداد زمانہ سے بالا خربٹ کر رہ گئیں جب کہ آج بھی ہر طرح کے تغیر و انقلاب کے باوجود ہم ہندیوں کا نام و نشان باقی ہے اور ہماری تہذیب ماضی کی طرح زندہ و پائندہ ہے۔ آخر ہم میں کوئی ایسی خصوصیت تو موجود ہے جس کے سبب ہمیں زوال نصیب نہیں ہوا جب کہ گردش دوراں صدیوں سے ہماری دشمن چلی آرہی ہے۔ نظم کے اس آخری شعر میں اقبال اپنی داخلی کیفیت کو اشارتاً بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں ہمارا کوئی بھی محرم راز نہیں! نا ہی اس درد سے آگاہ ہے جو ہمارے دل میں چھپا ہوا ہے۔

جگنو

040

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا؟
غربت میں آ کے چمکا' گمنام تھا وطن میں؟

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا؟
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں؟

حسن قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں؟

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے' آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا' جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب' یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی!
پروانے کو تپش دی' جگنو کو روشنی دی

رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی
نظارہ شفق کی خوبی زوال میں تھی چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
رنگیں کیا سحر کو، بانکی دلھن کی صورت پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو پانی کو دی روانی، موجوں کو بے کلی دی
یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیے ہیں، ورنہ نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی جگنو میں وہ چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

*

اقبال کی یہ نظم اس بلند پایہ امیجری کی مظہر ہے جس نے انہیں ایک بڑے شاعر ہونے کی فضیلت بخشی۔ جگنو بظاہر ایک ننھا سا پرندہ ہے لیکن اقبال نے اس کے وجود کو خوبصورت امیجز کے حوالوں سے جس مقام پر پہنچا دیا ہے اس کا اندازہ نظم پڑھنے سے ہی ممکن ہے۔ عملاً اس نظم کے تین حصے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

پہلا حصہ معنی: کاشانہ چمن: باغ کا صحن۔ سفیر: ایلچی۔ تکمہ: بٹن۔ حسنِ قدیم: پرانا حسن۔

مطلب: جب کسی باغ میں جگنو اپنی روشنی سمیت محوِ پرواز ہوتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پھولوں کی بزم سجی ہوئی ہے اور اس میں جگنو کا وجود ایک روشن شمع کی مانند ہے۔ لگتا ہے کہ یا تو آسمان سے اڑ کر کوئی ستارہ یہاں پہنچا ہے جو چاند کی کوئی کرن جگمگا رہی ہے۔ یا ایسے کہ جس طرح سے دن کا کوئی سفیر رات کی سلطنت میں وارد ہوا ہے۔ ہر چند کہ اپنے وطن میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی لیکن یہاں پہنچ کر اس کی شخصیت چمک اٹھی ہے۔ اس شعر سے مراد یہ ہے کہ دن کے وقت جگنو کے پروں کی روشنی اپنے وجود کا احساس نہیں کرا پاتی جب کہ رات کی تاریکی میں یہ اسے فروزاں کرنے میں مدد دیتی ہے۔

شب کے لحات میں چمکتے ہوئے جگنو کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ چاند نے اگر قبا پہنی ہوئی ہے تو اس کا کوئی بٹن ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔ یا سورج نے اگر کوئی لباس پہنا ہوا ہے تو اس پر پڑا ہوا کوئی ذرہ چمک رہا ہے۔ دراصل یہ محض ایک ننھا سا پرندہ نہیں بلکہ یہ تو حسنِ قدیم کی ایک ایسی جھلک کے مانند ہے جسے قدرت تنہائی سے نکال کر کسی انجمن میں لے آئی ہو۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ جگنو تو ایک چھوٹے سے چاند کے مانند ہے جس میں تاریکی بھی ہے اور روشنی بھی! ایسا چاند جو اسی سبب کبھی گہن سے باہر نکل آتا ہے اور کبھی گہن میں چھپ جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب جگنو محوِ پرواز ہوتا ہے تو اس کے ننھے ننھے پروں سے لمحے بھر کو روشنی برآمد ہوتی ہے اور لمحے بھر کے لیے تاریکی پھیل جاتی ہے۔ ہر چند کہ پروانہ بھی ایک کیڑا ہے اور جگنو بھی ایک حقیر سا کیڑا ہے لیکن

صورت یہ ہے کہ پروانے کو تو روشنی کی طلب ہوتی ہے جب کہ جگنو سراپا روشنی ہے۔

دوسرا حصہ معنی: رنگیں نوا: سریلی آواز۔

مطلب: ان اشعار میں پروانے اور جگنو کے وجود کے حوالے سے مختلف اشیاء کی فطرت کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ امر واقع یہ ہے کہ قدرت نے دنیا میں ہر شے کو کوئی نہ کوئی خصوصیت عطا کی ہے فرق بس اتنا ہے کہ پروانے کو حرارت بخشی گئی ہے اور جگنو کو روشنی سے نوازا گیا ہے۔ اسی طرح بعض بے زباں پرندوں کو دل موہ لینے والے انداز میں نغمگی کا عمل سکھایا اس کے برعکس پھولوں کو پتیوں کی شکل میں زبان عطا کر کے خاموش رہنے کی تعلیم عطا فرمائی۔

اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ شفق کا نظارہ ہمیں یوں اچھا لگتا ہے کہ اس کی مدت محض چند لمحات تک محدود ہے اور اس کی جو مختصر زندگی ہے وہی اس کا حسن ہے پھر سحر کے لمحات کو بھی اتنا خوبصورت پیراہن عطا کیا کہ اسے ایک دلہن سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ طلوع سحر کا منظر سرخی لیے ہوئے ہوتا ہے اسی لیے اگر اس کو دلہن کو سرخ جوڑے سے تعبیر کیا جائے تو مناسب ہو گا اور اس لباس پر شبنم کے قطرے کو آرسی تصور کر لیا گیا ہے۔

یہی نہیں قدرت نے درختوں کو سایہ عطا کیا اور ہوا کو فضا میں اڑنا سکھایا جب کہ پانی کو روانی بخشی اور موجوں کو اضطراب و تڑپ سے نوازا۔ ان سب حقائق کے باوجود اس امتیاز میں ایک خصوصی بات بھی ہے کہ جگنو کے لیے وہی وقت دن کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کو ہم انسان رات سمجھتے ہیں۔

تیسرا حصہ معنی: کسک: کسک۔ ہنگاموں کا محل: شور و غوغہ کا مقام۔

مطلب: اقبال پہلے دونوں حصوں کے اشعار کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مختلف اشیا کی جو امتیازی خصوصیات بیان کی گئی ہیں ان پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو اس امر کا اندازہ لگانے میں کوئی قباحت نہیں ہو گی کہ یہ اشیاء عملاً رب کائنات کے حسن کی کرشمہ سازی ہیں۔ فرق بس اسی قدر ہے کہ انسان کو بولنا سکھایا ہے تو غنچے کو چٹکنا! اسی طرح چاند اور شاعر کے دل میں بھی کوئی نمایاں فرق نہیں کہ چاند کی روشنی اور شاعر کے دل کی کسک عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ یہ تو محض ایک ایسا دھوکا ہے جو گفتگو کے انداز سے پیدا ہوا۔ اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مختلف اشیاء کے جو مطالب و معانی وضع کر لیے گئے ہیں وہی عام انسان کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں۔ بصورت دیگر نغمہ جو ہے وہ عملاً بلبل کی خوشبو ہے۔ اور خوشبو پھول کی چمک سے مشابہ ہے۔ گویا بلبل کے نغمے کی وہی حیثیت ہے جو پھول کی خوشبو کی ہے۔

یہ نظم بغور دیکھا جائے تو وحدت الوجود کے فلسفے کی بنیاد بنتی ہے۔ جو آخری دو اشعار میں تو بالکل واضح ہو کر سامنے آگیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ رب کائنات کی ذات اور اس کا راز بیک وقت مختلف اشیا میں ظاہر ہو کر مردم نظروں سے چھپ گیا ہے ورنہ بغور دیکھا جائے تو جو حقیقت جگنو میں چمک اور روشنی بن کر نمایاں ہوتی ہے وہی حقیقت پھول کی خوشبو سے بھی ظاہر ہوتی ہے چنانچہ اس حوالے سے جب ہر شے میں رب ذوالجلال کا نور اور اس کا حسن چھپا ہوا ہے تو پھر اختلاف و افتراق میں پڑ کر نئے جھگڑے کس لیے پیدا کیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے مختلف اشیاء کے تقابلی کرداروں کے حوالے سے ایک بڑے مسئلے کا حل پیش کیا ہے۔

صبح کا ستارہ

041

لطف ہمسایگی شمس و قمر کو چھوڑوں　اور اس خدمت پیغام سحر کو چھوڑوں
میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی　اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی
آسماں کیا، عدم آباد وطن ہے میرا　صبح کا دامن صد چاک کفن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا　ساقی موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا
نہ یہ خدمت، نہ یہ عزت، نہ یہ رفعت اچھی　اس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی

میری قدرت میں جو ہوتا، تو نہ اختر بنتا
قعر* دریا میں چمکتا ہوا گوہر بنتا

واں بھی موجوں کی کشاکش سے جو دل گھبراتا　چھوڑ کر بحر کہیں زیب گلو ہو جاتا
ہے چمکنے میں مزا حسن کا زیور بن کر　زینت تاج سر بانوئے قیصر بن کر
ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیبا جاگا　خاتم دست سلیماں کا نگیں بن کے رہا
ایسی چیزوں کا مگر دہر میں ہے کام شکست　ہے گہرہائے گرانمایہ کا انجام شکست
زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل　کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل

ہے یہ انجام اگر زینت عالم ہو کر
کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہو کر؟

کسی پیشانی کے افشاں کے ستاروں میں رہوں　کسی مظلوم کی آہوں کے شراروں میں رہوں
اشک بن کر سر مژگاں سے اٹک جاؤں میں　کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں

جس کا شوہر ہو رواں ہو کے زرہ میں مستور　سوئے میدان وغا، حب وطن سے مجبور
یاس و امید کا نظارہ جو دکھلاتی ہو　جس کی خاموشی سے تقریر بھی شرماتی ہو
جس کو شوہر کی رضا تاب شکیبائی دے　اور نگاہوں کو حیا طاقت گویائی دے
زرد رخصت کی گھڑی عارض گلگوں ہو جائے　کشش حسن غم ہجر سے افزوں ہو جائے
لاکھ وہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں　ساغر دیدۂ پرنم سے چھلک ہی جاؤں

خاک میں مل کے حیات ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

*

پہلا حصہ　معنی: صبوحی: شراب جو صبح کے وقت پی جاتی ہے۔ قعر دریا: گہرائی۔

مطلب: علامہ اقبال کی یہ نظم عملاً تین حصوں پر مشتمل ہے۔ تینوں حصوں میں "صبح کا ستارہ" عالم یاس میں یوں گویا ہوتا ہے کہ اب تو یہ جی چاہتا ہے کہ سورج اور چاند کی قربت سے دست کش ہو جاؤں اور اپنے طلوع ہونے سے آمد صبح کا جو پیغام دیتا ہوں اس ذمہ داری سے بھی جان چھڑا لوں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آسمان پر جو ستاروں کی بستی قائم ہے اس میں رہائش کسی طرح مناسب نہیں اس کے برعکس

یہ جو بلندی ہے اس کی نسبت زمین کی پستی میرے لیے زیادہ مناسب ہے۔ میرا وطن آسمان نہیں بلکہ وہ جہان فانی ہے جہاں بعد فنا ہر شخص کا پہنچنا مقدر ہے۔ میری کیفیت تو یہ ہے آمد صبح کے ساتھ ہی اپنی عمر طبعی تمام کر کے راہی ملک عدم ہو جاتا ہوں۔

ہر چند جینا اور مرنا میرا مقدر بن کر رہ گیا ہے یعنی ہر روز طلوع ہوتا ہوں اور دن نکلتے ہی فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہوں۔ اس نوع کی ذمہ داری' عزت اور بلندی آخر کس کام کی کہ تھوڑی دیر چمک کر اپنے وجود سے آشنا کرایا اور بس! ایسی روشنی سے تو بخدا تاریکی ہی برتر ہے۔ ستارہ صبح کہتا ہے کہ اگر میرے میں کچھ ہوتا تو ستارہ بننے کی بجائے سمندر کی تہہ میں موتی بن کر رہنا زیادہ پسند کرتا۔

دوسرا حصہ معنی: زیب گلو: گلے کی زینت۔ **سربانوئے قیصر:** قیصر کی ملکہ۔ **خاتم:** انگوٹھی۔ **گہرہائے گرانمایہ:** قیمتی موتی۔

مطلب: اگر سمندر کی تہہ میں بھی موجوں کے ہچکولوں سے دل گھبراتا تو سمندر کو خیر آباد کہہ کر کسی حسین کے گلے کی زینت بن جاتا۔ اس لیے کہ آسمان کی بلندی پر چمکنے میں وہ لطف نہیں جو کسی حسین کے زیور کی چمک میں ہوتا ہے یا کسی شہنشاہ کی ملکہ کے تاج کی آرائش بننے میں ممکن ہے۔ اس لیے کہ وہ جو دیکھنے میں ایک معمولی پتھر تھا لیکن اس کا نصیب جاگا تو حضرت سلیمان کی انگوٹھی کا نگینہ بن گیا۔

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کی اشیاء بالعموم دنیا میں شکست و ریخت سے دوچار ہو کر رہتی ہیں۔ چنانچہ بیش قیمت اور نایاب قسم کے موتی کا انجام بھی بالاخر ریزہ ریزہ ہوتا ہے۔ بے شک حقیقی زندگی تو وہ ہے جو موت سے آشنا نہ ہو۔ وہ جینا تو لاحاصل ہے جس کا انجام موت ہو۔ اگر کائنات کی زینت بننے کے باوجود انجام بالاخر فنا ہونا ہی ہے تو کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ شبنم کی طرح پھول پر قربان ہو جاؤں۔

تیسرا حصہ معنی: میدان وغا: لڑائی کا میدان۔ **عارض گلگوں:** پھولوں جیسے رخسار۔

مطلب: میں تو خود کو اس امر کا اہل سمجھتا ہوں کہ کسی حسین کے ماتھے کی افشاں کا روپ دھار لوں یا پھر کسی مظلوم کی آہوں میں منتقل ہو جاؤں۔ بعد کے اشعار میں کہا گیا ہے کہ میں کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑوں جس کا شوہر زرہ پہن کر عازم جنگاہ ہوا چاہتا ہے کہ حب وطن کا تقاضا ہی یہ ہے۔ اس لیے وفادار بیوی امید و بیم کا شکار ہو اور اس کی خاموشی داخلی جذبوں کی ترجمانی کر رہی ہو۔ شوہر سے فرقت اور جدائی کے باوجود وہ مجسم صبر بنی ہوئی ہو۔

بیوی کا پھول جیسا سرخ و سفید چہرہ شوہر کی جدائی کے غم سے زرد ہو جائے لیکن یہ بھی ہو کہ جدائی کا غم اس کے حسن کی کشش کو دوبالا کر دے۔ وہ کتنا ہی ضبط کرے اس کے باوجود میں آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑوں۔ اس لیے خاک میں مل کر حیات ابدی حاصل کر لوں کہ سوز عشق کا حاصل ہی یہی ہے اور یہی حقیقت' میں سارے زمانے پر آشکار کرنے کا خواہاں ہوں۔

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

042

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا | نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
بندے کلیمؑ جس کے، پربت جہاں کے سینا نوحؑ نبی کا آ کر ٹھیرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

٭

چار بند پر مشتمل یہ گیت علامہ اقبال نے ایک قوم پرست شاعر کی حیثیت سے اس صدی کے اوائل میں لکھا تھا جس میں ہندوستانی بچوں کی جانب سے اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ "بانگ درا" کی نظمیں چونکہ اقبال کے ابتدائی کلام کی آئینہ دار ہیں اس وقت ہندوستان میں فرقہ پرستی کی لعنت تو بہرحال موجود تھی اس کے باوجود تعصبات کی وہ فضا نہ تھی جو بعد میں پیدا ہوئی اور جس کے سبب قائداعظم، علامہ اقبال اور دوسرے مسلمان رہنماؤں کی جانب سے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا چنانچہ اس گیت کو اسی عہد کے تناظر میں دیکھا جائے جس میں یہ لکھا گیا۔

پہلا بند معنی: چشتیؒ: حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری۔ نانک: سکھ مذہب کے بانی۔

مطلب: ہندوستانی بچے اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے جس سرزمین پر رب ذوالجلال کا پیغام لوگوں کو سنایا، جہاں سکھ مذہب کے بانی گورو نانک نے خدا کی وحدانیت کا درس دیا، مغل اگرچہ پہلے پہل ہندوستان میں محض اس لیے آئے تھے کہ اس کو فتح کر کے اپنا تسلط جمالیں لیکن یہ زمین انہیں ایسی قدر پسند آئی کہ یہیں پر رچ بس گئے۔ یہی نہیں بلکہ وہ لوگ جو عارضی طور پر ہندوستان آئے تھے اس کی خوبصورتی اور عظمت کو دیکھ کر انہوں نے مستقل طور پر اسے اپنا وطن بنا لیا چنانچہ یہی وہ سرزمین ہے جو ہمارا وطن ہے اور ہمیں اس پر فخر بھی ہے۔

دوسرا بند معنی: زر: سونا۔

مطلب: ہندوستان کے باشندوں نے علم و حکمت کے وہ جوہر دکھائے جو یونان کے فلاسفروں کو بھی حیرت زدہ کر گئے۔ صرف یونان ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام ملکوں کو یہیں سے علم و ہنر کی دولت عطا ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سرزمین کی مٹی کو بھی قدرت نے سونا بنا دیا تھا مراد یہ کہ یہ مٹی اس قدر زرخیز تھی جس کی پیداوار نے مغلوں کو بے حد مالدار اور خوشحال کر دیا چنانچہ یہی سرزمین ہمارا وطن ہے۔

تیسرا بند معنی: ٹوٹے تھے جو ستارے: مراد ہے پارسی قوم۔

مطلب: ایران سے آنے والے امراء اہل حکمت و دانش اور ہنر مند لوگ ہندوستان میں آ کر رچ بس گئے تو انہوں نے وہ شہرت و عزت پائی کہ ان کے علم و حکمت کی روشنی دور دور تک جا پہنچی۔ جہاں کرشن نے وحدت کا درس لوگوں کو دیا اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے جہاں سے ایک طرح کی ٹھنڈی ہوا کی آمد کو محسوس کیا وہی سرزمین ہند میرا وطن بھی ہے۔

چوتھا بند معنی: **سفینا:** کشتی۔

مطلب: وہ سرزمین جہاں کا ہر شخص حضرت موسیٰؑ جیسی عظمت کا حامل ہے اور جہاں کا ہر پہاڑ کوہ طور کی حیثیت رکھتا ہے (ان مصرعوں کو شعری غلو سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے) حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جہاں آ کر ٹھہری تھی اور جس سرزمین کی رفعت آسمان کی ہم پایہ ہے یہاں پر زندگی گزارنا جنت میں گذر بسر کرنے کے مصداق ہے وہی سرزمین ہندوستان میرا وطن ہے۔

نیا شوالہ 043

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامان آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

*

پہلا بند معنی: **صنم کدوں:** بت خانہ، مندر۔

مطلب: اقبال کی اس نظم اور بعض دوسری نظموں کے مطالعے سے ہی اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی سطح پر ہی ان کا تخلیقی جوہر نئے خیالات اور اجتہاد سے ہم آہنگ تھا۔ زیر تشریح نظم میں اقبال برہمن سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تو برا نہ مانے تو میں حقیقت کا اظہار کر دوں ہرچند یہ حقیقت قدرے تلخ ثابت ہو گی۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ تو جن بتوں کی پرستش کرتا ہے وہ انتہائی فرسودہ ہو چکے ہیں اور عہد نو میں ان کی حیثیت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ انہی بتوں کی پرستش نے تجھے اپنے جیسے انسانوں سے عداوت رکھنا سکھایا۔ اے برہمن محض تو ہی اس لعنت میں مبتلا نہیں بلکہ واعظ بھی اسی

نوعیت کی تفرقہ بازی اور جنگ و جدل میں مصروف ہے۔ اسی لیے میں نے اس صورت حال سے تنگ آ کر کعبہ و بتخانہ دونوں کو چھوڑ دیا ہے نہ اب میں واعظ کی بات سنتا ہوں نا ہی تیرے اشلوک سننے پر آمادہ ہوں۔ اے برہمن! دراصل تیرا عقیدہ محض یہ ہے کہ پتھر کی ان مورتیوں میں (جن کی تو پرستش کرتا ہے) خدا کا وجود پوشیدہ ہے جب کہ میں اپنے وطن کی خاک کے ہر ذرے کو دیوتا تصور کرتا ہوں۔

دوسرا بند **معنی** : **غیریت**: غیر ہونا' بیگانہ ہونا۔ **نقش دوئی**: دو ہونے کا نشان۔ **تیرتھوں**: ہندوؤں کا مقدس مقام۔ **کلس**: گنبد کے اوپر کی کلغی۔ **شکتی**: طاقت۔ **شانتی**: تسلی۔ **باسیوں**: بسنے والے۔

مطلب: اے برہمن! آ ہم دونوں مل کر ایک بار پھر نفاق اور تفرقہ بازی کا خاتمہ کر دیں اور اہل وطن جو باہمی نفرت اور نفاق کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں ان کے مابین اتحاد و یگانگت کا جذبہ پیدا کر کے ایک بار پھر گلے ملا دیں۔ اسی نفاق کے سبب دلوں کی بستیاں ویران ہو چکی ہیں۔ آ ان میں ایک نئے شوالہ کی بنیاد رکھ دیں۔ یہ شوالہ ساری دنیا کی عبادت گاہوں سے مرتبے میں بلند ہو۔ اس شوالہ میں سب محبت و آشتی کے نغمات گائیں اور تمام اہل ہند میں محبت و آشتی کی فضا پیدا کر دیں۔ امن و قوت کا تصور ایسے گیتوں میں پوشیدہ ہے جو صلح' آشتی اور محبت و یگانگت سے عبارت ہیں۔

داغ

044

عظمت غالب ہے' اک مدت سے پیوند زمیں
مہدی مجروح ہے شہر خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشم محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیر
آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے
شمع روشن بجھ گئی' بزم سخن ماتم میں ہے
بلبل دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں
چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن! وہ شوخی طرز بیاں
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلی معنی وہاں بے پردہ' یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گل کا راز؟
کون سمجھے گا چمن میں نالہ بلبل کا راز؟
تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکر نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
تلخی دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے
اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی
اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بتخانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خواب جوانی! تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اٹھ گیا ناوک فگن' مارے گا دل پر تیر کون؟

اشک کے دانے زمین شعر میں بوتا ہوں میں تو بھی رو اے خاک دلی! داغ کو روتا ہوں میں
اے جہان آباد اے سرمایہ بزم سخن! ہو گیا پھر آج پامال خزاں تیرا چمن
وہ گل رنگیں ترا رخصت مثال بو ہوا آہ! خالی داغ سے کاشانہ اردو ہوا
تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں وہ مہ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اٹھ گئے ساقی جو تھے' میخانہ خالی رہ گیا
یادگار بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

*

عملی سطح پر یہ نظم ایک مرثیے کی حیثیت رکھتی ہے جو اقبال نے اپنے استاد اور صاحب طرز شاعر نواب میرزا خاں داغ کے سانحہ ارتحال پر لکھا تھا۔ اقبال نے اس مرثیے میں جہاں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے وہاں داغ کی شاعری اور اسلوب پر ایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے۔ اس اعتبار سے داغ کے بارے میں اقبال کی ایک بے حد اہم اور قابل ذکر نظم ہے۔ فرماتے ہیں۔

پہلا حصہ معنی: پیوند زمیں: خاک میں دفن۔ مہدی مجروح: مرزا غالب کا شاگرد۔ مینائے امیر: امیر مینائی کی صراحی۔ زیب دوش: کندھوں کی سجاوٹ۔

مطلب: میرزا اسد اللہ خاں غالب تو ایک مدت ہوئی وفات پا چکے۔ اس کے باوجود ان کی شاعرانہ عظمت ابھی تک زندہ و باقی ہے۔ اسی طرح میرزا غالب کے ایک اہم شاگرد جن کا تعلق دہلی سے تھا وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے۔ اسی طرح موت کا سنگدل فرشتہ میر تقی میر کی روح کو بھی چاٹ گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج بھی ان کی شاعری کا کیف و سرور باقی ہے۔ لیکن آج نواب میرزا داغ کی وفات حسرت آیات کے سبب چمن شاعری ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے کہ ان کی شخصیت بزم شاعری میں ایک روشن شمع کی حیثیت رکھتی تھی جو بجھ کر رہ گئی ہے۔ داغ کا وجود تو ایسا تھا جو باغوں میں چہکتے ہوئے بلبل کا ہوتا ہے۔ دہلی کا یہ صاحب اسلوب شاعر افسوس کہ اسی قبرستان میں پہنچ گیا جہاں دوسرے بڑے شعراء دفن تھے۔ حیف در حیف کہ استاد داغ بھی چل بسے اور ہم لوگ ان کی میت کو کاندھوں پر اٹھا کر مرحوم کی آخری قیام گاہ تک پہنچا آئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دلی کے یہ آخری صاحب طرز و اسلوب شاعر تھے جو وفات پا کر آج ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

دوسرا حصہ معنی: کافور پیری: کافور کی طرح بڑھاپے میں سفید بال۔ نشیمن: گھونسلا۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ نواب مرزا داغ کی وفات کے بعد اب نہ تو شاعری میں بانکپن رہا نہ طرز بیان کی شوخی رہی۔ ضعیفی کے عالم میں بھی وہ عالم شباب کی زندہ اور پر جوش شاعری کرتے تھے۔ یعنی ان کے کلام میں وہی شوخی اور تازگی تھی جو عہد جوانی کی تخلیقات کا حصہ ہے۔ داغ تو ایسے قادر الکلام شاعر تھے کہ ان کی خیال افروز تخلیقات کی آرزو ہر شعر کہنے والے کے دل میں ہے کہ ہم بھی اس معیار کے شعر کہہ سکتے۔ جو باتیں عام لوگ اپنے دل میں رکھتے تھے وہ داغ کی شاعری میں نمایاں ہو کر بالکل سامنے آجاتی

تھیں۔ وہ تو ایسے تخلیق کار تھے پھولوں کی خامشی میں جو راز پوشیدہ ہے اس کے بارے میں بادِ صبا سے استفسار کیا کرتے تھے۔ اسی طرح بلبل جس طرح باغوں میں نالہ و فغاں کرتی ہے اس کا پس منظر مرزا داغ کے سوا اور کس پر منکشف ہو سکے گا؟ وہ تو ایسے شاعر تھے جو اپنی تخلیقات میں حقیقتوں کے اسرار و رموز سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ اگر انہیں ایک پرندہ تصور کر لیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ پرواز کے دوران بھی نظر اپنے نشیمن پر رہتی تھی۔ مراد یہ ہے کہ شاعری میں بھی داغ ہمیشہ اپنے گرد و پیش اور حقائق کو مدِ نظر رکھتے تھے۔

تیسرا حصہ معنی: نکتہ آرا: باریک باتیں کرنے والا۔ فلک پیمائیاں: آسمان تک اڑانیں۔ ساحر: جادوگر۔ آزر: حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام۔

مطلب: یہ درست ہے کہ اس عالمِ رنگ و بو میں ایسے شاعر اور بھی پیدا ہوں گے جن کی شاعرانہ فکر کی باریکیاں اہلِ ذوق کے مشاہدے میں آئیں گی۔ ان کی فکر میں بے شک بلندی بھی ہو گی اور ندرت بھی۔ یہ لوگ اپنے عہد کے آشوب اور نامساعد حالات کا تذکرہ کر کے ہمیں افسردہ بھی کریں گے۔ اس کے علاوہ ان کے تخیل میں جو ایک نئی دنیا آباد ہے۔ اس کا منظر نامہ بھی حسبِ استطاعت پیش کریں گے۔ بے شک اس دنیا میں آئندہ بھی حافظ شیرازی جیسے بلند پایہ شاعر جنم لیں گے۔ جنہیں بلاشبہ صاحبِ اعجاز شاعر قرار دیا جائے گا۔ اگر بزمِ شعر کو ایک بتخانہ تصور کر لیا جائے تو اس میں آزر جیسے کئی صاحبِ فن بت تراش بھی پیدا ہوں گے۔ اگر اس بزم کو ایک میکدہ سمجھ لیا جائے تو کئی نئے ساقی اپنے پیمانوں سے پینے والوں کو مدہوش کریں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آئندہ آنے والے شعراء اپنے اپنے انداز میں کتابِ دل کی تفسیر پیش کریں گے اور جوانی کو اگر خواب سمجھ لیا جائے تو یہی لوگ اس کی تعبیریں بھی کریں گے۔ تاہم دیکھنا یہ ہے کہ عشق و محبت کا حقیقی منظر نامہ بھی کوئی پیش کر سکے گا؟ داغ ہی بلاشک و شبہ ایسے تیرانداز کی حیثیت رکھتے تھے جن کا نشانہ دیکھا جائے تو براہِ راست دل ہی ہوتا تھا۔ مراد یہ ہے کہ نواب میرزا داغ کی شاعری براہِ راست دل پر جس طرح سے اثر انداز ہوتی تھی یہ خصوصیت کسی دوسرے شاعر میں ممکن نہیں۔

چوتھا حصہ معنی: نظم کے اس حصے میں فی الواقع یہ مرثیہ اپنے پورے کلائمکس پر نظر آتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں استاد کی وفات کا سانحہ ایسا دل خراش ہے کہ اس کے ردِ عمل کے طور پر اشعار میں اپنے آنسو کاشت کر رہا ہوں یعنی آنکھوں سے بر آمد ہونے والے آنسو اشعار کی شکل میں ڈھل رہے ہیں چنانچہ میری طرح اے دلی کی خاک تو بھی اس غم میں آنسو بہا کہ تیری سرزمین تو داغ کا وطنِ عزیز تھی۔ اے دلی! تو جو اہلِ سخن کے لیے عظیم سرمایے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کس قدر الم انگیز یہ حقیقت ہے کہ مرزا داغ کی رحلت سے تیرا یہ بھرا ہوا چمن پامال اور ویران ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ تو ایک رنگین پھول تھا جو خوشبو کی مانند اڑ گیا۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اے کاشانہ اردو (دلی) تو آج داغ سے محروم ہو گیا۔ تاہم شاید میرزا داغ نے اتنی کشش تیری خاک میں محسوس نہ کی کہ دکن کی خاک ان کی آخری قیام گاہ بنی۔ واضح رہے کہ داغ رہنے والے دلی کے تھے جب کہ ان کی وفات دکن میں ہوئی۔ اس شعر میں اقبال نے اسی امر کی نشاندہی کی ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ دلی کے تمام اہم اور قابلِ ذکر شاعر تو رخصت ہو چکے اب تو صرف الطاف حسین حالی رہ گئے ہیں جن کو اس محفل کی یادگار کہا جا سکتا ہے۔

مطلب: یہاں اقبال کہتے ہیں کہ موت اس قدر سنگدل واقع ہوئی کہ انسانی خواہشات کی راہ میں ہمیشہ حائل رہتی ہے کہ اس کا تیر تو تاریکی میں ہی اپنے ہدف کو نشانہ بناتا ہے لیکن اس کے خلاف شکایت بھی تو لبوں پر نہیں آسکتی کہ خزاں کے بغیر گلشن کی قدر و قیمت کا اندازہ ممکن نہیں۔ قدرت کا یہ قانون یکسانیت کا حامل ہے کہ پھول کی خوشبو کا اڑنا اور پھول توڑنے والے کی موت کا انداز قریب قریب ایک جیسا ہی ہے۔

045 ابر

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا

نہاں ہوا جو رخ مہر زیر دامن ابر
ہوائے سرد بھی آئی سوار توسن ابر

گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا
عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

چمن میں حکم نشاط مدام لائی ہے
قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے

جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اٹھے
زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اٹھے

ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل
اٹھی وہ اور گھٹا، لو! برس پڑا بادل

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا

✻

معنی: پہاڑ سربن کا: پہاڑ کی ایک چوٹی کا نام۔ **نشاط مدام:** ہمیشہ کی خوشی۔ **مہر کی گرمی:** سورج کی گرمی۔

مطلب: مشرق کی سمت سے سیاہ بادلوں کی یلغار ہو رہی ہے۔ اس کے سبب سربن پہاڑیوں نظر آتا ہے جیسے کسی دیوانے کالا لباس پہن رکھا ہو۔ واضح رہے کہ سربن پہاڑ ایبٹ آباد کے قریب واقع ہے اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ علامہ نے یہ اشعار ایبٹ آباد میں ہی تخلیق کیے تھے۔ بادلوں کے سبب سورج چھپ گیا ہے اور سرد ہوا کے جھونکے بھی انہی کے ساتھ بر آمد ہوئے ہیں۔ لیکن ان بادلوں میں کوئی گھن گرج نہیں بلکہ خامشی طاری ہے یہ منظر تو ایک ایسے شراب خانے کا ہے جہاں خلاف معمول ہر جانب سناٹا ہو۔ یہ بادل اگر برسے تو باغ کو سرسبز اور شاداب کر جائیں گے اور نئے نئے پھول کھل سکیں گے۔

جو پھول سورج کی حدت سے مرجھانے لگے تھے وہ ان بادلوں کی سرد ہواؤں کے باعث از سر نو تر و تازہ نظر آنے لگے ہیں۔ پہلے محسوس ہوتا تھا کہ یہ مرجھائے ہوئے پھول خاک پر گر کر اپنا وجود کھو بیٹھیں گے لیکن آمد ابر نے ان میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ تیز ہوا کے سبب بادل اڑنے لگے اور آخر کار ان سے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ جس طرح پہاڑوں کے دامن میں اشجار اور پودے اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں، جی چاہتا ہے کہ ایسے خواب آور موسم میں ان سیاحوں کا بھی مستقل بسیرا ہو جائے جو یہاں سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

046

ایک پرندہ اور جگنو

سر شام ایک مرغ نغمہ پیرا — کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا
چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر — اڑا طائر اسے جگنو سمجھ کر
کہا جگنو نے او مرغ نوا ریز — نہ کر بے کس پہ منقار ہوس تیز
تجھے جس نے چہک، گل کو مہک دی — اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
لباس نور میں مستور ہوں میں — پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں
چہک تیری بہشت گوش اگر ہے — چمک میری بھی فردوس نظر ہے
پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی — تجھے اس نے صدائے دلربا دی
تری منقار کو گانا سکھایا — مجھے گلزار کی مشعل بنایا
چمک بخشی مجھے، آواز تجھ کو — دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز — جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز
قیام بزم ہستی ہے انہیں سے — ظہور اوج و پستی ہے انہیں سے

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

*

زیر تشریح نظم عملاً "جیو اور جینے دو" کے اصول پر مبنی اس نظم میں دو کردار ہیں۔ ایک پرندہ اور دوسرا جگنو! اقبال نے پرندے کے رویے پر جگنو کا جو ردعمل ہے اس کی زبانی اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

① سے ③ **معنی:** **نغمہ پیرا:** گانے والا۔ **نوا ریز:** راگ برسانے والا' چہچہانے والا۔ **منقار ہوس:** لالچ کی چونچ۔

مطلب: ایک پرندہ شام کے وقت کسی درخت پر بیٹھا ہوا چہچہا رہا تھا کہ اس کی نظر زمین کی طرف گئی جہاں اس نے کسی چمکتی ہوئی چیز کو دیکھا۔ پرندے کو یقین تھا کہ یہ چمک جگنو کی ہی ہو سکتی ہے چنانچہ درخت سے اڑ کر وہ اس مقام کی جانب آیا کہ جگنو کو ہڑپ کر جائے۔ اس لیے جگنو نے پرندے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تو بے شک ایسا پرندہ ہے جو اپنے نغموں سے چمن میں بہار کا سا سماں پیدا کرتا ہے لیکن کسی کمزور اور ناتواں جگنو پر یوں جھپٹنا تیرا شعار نہیں ہونا چاہیے۔

④ سے ⑧ **معنی:** **بہشت گوش:** کانوں کی جنت یعنی دلکش۔ **فردوس نظر:** بہت خوبصورت۔ **منقار:** چونچ۔

مطلب: اے پرندے! میری بات غور سے سن کہ جس خدا نے چہکنا سکھایا اور پھولوں کو مہک دی اسی خدا نے مجھے بھی روشنی عطا کی ہے۔ میرا لباس تو نور ہی نور ہے یعنی قدرت خداوندی سے میرا جسم سرتاپا روشنی سے مزین ہے اور عملاً دنیا میں جو کیڑے مکوڑے ہیں ان میں میں کوہ طور کی حیثیت کا حامل ہوں

یعنی کوہ طور پر حضرت موسیٰؑ کو جو روشنی دکھائی دی تھی میں بھی اسی کی مانند ہوں۔ تیری چہک اور نغمے اگر دل موہ لینے والے ہیں تو میری چمک بھی نگاہوں کو بھلی لگتی ہے۔ قدرت نے میرے پروں میں روشنی کے دیئے جلا دیئے ہیں۔ اسی طرح تجھے بھی اس مالک دو جہاں نے دل آویز **نغمگی** عطا کی ہے۔ چنانچہ اگر تجھے گانا سکھایا گیا ہے تو اس حقیقت کو بھی جان لے کہ میرا وجود اس گلزار میں ایک مشعل کی مانند ہے۔

⑨ سے (12) معنی ::-

مطلب: اے پرندے! اس رب ذوالجلال نے اگر مجھے روشنی بخشی ہے تو تجھے بے شک خوش الحانی عطا کی ہے۔ بالفاظ دگر مجھے غم عشق میں جلنا مقدر کیا ہے اور تجھے **نغمگی** سے نوازا ہے۔ اس حقیقت کو بھی جان لے کہ اگر میں سوز ہوں اور تیری حیثیت ساز کے مانند ہے تو سوز اور ساز دونوں ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہوتے۔ کہ یہ دونوں عناصر تو اس کائنات میں ازل سے ہم آہنگ رہے ہیں۔

اے پرندے! یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لے کہ سوز اور ساز یعنی درد اور **نغمگی** دونوں ہی ایسے عناصر ہیں جن سے زندگی کا وجود قائم و دائم ہے۔ اور انہی سے انسان کے مراتب میں عروج و زوال کا اندازہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ باہمی اتحاد و اتفاق کے طفیل ہی یہ دنیا قائم ہے اور انہی کے سبب یہاں رونق رہتی ہے۔ سو تجھے اگر اپنی زندگی عزیز ہے تو مجھے بھی جینے دے اسی میں دونوں کا بھلا ہے۔

بچہ اور شمع

047

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلک پروانہ خو — شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تو
یہ مری آغوش میں بیٹھے ہوئے جنبش ہے کیا — روشنی سے کیا بغل گیری ہے تیرا مدعا؟
اس نظارے سے ترا ننھا سا دل حیران ہے
یہ کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے
شمع اک شعلہ ہے لیکن تو سراپا نور ہے — آہ! اس محفل میں یہ عریاں ہے تو مستور ہے
دست قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عریاں کیا — تجھ کو خاک تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا
نور تیرا چھپ گیا زیر نقاب آگہی — ہے غبار دیدۂ بینا حجاب آگہی
زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی ہے، بیہوشی ہے یہ
محفل قدرت ہے، اک دریائے بے پایاں حسن — آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفان حسن
حسن کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے — مہر کی ضوگستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ — شام کی ظلمت، شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں — طفلک نا آشنا کی کوشش گفتار میں
ساکنان صحن گلشن کی ہم آوازی میں ہے — ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے

چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن   شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن!
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس   ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس؟

حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیٔ بے آب ہے

٭

اقبال کی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے گردوپیش کے چھوٹے چھوٹے معاملات سے بڑے بڑے نتائج اخذ کیے۔ یوں ان کی تخلیقات میں کسی نہ کسی سطح پر فکر کی رو موجزن نظر آتی ہے۔ زیرِ تشریح نظم میں بھی ان کی دوسری تخلیقات کے مانند کچھ ایسی ہی صورتِ حال کا احساس ہوتا ہے۔ یہ نظم چار حصوں پر مشتمل ہے جن میں ان کا مکالمہ ایک ننھے بچے سے ہوتا ہے جو شمع کی روشنی کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھ رہا ہے۔ یہ مشاہدہ اقبال کے لیے ایک تخلیقی تجربے میں ڈھل جاتا ہے۔ ان کی اس نظم کو اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔

پہلا حصہ   معنی: **پروانہ خو:** پروانے جیسی خصلت والا۔ **گھڑیوں:** پہروں تک۔

مطلب: اقبال ننھے بچے سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تجھ میں بھی پروانے کی سی فطرت موجود ہے جو شمع پر اپنی جان نثار کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تو بھی سامنے رکھی ہوئی شمع کو مسلسل حیرت کے انداز میں تک رہا ہے۔ تو میری گود میں بیٹھا ہوا مسلسل حرکت کر رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے شمع سے ہم آغوش ہونے کا خواہاں ہے۔ شمع کا نظارہ تیرے لیے حیرانی کا سبب بنا ہوا ہے اور تو اس سے یوں متحیر ہو کر رہ گیا ہے۔ جیسے پہلے یہ نظارہ تیرا دیکھا ہوا ہو اور اب اسے از سرِ نو شناخت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

دوسرا حصہ   معنی: **عریاں:** برہنہ۔ **خاک تیرہ:** سیاہ مٹی۔

مطلب: اے ننھے بچے! میرے نزدیک تو شمع محض ایک شعلہ کی حیثیت رکھتی ہے جب کہ تو سراپا نور کے مانند ہے۔ فرق محض اسی قدر ہے کہ شمع کی روشنی تو صاف نظر آتی ہے جب کہ تجھ میں نور کی جو ضو موجود ہے وہ چھپی ہوئی اور ہر کس و ناکس اس کا نظارہ نہیں کر سکتا۔ نہ جانے قدرت نے شمع کی روشنی کو کیوں عریاں کر دیا ہے اور تیرے نور کو محض تیرے جسم تک محدود کر کے عام نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ بے شک تیرا نور فطری ادراک کے پردے میں چھپا ہوا ہے اور احساس و ادراک کے پردے میں چھپا ہوا ہے اور احساس و ادراک کا یہی پردہ دیدۂ بینا کے لیے ایک طرح کے غبار کی مانند بن گیا ہے۔ دراصل زندگی کی حقیقت فہم و ادراک میں نہیں بلکہ خود کو بھول جانے کے عمل میں ہے۔ زندگی تو ایک خواب، سرمستی اور اپنے وجود سے بیگانہ ہونے کا نام ہے۔

تیسرا حصہ   معنی: **بے پایاں:** بے کنارا۔ **ضو گستری:** روشنی پھیلانا۔ **طفلک نا آشنا:** بچہ۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو عالمِ ہست و بود ہے وہ حسن و خوبصورتی کے ایسے سمندر کی حیثیت کا حامل ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ لیکن اس کو دیکھنے کے لیے چشمِ بینا ضروری ہے کہ اس صفت کے حامل فرد کو پانی کی ایک بوند میں بھی حسن کا طوفان نظر آئے گا۔ یعنی حسن ہی حسن چاروں جانب بکھرا ہوا ہے۔

دیکھو تو سہی! حسن ان پہاڑوں میں بھی ہے جن کی چوٹیاں ہیبتناک خاموشی کی مظہر ہیں۔ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ سورج بھی اسی وقت روشنی دیتا ہے جب رات کی سیاہی اپنا وجود سمیٹ لیتی ہے۔ صبح کے لمحات میں جب آسمان نور اور روشنی کے ساتھ نظر آتا ہے تو یہ بھی حسن کا ایک منظر ہے اسی شفق کا نظارہ اور شام کے لمحات میں وارد ہونے والی تاریکی کو بھی حسن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

حسن تو ماضی کی عظمتوں کے ان آثار میں بھی موجود ہے جو اب مٹتے جا رہے ہیں اور وہ بچہ جو بولنے کی سعی کرتا ہے اسے بھی حسن کے ایک منظر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ باغوں میں یک آواز ہو کر جو پرندے چہچہاتے ہیں اور یہی ننھے ننھے پرندے جس طرح اپنے گھونسلے بناتے ہیں اس عمل میں بھی حسن موجود ہے۔ حسن تو پہاڑوں سے برآمد ہونے والے چشموں اور تیز رو دریاؤں کے علاوہ شہروں، صحراؤں، ویرانوں اور پھر آبادی میں غرض ہر جگہ حسن ہی حسن بکھرا ہوا ہے۔ ہر جانب حسن کی اس فراوانی کے باوجود انسانی روح کو نہ جانے کیوں کسی گم ہو جانے والی چیز کی تلاش ہے ورنہ وہ صحراؤں میں اس طرح سے سرگرداں و پریشاں کیوں رہتی۔ انسانی روح حیرت ہے کہ حسن کے اس عام جلوے میں بھی پریشاں نظر آئی ہے۔ اس کا وجود تو ایک ایسی مچھلی کی طرح ہے جسے پانی سے باہر نکال کر پھینک دیا گیا ہو۔

کنار راوی

048

سکوت شام میں محو سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیام سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سواد حرم ہوا مجھ کو
سر کنارۂ آب رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شراب سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامن شام
لیے ہے پیر فلک دست رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے، یہ سورج کے پھول ہیں گویا
کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی
منار خواب گہ شہسوار چغتائی
فسانۂ ستم انقلاب ہے یہ محل
کوئی زمان سلف کی کتاب ہے یہ محل
مقام کیا ہے، سرود خموش ہے گویا
شجر یہ انجمن بے خروش ہے گویا

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرم ستیز
سبک روی میں ہے مثل نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حد نظر سے دور گئی
جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

٭

پہلا حصہ معنی: محو سرود: گانے میں مگن۔ زیر و بم: نیچا اونچا۔ سواد حرم: کعبہ کے آس پاس کی

زمین۔

مطلب: اس نظم کا منظر نامہ دریائے راوی کا کنارہ ہے۔ اس مقام پر کھڑے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ ہر جانب شام کا سکوت طاری ہے۔ لیکن دریائے راوی کی موجوں کا شور نغمگی کا آئینہ دار ہے۔ اس لمحے جو کیفیت میرے دل کی ہے اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ دریا کی موجوں کا زیر و بم میرے لیے تو سجدے کا پیغام بن گیا ہے۔ میں تو اس عالم جذب میں ہوں کہ ساری دنیا مجھے خانہ کعبہ اور اس کے گرد و پیش سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں بہتے ہوئے اس دریا کے کنارے پر کھڑا ہوں تاہم اپنے خیالات میں اس قدر مگن ہوں کہ یہ بھی نہیں جانتا کہاں کھڑا ہوں۔

دوسرا حصہ معنی: دست رعشہ دار: کانپتا ہوا ہاتھ۔ **عظمت فزائے تنہائی:** تنہائی کی عظمت بڑھانے والے۔ **خواب گہ:** سونے کی جگہ مراد مزار۔ **شہسوار چغتائی:** مراد جہانگیر بادشاہ۔

مطلب: ان لمحات میں شفق کی سرخی شراب کی مانند شام کے دامن کو رنگین کر گئی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قرن ہا قرن سے گردش میں رہنے والے بوڑھے آسمان کے رعشہ زدہ ہاتھ میں شراب کا یہ جام آ گیا ہے۔ دن کا قافلہ عدم کی جانب تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے۔ مراد یہ ہے کہ آمد شام کے ساتھ دن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لمحے جو شفق پھولی ہوئی ہے اس کے لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس کی نوعیت تو سورج کے پھولوں کی طرح ہے۔ یعنی سورج کا سفر ختم ہو گیا ہے۔

اس منظر نامے میں شہنشاہ جہانگیر کے مقبرے کے مینار اپنی عظمت و شان کے ساتھ اس کنج تنہائی میں ایستادہ ہیں۔ یہی وہ مقبرہ ہے جہاں شہنشاہ جہانگیر ابدی نیند سویا ہوا ہے۔ یہ مقبرہ دیکھا جائے تو انقلابات زمانہ اور ان کے ظلم و ستم کا مظہر ہے یہی نہیں بلکہ اسے زمانہ ماضی کی تاریخ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ مقبرہ تو حقیقت میں ایک خاموش نغمے کی طرح ہے اور یہاں جو درخت موجود ہیں وہ ایسی محفل کی طرح ہیں جہاں کسی ہنگامے کا عمل دخل نہ ہو۔

تیسرا حصہ معنی: سفینہ: کشتی۔ **سبک روی:** تیز رفتاری۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ سامنے دریا میں ایک تیز رو کشتی رواں دواں نظر آ رہی ہے جس کا ملاح لہروں اور تند و تیز موجوں سے بچاتا اسے منزل مقصود کی جانب لیے جا رہا ہے۔ انسانی نگاہ کی رفتار جس قدر تیز ہے اسی رفتار سے آگے بڑھتی ہوئی یہ کشتی بالاخر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

دریائے راوی کے کنارے اور اس کے گرد و پیش کا مشاہدہ کرتے ہوئے اقبال اسے انسانی وجود سے یوں مربوط کرتے ہیں کہ جس طرح یہ کشتی دریائے راوی میں تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے بالکل یہی کیفیت انسان کی ہے کہ اپنی طبعی عمر تک پہنچنے کے بعد بھی ہر چند کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تاہم فنا نہیں ہوتا۔ مراد یہ کہ اس کی روح بے شک غائب ہو جاتی ہے تاہم وہ مرتا نہیں بلکہ ایک طرح کے منظر سے پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ بے شک یہ ایک بڑے تخلیق کار کا کمال ہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کے بطن سے بعض ایسی مطلق حقیقتیں برآمد کرتا ہے جن تک کسی دوسرے کی رسائی بلاشک و شبہ نہیں ہوتی چنانچہ یہی امر اقبال کی عظمت اور بڑائی کا بین ثبوت ہے۔

049 التجائے مسافر

(بہ درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ، دہلی)

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی
بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم، داغ لالہ زار تو ام
وگر کشادہ جبینم، گل بہار تو ام

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھکو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھکو
نظر ہے ابر کرم پر، درخت صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھکو
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھکو
مقام، ہمسفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھکو
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھکو
دلوں کو چاک کرے مثل شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھکو
بنایا تھا جسے چن چن کے خار و خس میں نے
چمن میں پھر نظر آئے وہ آشیاں مجھکو
پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھکو
وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھکو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں!
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھکو
وہ میرا یوسف ثانی، وہ شمع محفل عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جاں مجھکو
جلا کے جس کی محبت نے دفتر من و تو
ہوائے عیش میں پالا کیا جواں مجھکو
ریاض دہر میں مانند گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جان جاں مجھکو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

*

اقبال کی اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ یورپ روانگی سے قبل وہ دہلی تشریف لے گئے جہاں انہوں نے حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضری دی۔ چنانچہ یہ اشعار انہی کو مخاطب کر کے کہے گئے ہیں۔ اس حقیقت سے ہم سب آگاہ ہیں کہ اقبال ان صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کا ہمیشہ احترام کرتے تھے جو فی الواقع اپنے مراتب اور درجات کے اعتبار سے قربت خداوندی کے اہل تھے۔ چنانچہ یہ نظم التجا اور دعائیہ

لہجے میں کہی گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

پہلا حصہ معنی: **نظام مہر:** سورج کا نظام۔ **گل بہار توام:** تیری بہار کا پھول ہوں۔

مطلب: اے عالی مرتبت! (نظام الدین اولیاء) بے شک تو اتنا عظمت والا ہے کہ فرشتے بھی تیرا نام ادب و احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ اس لیے کہ تیرا دربار بھی بڑی عظمتوں کا حامل ہے جہاں سے ہر کہہ و مہہ کو فیض حاصل ہوتا ہے۔ جو حاملان عشق حقیقی ہیں ان کا وجود تیری کشش کے سبب بڑی اہمیت رکھتا ہے اور جس طرح آفتاب طلوع ہونے پر ساری کائنات کو روشنی عطا کرتا ہے اسی طرح تیری شخصیت بھی روشنی پھیلانے کا سبب ہے۔ آج تیری بارگاہ میں حاضری دی ہے تو یوں لگتا ہے کہ دل و دماغ کو روشنی حاصل ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ میرے نزدیک حضرت عیسیٰؑ اور حضرت خضر علیہ السلام سے بھی تیرا مقام بلند ہے۔ تو نے رب ذوالجلال سے ایسی لو لگائی ہے کہ اس نے بھی تجھے اپنے محبوب ہونے کا مرتبہ عطا کیا چونکہ تو رب العزت کا محبوب ہے اس لیے تیری شان بھی بلند ہے اور اسی باعث تو واجب الاحترام بھی ہے۔ لہٰذا اگر میں بدنصیب اور سیاہ قلب ہوں تو تیرے باغ میں موجود لالے کے پھول کے داغ کی مانند ہوں اور اگر خوش بخت ہوں تو تیرے چمن میں لہلاتے ہوئے پھول کی مانند ہوں مراد یہ ہے کہ میں جیسا بھی ہوں تیرا ہی معتقد ہوں۔

دوسرا حصہ معنی: **نکہت گل:** پھول کی خوشبو۔ **فلک نشیں:** آسمان کی بلندی۔ **نردباں:** سیڑھی۔ **خار و خس:** گھاس پھوس۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ اے محبوب الٰہی! کہ جس طرح چمن سے خوشبو رخصت ہوتی ہے اسی طرح میں اپنے وطن کو الوداع کہہ رہا ہوں۔ وطن سے دوری میرے صبر کا بے شک امتحان ہے جس میں اپنے آپ کو میں نے خود ہی ڈال لیا ہے۔ یہ تحصیل علم کا شوق ہی ہے جو مجھے اپنے خوبصورت وطن سے دور بلاد غیر میں لے جا رہا ہے۔

اے محبوب الٰہی! میرا وجود تو صحرا میں ایستادہ ایک ایسے خودرو شجر کی طرح ہے جس کی نظر ہمیشہ ابر کرم پر ہوتی ہے اور جسے کسی نوع کی غور و پرداخت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرا وجود اس عہد میں ایک ایسے فرد کی مانند ہے جس کی نگاہ ہمیشہ آسمان کی بلندی کی جانب ہوتی ہے تاہم تیری ایسی دعا کا طالب ہوں جس کے سبب مجھے وہ راستہ مل جائے جو منزل تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔

میرا مقام دوسرے لوگوں سے اس قدر آگے ہو کہ وہ اس مقام کو منزل مقصود سے تعبیر کر سکیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں اپنے قلم سے جو تحریر بھی لکھوں وہ کسی کی دل گرفتگی کا سبب نہ بنے اور نا ہی خود مجھ کو اس بھری پری دنیا میں کسی سے شکایت ہو۔ تیری جناب سے مجھے اپنی فریاد میں وہ اثر حاصل ہو جائے جو دلوں کو برما کر رکھ دے۔ میں نے جس محنت و کاوش سے اپنا گھر بنایا تھا خدا کرے وطن واپسی پر میں اسے اسی طرح آباد و کامراں دیکھ سکوں۔

اقبال فرماتے ہیں کہ جب میں یورپ سے تحصیل علوم کے بعد واپس وطن آؤں تو اپنے باپ اور ماں کے قدموں پر اپنی پیشانی رکھ سکوں کہ انہی کے طفیل مجھے محبت و شفقت کے رازہائے درون پردہ کا علم حاصل ہوا ہے۔ بعد کے تین اشعار میں اقبال اپنے استاد مولوی میر حسن کے لیے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰؓ کے خاندان کا وہ چراغ جس کا گھر میرے نزدیک کعبہ کے مانند ہے اس کی عنایت

و قدردانی نے مجھے علم و فضل کے جواہر سے آراستہ کیا۔ ان کے لیے دعا گو ہوں کہ وطن واپسی پر اپنے استاد کو خوش و خرم اور خوشحال دیکھوں۔

اس نظم کے باقی چار اشعار میں سے تین اشعار میں اقبال اپنے برادر بزرگ شیخ عطا محمد کے لیے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا بھائی مجھے حضرت یوسفؑ کی مانند عزیز ہے اس لیے کہ وہ مجھ سے عشق کی حد تک چاہت رکھتا ہے اور جس کی محبت میرے لیے ہمیشہ سکون قلب کا باعث رہی ہے جس نے میری پرورش کے دوران اپنے لیے عیش و آرام کو حرام سمجھا۔ وہ مجھے بے شک جان و دل سے زیادہ عزیز ہے۔ میری دعا ہے کہ میرا یہ بھائی اس دنیا میں ہمیشہ خوش و خرم رہے۔ آخری شعر میں اقبال یوں دعا کرتے ہیں کہ میرے دل کی کلی کھل کر پھول بن جائے اور مسافرت کے دوران دعائیہ انداز میں جو التجائیں کی ہیں اے محبوب الٰہی! تیرے توسط سے ان کی پذیرائی ہو۔

غزلیات

(حصہ اول)

اس حصے میں اقبال کی محض تیرہ غزلیں شامل ہیں جن کا تعلق ابتدائی دور کی شاعری یعنی 1904ء تک ہے۔ اقبال نے بعد میں جو غزلیں کہیں وہ "بانگ درا" اور دوسرے مجموعوں میں اسی ترتیب کے ساتھ شامل ہیں۔

050

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ — ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
آیا ہے تو جہاں میں مثال شرار دیکھ — دم دے نہ جائے، ہستی ناپائدار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں — تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ
کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ

چار اشعار پر مشتمل علامہ اقبال کی یہ غزل حصہ اول کی ان تیرہ غزلوں میں سے پہلی غزل ہے جو علامہ کے ابتدائی کلام سے تعلق رکھتی ہے۔ حصہ اول کی ان غزلیات کے بارے میں اسی قدر کہنا کافی ہو گا کہ یہ غزلیں اقبال کی بعد کی غزلوں سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح کہ بال جبریل اور ضرب کلیم کی شاعری "بانگ درا" سے مختلف ہے چنانچہ زیر تشریح غزل کے مطلع میں اقبال فرماتے ہیں۔

① **معنی: گلزار ہست و بود:** دنیا کے باغ۔

مطلب: کہ فنا و بقا سے مربوط دنیا کو اے باشعور انسان اجنبیوں اور بیگانوں کے انداز میں نہ دیکھ! یہ تو ایک ایسا عالم رنگ و بو ہے جسے بار بار دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس دنیا کے جملہ عناصر پر غور و خوض ہی لطف و مسرت کا سبب بن سکتا ہے۔

② **معنی: شرار:** مراد ناپائیدار ہستی۔

مطلب: غزل کے دوسرے شعر میں بھی انسان کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ دنیا میں تیرا وجود ایک ایسی چنگاری کے مانند ہے جس کی زندگی انتہائی مختصر ہوتی ہے بے شک تیری زندگی ہی بہت کم ہے ایسا نہ ہو کہ یہ زندگی تجھے فریب دے جائے اور تو اپنے حقیقی مقاصد کی تکمیل سے محروم رہے۔

③ **مطلب:** یہ شعر پہلے دو اشعار سے خاصا مختلف ہے۔ اس میں اقبال اپنے محبوب کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک میں تیرے التفات و توجہ کے قابل نہیں۔ پھر بھی میرے شوق اور انتظار کی کیفیت ایسی نہیں کہ بے اعتنائی برتی جا سکے۔

④ **مطلب:** اس امر میں شک کی گنجائش نہیں۔ جلوۂ محبوب کا نظارہ کرنے کے مذاق و شوق نے تیری آنکھیں کھلی رکھیں ہیں چنانچہ اگر اب مجھے ہر گلی کوچے میں نقش کف پائے یار نظر آ جائے تو پھر کوئی حیرت کی بات نہیں۔

(2)

051

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی / مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا / خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا / تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد / مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی؟
کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ / کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

*

① **معنی:** تکرار: اصرار۔ عار کیا تھی: کیا مضائقہ تھا۔
مطلب: اس غزل کے مطلع میں محبوب کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ میری دعوت پر بے شک تو نہ آتا نہ ہی ہمیں اس پر کسی بحث و تمحیص کی ضرورت تھی تاہم دل رکھنے کے لیے محض وعدہ ہی کر لیتا تو اس میں کیا قباحت ہوتی۔

② **مطلب:** اس شعر میں اپنے محبوب سے عاشق کہتا ہے کہ میں نے تو تمام معاملات عشق کو دوسروں سے پوشیدہ رکھا تھا اگر اس راز پر سے پردہ اٹھا تو اس کا ذمہ دار تیرا قاصد ہے۔ اس ضمن میں مجھے کسی طرح بھی خطاکار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس شعر میں "بندے اور سرکار" کی رعایت قابل ذکر ہے۔

③ **معنی:** تاڑا: پہچان لیا۔
مطلب: اے محبوب! تو نے تو بھری محفل میں سب کو نظرانداز کر کے صرف اور صرف اپنے عاشق کو ہی تاڑ لیا بے شک تیری آنکھیں مستی اور سرشاری کے باوجود بہت ہوشیار ثابت ہوئیں۔ عاشق کو تاڑنے کا عمل اس حقیقت کا مظہر ہے۔

④ **مطلب:** اس شعر میں عاشق اپنے محبوب کے پاس جانے والے قاصد سے استفسار کرتا ہے۔ بے شک تیرے کہنے کے مطابق اس نے میری دعوت کے بارے میں تامل سے تو کام لیا مگر اتنا ضرور بتا دے کہ اس کے انکار کا انداز کیا تھا۔ تاکہ حقیقت حال کا اندازہ کیا جا سکے۔

⑤ **مطلب:** اس شعر میں اقبال خداوند تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ جانے کس جذبے کے تحت کوہ طور کی جانب کھنچے چلے گئے۔ شاید یہ تیرا جلوہ دیکھنے کی کشش ہی تھی کہ انجام و عواقب سے بے نیاز ہو کر برق طور کی پروا بھی نہ کی۔

⑥ **معنی:** فسوں: جادو۔
مطلب: اے اقبال! اتنا بتا دے کہ تیری گفتگو میں کونسا سحر پوشیدہ تھا کہ محبوب کی بزم میں اب ہر لمحے تیرا ذکر خیر ہوتا رہتا ہے۔ مراد یہ ہو سکتی ہے کہ اقبال کی شعری صلاحیتوں سے ان کا محبوب اس قدر متاثر

ہے کہ ہر لمحے اس کی بزم میں ان کی شاعری کا چرچا ہی ہوتا رہتا ہے۔

(3)

052

عجب واعظ کی دینداری ہے یا رب عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے؟
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے! چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے
ہم اپنی دردمندی کا فسانہ سنا کرتے ہیں اپنے رازداں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

*

① **مطلب**: واعظ جو بزعم خود نیکی و پارسائی اور اخوت و مساوات کا دعویدار بنتا ہے جب کہ اس کا ذاتی کردار قطعی مختلف ہے۔ اس کے قول و فعل میں تضادات کا یہ عالم ہے کہ ہر نوع کی دینداری کے دعووں کے باوجود عملاً اسے اپنے سوا سارے جہان کے لوگوں سے عداوت ہے بالفاظ دگر اس کے دل میں نفرت کے سوا اور کچھ نہیں۔

② **مطلب**: آج کی دنیا میں بے شک عقلی اور ذہنی سطح پر انسان بے حد ترقی کر چکا ہے۔ بڑے بڑے سائنسدانوں اور موجدوں نے حیرت انگیز انکشافات اور ایجادات کی ہیں تاہم اب تک اس حقیقت کو کوئی بھی نہیں جان سکا کہ یہ جو انسان دنیا میں آتا ہے کہاں سے آتا ہے اور آخر کار جاتا کہاں ہے؟ یعنی تمام تر ذہنی اور شعوری ارتقاء کے باوجود انسان کی حقیقت ابھی تک پوشیدہ ہے۔

③ **مطلب**: یہ نظام قدرت ہے کہ شب کی سیاہی بھی اسی قوت کی ودیعت کردہ ہے جس نے ستاروں کو روشنی عطا کی ہے یعنی یہ رب ذوالجلال کے احکام کا کرشمہ ہے کہ تاروں کو روشنی بھی انہی کے تحت ملتی ہے اور رات کو تاریکی بھی وہیں۔سے فراہم ہوتی ہے۔

④ **مطلب**: ہم اس قدر دردمند واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے رازدار لوگ ہی اس ہمدردانہ رویے کا احوال بیان کرتے ہیں جو ہمارا دوسروں کے ساتھ رہا ہے جب کہ ہم اسے فراموش کر چکے ہوتے ہیں۔

⑤ **معنی**: چالیں: مکاریاں۔

مطلب: اس شعر میں اقبال واعظ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اس قدر چالاک و عیار شخص ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی کانپنے لگ جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ عمل محض دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

(4)

053

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے
بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کے لیے

وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے
میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لیے

آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و دو ملت سے تری
ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لیے

دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کروں
لوٹ جائے آسماں میرے مٹانے کے لیے

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو
آ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لیے

پاس تھا ناکامیِ صیاد کا اے ہم صفیر
ورنہ میں اور اڑ کے آتا ایک دانے کے لیے؟

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے

*

① **مطلب:** اس غزل کا مطلع اگر کلاسیکی روایت کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی ندرت نظر نہیں آتی لیکن اقبال کی تخلیقی اپچ کے حوالے سے جب اس کا جائزہ لیا جائے تو بقول اقبال اپنے گھر کی تعمیر کے لیے ایسے افراد کو جمع کر رہا ہوں جو ہمت اور پامردی کے ساتھ ان عناصر کے خلاف صف آرا ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں جو اس گھر کی تخریب کے درپے ہیں۔ دوسرے شعر میں وہ کہتے ہیں کہ میری محرومی کا یہ عالم ہے کہ میں نے اپنا آشیانہ بنانے کے لیے جس شاخ کا انتخاب کیا تھا فلک کج رفتار نے اسی شاخ کو مشقِ ستم بنایا۔

اس شعر میں اقبال افراد کی وسعت قلبی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اگر ہم سب مذاہب کو ایک ہی نظرے دیکھیں تو اختلاف اور تفرقہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس غزل کا چوتھا شعر بھی معنوی سطح پر مطلع کے مماثل ہے اس لیے اس کی تشریح بھی پہلے شعر کے مانند ہوگی۔ یہ عجیب بات ہے کہ غزل کا اگلا یعنی پانچواں شعر قدرے یہی مفہوم لیے ہوئے ہے جو مطلع اور چوتھے شعر کا ہے۔

معنی: ہم صفیر: ہم آواز، ہم نوا۔

مطلب: دراصل یہ پوری غزل ہی کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار میں جو مضامین باندھے گئے ہیں وہ بھی روایتی ہیں۔ چھٹے شعر میں اقبال اپنے کسی دوست کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ فی الوقت مجھے اپنے دشمن کی ناکامی کا پاس تھا ورنہ کسی پرندے کی طرح میں محض ایک دانے کی خاطر اپنی آزادی سے کیوں محروم ہوتا۔ آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ میرے وطن کی حالت زار ایسی ہے کہ یہاں آزادی کے ترانے الاپنا بے معنی سی بات ہے۔

(5)

054

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا؟
اور اسیرِ حلقۂ دام ہوا کیونکر ہوا

جائے حیرت ہے برا سارے زمانے کا ہوں میں
مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا؟
کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر
کیا خبر ہے تجھ کو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا؟
ہے طلب بے مدعا ہونے کی بھی اک مدعا
مرغ دل دام تمنا سے رہا کیونکر ہوا؟
دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے
پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا؟
حسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب
وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خودنما کیونکر ہوا؟
موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے دردِ فراق
چارہ گر دیوانہ ہے، میں لادوا کیوں کر ہوا؟
تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل
ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا؟
پرسش اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ، کیا ہوا؟ کیونکر ہوا
میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیونکر ہوا؟

*

① **معنی**: حلقہ دام: حرص کے جال میں پھنسا ہوا۔

مطلب: زیر تشریح غزل کے مطلع میں اقبال حضرت آدمؑ کے حوالے سے جنت سے نکالے جانے والے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کا حقیقی وطن تو جنت ہی تھا لیکن وہاں سے جس طرح اسے نکالا گیا اس کے بارے میں حقائق کا اظہار میرے لیے ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ بھی بتانا ممکن نہیں کہ زمین پر پہنچ کر انسان حرص و ہوس کے چنگل میں کیسے پھنس گیا۔

② غزل کے دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ جب سارا زمانہ انسان کو برا سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ مقام حیرت ہے کہ رب العزت نے اسے اشرف المخلوقات کا خطاب کیوں عطا کیا۔

③ اس شعر میں واقعہ طور کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر خداوند عز و جل سے اس کا جلوہ دکھانے کا جو تقاضا کیا تھا اور کہا تھا "رب ارنی" یعنی اے خدا اپنا جلوہ دکھا دے! تو خدا کی جانب سے اپنے پیغمبرؑ کو جواب ملا تھا کہ "لن ترانی" "اے موسیٰؑ! تو میرا جلوہ دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا چنانچہ ہوا بھی یہی کہ حضرت موسیٰؑ کے اصرار پر خدا نے اپنا جلوہ دکھایا تو وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ جلوہ دیکھنے اور دکھانے کا معاملہ کس طرح سے طے ہوا اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔

④ قلب انسان ہمیشہ آرزوؤں اور تمنا کا مسکن رہا ہے تاہم اگر انسان اس امر کا خواہاں ہو کہ اس کا دل ہر آرزو اور تمنا سے بے نیاز ہو جائے تو یہ امر کی آرزو اور تمنا کے مترادف ہے۔ اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ قلب انسان آرزوؤں اور تمناؤں سے خالی ہو جائے۔

⑤ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ جو نیک بندے معرفت الٰہی کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ تو دنیا میں بھی خدا کا جلوہ کسی نہ کسی طور دیکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ خدا نے قیامت کے روز اپنا جلوہ دکھانے کا جو وعدہ کیا ہے یقیناً صبر آزما ہونے کے ساتھ فہم انسانی سے بالاتر ہے۔

⑥ اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے ہزار پردوں میں خود کو چھپانے کے باوجود اپنی صفات کے حوالے سے ظاہر اور نمایاں کر دیا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہ حسن کامل ہے اور حسن کامل پردوں میں چھپا

نہیں رہ سکتا۔

⑦ محبوب سے ہجر و فراق کا مداوا بے شک میرے چارہ گر کے نزدیک کچھ نہ ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موت اس کا حقیقی مداوا ہے۔ مراد یہ ہے کہ موت کے ساتھ ہی ہجر و فراق کا مسئلہ بھی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

⑧ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ دیدۂ عبرت سے دیکھا جائے تو اس پر کوئی حیرت نہیں ہو گی کہ پھول پیدا تو مٹی سے ہوتا ہے اس کے باوجود اس کی پتیاں خوش نما رنگوں کی حامل ہوتی ہیں۔ یعنی انسان کی صحبت کتنی ہی بری ہو اس میں اچھا بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

⑨ اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو انسان کے گناہ و ثواب کا معاملہ ہے تو اس کا مقصد اس کی رسوائی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جب کہ خدا علیم و بصیر ہوتے ہوئے اس امر سے پوری طرح آگاہی رکھتا تھا کہ انسان سے جملہ گناہ ثواب کیسے اور کیوں سرزد ہوئے۔

⑩ اپنے محبوب سے ملاقات کے لمحات کا اندازہ تو دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے کہ میں اس پر کس طرح سے مرمٹا۔ یہ کیفیت زبان سے بیان کرنا ممکن نہیں۔

(6)

055

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب! رہنے والے ہیں

علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا' نرالے میرے نالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

امید حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

٭

① اس غزل کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو حاملانِ عشق و محبت ہیں اپنی وضع قطع کے اعتبار سے انہوں نے خود کو باقی دنیا کے لوگوں سے الگ تھلگ کیا ہوا ہے ان کو دیکھنے پر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ نہ جانے یہ لوگ کس دنیا کے باشندے ہیں؟ کہ ان کے طور طریقے تو دوسروں سے قطعی طور پر مختلف نظر آتے ہیں۔

② **معنی**: نوکِ سوزن: سوئی کی نوک۔

مطلب: اپنے دکھ درد کے علاج کے دوران میں اس لذت کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو درد میں ہوتی ہے۔ اسی سبب اپنے پاؤں کے آبلوں میں سے کانٹے نکالنے ہوں تو اس کے لیے بھی سوئی کا استعمال کرتا

ہوں جس سے تکلیف تو بے شک ہوتی ہے لیکن اس میں بھی یک گونہ لذت کا احساس ہوتا ہے۔

③ اے خدائے ذوالجلال! تجھ سے بس اتنی دعا ہے کہ میری آرزوؤں اور تمناؤں کو پھلا پھولا رکھ! اس لیے کہ ان کی پرورش کے لیے میں نے اپنا خون دیا ہے۔

④ راتوں میں جب میں ستاروں کو سناٹے کے عالم میں خاموش دیکھتا ہوں تو یہ صورت حال میرے لیے دل شکستگی اور آہ و زاری کا سبب بن جاتی ہے۔ میرے نزدیک ستاروں کی یہ خامشی کسی دکھ کے سبب ہے یہی وجہ ہے کہ میری سوچ دوسرے لوگوں سے مختلف ہے کہ اظہار عشق میں بھی ہائے وائے کرنے کی بجائے خامشی کا قائل ہوں۔

⑤ **معنی:** خانماں برباد: اجڑے گھروالا۔

مطلب: حقیقت یہ ہے کہ میری تباہی میں کسی دوسرے کا ہاتھ نہیں۔ اس کے برعکس میں نے تو خود ہی اپنے آپ کو تباہ و برباد کیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنے لیے سینکڑوں ٹھکانے بنائے اور بعد میں خود ہی ان کو نذر آتش کر دیا۔ یہ بربادی تو خود لذتیت کی مظہر ہے۔

⑥ غزل کے اس شعر میں اقبال انسان کی عمر فانی کے اختصار کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے ایک چنگاری کے مانند قرار دیتے ہیں کہ جس طرح آگ کی ایک چنگاری لمحے بھر کے لیے اپنے وجود کا احساس دلا کر پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں وہ چنگاری کو خطاب کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ جب ہم انسان اور تو یکساں خصوصیت کے حامل ہیں تو تیرے لیے یہ لازم نہیں کہ ہم سے بیگانگی کا اظہار کرے۔ تیری اور ہم انسانوں کی عمر قریب قریب یکساں ہی ہے۔

⑦ اقبال یہاں کہتے ہیں کہ یہ حضرت واعظ جو بظاہر سیدھے سادے اور بھولے بھالے نظر آتے ہیں عملاً یہ بڑے چالاک اور کائیاں ہیں ان کے ذہن میں تو ہر لمحے جنت کی حوروں کا تصور رقصاں رہتا ہے اور حوروں کے اس تصور نے ہی عملی سطح پر انہیں دنیاوی مسائل کے بارے میں بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ ان کی یہ جو خاموشی ہے وہ ایک طوفان کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

⑧ غزل کے مقطع میں اقبال خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے اشعار مجھ کو اتنے پیارے اور جان و دل سے زیادہ عزیز کیوں نہ ہوں اس لیے کہ یہ تو میرے دل شکستہ کے درد انگیز نالوں کی مانند ہیں یعنی مجھ پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کا اظہار اپنے اشعار میں کر کے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں اپنے اشعار کو بے حد عزیز رکھتا ہوں۔

(7)

056

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لب گویا پیام موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

میں انتہائے عشق ہوں' تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو' تماشا کرے کوئی

عذر آفرینِ جرم محبت ہے حسن دوست
محشر میں عذر تازہ نہ پیدا کرے کوئی

چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق، ہم نشیں! پھر اور کس طرح انھیں دیکھا کرے کوئی
اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

*

① **معنی**: وا کرے: کھولے۔

مطلب: زیر تشریح مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ اس عالم کون و مکاں پر نظر ڈالنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا اس مقصد کے لیے تو لازم ہے کہ اس نگاہ سے دیکھا جائے جو باطن میں بھی اتر جاتی ہے۔ مراد یہ کہ دنیا پر محض نگاہ غلط انداز ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اسے گہری تجزیاتی نگاہ سے دیکھنا ضروری ہے۔

② منصور حلاج نے اپنی زبان سے انا الحق کا نعرہ بلند کر کے معرفت خداوندی کی انتہا کر دی لیکن یہ نعرہ جو ایک طرح سے عشق کا دعویٰ تھا اس کے لیے موت کا پیغام بن گیا۔ سننے والوں نے اسی نعرے کی بنا پر منصور کو سولی پر چڑھا دیا۔ ایسی صورت میں کسی کے عشق کا دعویٰ موت سے ہمکنار ہونے کے مترادف نہیں تو بھلا اور کیا ہے؟

③ یہ شعر بھی مفہوم کے اعتبار سے مطلع سے ملتا جلتا ہے۔ یہاں اقبال کہتے ہیں کہ حقیقت مطلق تک رسائی کی خواہش ہے تو پھر اسے ظاہری آنکھ سے دیکھنے کی بجائے باطن کی نگاہ سے دیکھو کہ اپنے مقصود کی معرفت کا یہی ایک طریقہ ہے۔

④ اے میرے محبوب! جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو اس کی حدیں عشق کی انتہا سے جا ملتی ہیں اور تیرے حسن کی کیفیت بھی یہی ہے۔ اب تو یہ بتا کہ ان دو انتہاؤں کے پیش نظر دیکھنے والا مجھے دیکھے کہ تیرا نظارہ کرے۔ اسکے لیے تو یہ صورت حال تذبذب کا باعث بن جاتی ہے۔

⑤ **معنی**: عذر آفرین: بہانہ پیدا کرنے والا۔

مطلب: رب ذوالجلال کے جلوے کا تصور یہاں اس دنیا میں میرے عشق کے جذبے میں مزید شدت پیدا کر رہا ہے لیکن خدشہ اس امر کا ہے کہ روز قیامت بھی وہ اپنی رونمائی کے ضمن میں کوئی اور عذر نہ تراش لے ہر چند کہ خدا نے اس امر کا وعدہ کر رکھا ہے۔

⑥ محبت کی نظر سے اپنے محبوب کو کتنا بھی چھپ کر دیکھا جائے یہ نظر چھپ نہیں سکتی فوراً پہچان لی جاتی ہے۔ اس صورت میں اے میرے ہم نشیں! تو ہی بتا کہ میں اور کس انداز سے اپنے محبوب کو دیکھوں کہ کسی اور پر میری محبت کا راز افشاء نہ ہو سکے۔

⑦ اس غزل کا یہ شعر انتہائی خوبصورت ہے جس میں اقبال اپنے انداز میں کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے کوہ طور پر جلوہ دکھانے کی ضد کیا سمجھ کر کی جب کہ ان میں اتنی قوت برداشت نہ تھی ورنہ جلوہ دیکھتے ہی بے ہوش کیوں ہوتے۔ مراد یہ کہ جلوۂ خداوندی کا دیکھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ نہ جانے حضرت موسیٰؑ نے اس کے لیے اصرار کیوں کیا؟

⑧ **معنی:** **جنبش مژگاں:** پلکوں کا ہلنا۔

مطلب: حسن کے نظارے کے لیے تو پلک جھپکنا بھی بارے کم نہیں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ نرگس کے پھول کے مانند مسلسل ایک جانب ہی نگاہ رکھی جائے۔ چشم نرگس کا حوالہ اسی طور پر آتا ہے۔

⑨ **معنی:** **کھل جائیں:** منکشف ہوں۔ ظاہر ہوں۔

مطلب: میرا محبوب اگر میری طرح سے دو چار دن میرے عشق میں مبتلا رہنے کی زحمت گوارا کرے تو اس پر عشق میں جو مرحلے آتے ہیں وہ اس پر منکشف ہو جائیں۔

(8)

057

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

وہ میکش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراق ساقی نا مہرباں تک ہے

چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک
رہی بجلی کی بیتابی، سو میرے آشیاں تک ہے

وہ مشت خاک ہوں، فیض پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کی، زمیں سے آسماں تک ہے

جرس ہوں، نالہ خوابیدہ ہے میرے ہر رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقت رحیل کارواں تک ہے

سکون دل سے سامان کشود کار پیدا کر
کہ عقدہ خاطر گرداب کا آب رواں تک ہے

چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندی رسم فغاں تک ہے

جوانی ہے تو ذوق دید بھی، لطف تمنا بھی
ہمارے گھر کی آبادی قیام میہماں تک ہے

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

*

① **معنی:** **آرزوئے بیدلی:** دل دینے کا شوق۔ **زیاں:** نقصان۔

مطلب: میرے لیے اس امر کا انکشاف ناممکنات میں سے ہے کہ میرے دل میں مبتلائے عشق ہونے کی کتنی آرزو ہے۔ یوں بھی یہ حقیقت ہے کہ میں نے زندگی میں ہمیشہ خسارے کا سودا ہی کیا ہے۔ یہ خسارہ خواہ عشق میں ہو خواہ عام معاملات میں! بہرحال یہ خسارہ ہی میری تقدیر کا بنیادی عنصر ہے۔

② میں تو اس نوع کا شراب نوش ہوں کہ جس کا چہرہ نشے کی زیادتی کے سبب خود مانند گلاب سرخ ہو جاتا ہے۔ میرا نامہرباں ساقی جب شراب پلا کر مجھے مدہوش کر دیتا ہے تو میں خود اپنی ذات میں اس قدر محو ہو جاتا ہوں کہ مجھے پھولوں اور گلزار کی طرف دیکھنے کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔

③ **معنی:** **چمن افروز:** باغ کو رونق دینے والا۔

مطلب: زیر تشریح شعر میں اقبال ان آلام و مصائب کی نشاندہی کرتے ہیں جن سے انسان دوچار رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں چمن میں خوش الحانی سے نغمے گاتا رہوں گا صیاد میری تاک میں رہے گا اور پھر موقعہ ملتے ہی مجھے پابند قفس کر دے گا۔ اسی طرح بجلی بھی اسی وقت تک بیتاب و مضطرب رہے گی جب

تک کہ وہ میرا آشیانہ جلا کر خاک نہ کر دے۔

④ میں ایک ایسی مشت خاک کی مانند ہوں کہ منتشر ہو جاؤں تو صحرا بن جاؤں اور جہاں تک میری وسعت کا سوال ہے تو یوں سمجھ لو کہ زمین سے آسمان تک احاطہ کیے ہوئے ہوں اس شعر میں انسان کی جملہ صلاحیتوں کی ایک طرح سے نشاندہی کی ہے۔

⑤ **معنی:** رحیل: کوچ۔

مطلب: میں قافلے کی ایک ایسی گھنٹی کے مانند ہوں جس کی نس نس میں ایک خاموش فریاد چھپی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ ابھی میرا قافلہ (قوم) منتشر اور افتراق کا شکار ہے تو مجھے بھی خامشی اختیار کرنا پڑ رہی ہے جوں ہی میرا قافلہ منظم ہو کر اپنی منزل کی جانب گامزن ہوا میں بھی متحرک ہو جاؤں گا۔

⑥ **معنی:** کشود کار: مطلب حاصل کرنا۔

مطلب: اقبال اس شعر میں اہل قافلہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر تم مسائل سے عہدہ برآ ہو کر اپنے لیے سہولتیں اور آسانیاں فراہم کرنے کے خواہاں ہو تو اس امر کی ضرورت ہے کہ اطمینان قلب حاصل کر لو کہ پانی میں گرداب یعنی بھنور اسی وقت تک پڑتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ رواں دواں رہتا ہے اور جوں ہی اس کی روانی ختم ہوئی اور وہ ایک مقام پر ٹھہر گیا تو بھنور پڑنا بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مشکلات بھی انسانی زندگی میں اس وقت تک برقرار رہتی ہیں جب تک وہ منتشر ہو لہٰذا سکون قلب کے حصول کی خاطر یہ امر ناگزیر ہے کہ انتشار اور افتراق کا خاتمہ کیا جائے۔

⑦ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ عشق و محبت میں خموشی موت کے مترادف ہے اس کو زندہ رکھنا ہے تو پھر نالہ و فریاد بھی ناگزیر ہے کہ یہی عشق و محبت کی بنیادی رسم ہے۔

⑧ انسان جب تک عالم شباب کا حامل ہوتا ہے تو محبوب کے دیکھنے کا لطف اور اس کے حصول کی تمنا بھی برقرار رہتی ہے اور جب شباب ہی رخصت ہو جائے تو اس نوع کے جذبے فطری طور پر دم توڑ دیتے ہیں۔

⑨ غزل کے اس آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میں دنیا بھر میں بدنام اور رسوا ہو چکا ہوں تاہم یہ احمقانہ سوچ میرے ذہن پر حاوی ہے کہ میرے عشق کی داستان محض میرے رازداں کے سوا اور کسی کو بھی معلوم نہیں جب کہ اس کا انکشاف سارے زمانے پر ہو چکا ہے۔

(9)

058

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

اگر کچھ آشنا ہوتا مذاق جبہ سائی سے
تو سنگ آستان کعبہ جا ملتا جبینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں؟
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

تمنا درد دل کی ہو تو خدمت کر فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ترستی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہیں خلوت گزینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمن دل کو
کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں؟

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ما عرفنا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

برا سمجھوں انہیں؟ مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

*

① **معنی:** ظلمت خانہ: اندھیرا گھر۔

مطلب: اٹھارہ اشعار پر مشتمل یہ غزل اقبال کی طویل غزلوں میں سے ایک ہے۔ اس کے مطلع میں وہ کہتے ہیں کہ خدائے وحدہ' لاشریک تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میں زمینوں اور آسمانوں کو کھنگالتا رہا جب کہ ذرا گہرائی سے دیکھا تو وہ میرے دل میں ہی موجود تھا۔ اس لمحے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ خدا تو انسان کے دل میں ہی رہتا ہے تاہم اس حقیقت کے ادراک کے لئے معرفت کا شعور بنیادی شرط ہے۔

② اس شعر کا مفہوم بھی کم و بیش پہلے شعر سے ملتا جلتا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جب مجھے اس امر سے آگاہی ہوئی کہ میری حقیقت کیا ہے تو اس امر کا علم بھی ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو خود میرے دل میں موجود ہے۔ مراد یہ ہے کہ رب ذوالجلال کو پانے کے لیے اپنی حقیقت تک رسائی بھی ناگزیر ہے۔

③ **معنی:** جبہ سائی: سجدہ کرنا۔

مطلب: اس شعر میں کہا گیا ہے کہ خانہ کعبہ کا وہ پتھر جس کی جانب رخ کر کے ہم سجدہ ریز ہوتے ہیں اگر اس میں بھی یہ جذبہ اور ذوق موجود ہوتا تو متحرک ہو کر خود ہماری پیشانیوں سے ہم آہنگ ہو جاتا۔

④ اس شعر میں مجنوں کو مخاطب کر کے اقبال استفسار کرتے ہیں کہ اتنا بتا دے کہ محض عشق میں مگن رہنے کے سوا کبھی تو نے اپنی ذات میں بھی جھانک کر دیکھا ہے اس لیے کہ میرے نزدیک تو تو بھی اسی طرح پردے میں چھپا ہوا ہے جس طرح کہ تیری محبوبہ لیلیٰ محمل نشین تھی۔ مراد یہ ہے کہ کوئی شخص بھی اس وقت تک خود کو نہیں پہچان سکتا جب تک کہ وہ اپنی ذات سے باہر نکل کر خود کو نہ دیکھے۔

⑤ اس شعر میں اقبال محبوب سے وصل اور فرقت کے معاملات کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب محبوب سے وصال یعنی ملاپ کے مواقع عاشق کو حاصل ہوں تو مہینے بھی پر لگا کر چند لمحوں میں اڑ جاتے ہیں جب کہ اس سے جدائی کے چند لمحات بھی مہینوں پر محیط دکھائی دیتے ہیں۔

⑥ اے ملاح! جب ڈوبنا ہی میرا مقدر ٹھہرا تو سمندر میں کودنے سے بھلا تو مجھے کس طرح روک سکے گا۔ اس لیے کہ ڈوبنے والے تو کشتی میں بیٹھے بٹھائے بھی ڈوب جاتے ہیں۔

⑦ رب ذوالجلال نے بے شک اپنے پیغمبر حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر اپنا جلوہ دکھانے سے گریز کیا بلکہ اس کا وجود تو دنیا کی ہر خوبصورت چیز میں پوشیدہ ہے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں میں معرفت الٰہی کی صلاحیت موجود ہے وہ تو اس کا جلوہ ہر حسین شے میں دیکھنے کے اہل ہوتے ہیں۔

⑧ اے رب ذوالجلال! یہ تو بتا کہ اہل دل کے سینوں میں وہ کون سی قوت پوشیدہ ہو سکتی ہے جو اپنی ایک پھونک سے بجھی ہوئی شمع کو پھر سے روشن کر سکتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان لوگوں میں تو نے ایسی کون سی صلاحیت پیدا کی ہے جو ناممکن کو ممکن بنانے کی اہل ہوتی ہے۔

⑨ اگر تجھے جذبہ عشق کے حصول کی تمنا ہے تو پھر ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے ان درویشوں کے پاس جا جو ہر شے سے بے نیاز ہو کر عبادت خداوندی کے علاوہ عام انسانوں کے کام آتے رہتے ہیں۔ یہ جان لے کہ جذبہ عشق ایسا جوہر ہے جو کسی بادشاہ کے خزانے میں نہیں مل سکتا کہ یہ خزانے تو محض ہوس کی آماجگاہ ہیں۔

⑩ **معنی: خرقہ پوشوں:** گدڑی پہننے والے یعنی درویش۔

مطلب: ان گدڑی پوش لوگوں کے بارے میں تحقیق و تجسس بے معنی بات ہے۔ اے شخص! اگر تجھے ان سے کچھ عقیدت و محبت ہے تو یہ راز خود ہی تجھ پر منکشف ہو جائے گا کہ یہ لوگ تو معجز نما ہیں اور اپنی آستینوں میں معجزے چھپائے بیٹھے ہوتے ہیں۔

(11) یہ شعر بھی دسویں شعر کا ایک طرح سے تسلسل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ آنکھیں جن کی حقیقت تک رسائی نہیں وہ ان گدڑی پوشوں کے نظارے کو ترستی رہیں گی حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہی خلوت نشین گدڑی والے بزرگوں سے ہی اس دنیا کی رونق قائم ہے۔ ان کے بغیر تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

(12) . **معنی: خوشہ چینوں:** خوشے چننے والے یعنی فیض حاصل کرنے والے۔

مطلب: اقبال اس شعر میں یوں گویا ہیں کہ اے میرے حبیب تو اس کائنات کی حقیقت جاننے کا خواہاں ہے تو تو اپنے خرمن دل کو ایسی چنگاری سے پھونک دے کہ آفتاب کو بھی تجھ پر رشک آئے اور وہ بھی تیرے خوشہ چینوں میں شمار ہو سکے۔ مراد یہ ہے کہ کائنات کا احوال جاننے کے لیے اس علم کی روشنی حاصل کر جو آفتاب کے لیے بھی رشک کا سبب بن جائے۔

(13) اگر تجھے طلب عشق ہے تو وہ حساس دل تلاش کر جو شکستگی کا آئینہ دار ہو کہ عشق و محبت تو ایسی حقیقتیں ہیں جو انتہائی نازک اور حساس عوامل سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ مراد یہ کہ عشق ہر کہ ومہ کے بس کا روگ نہیں۔ یہ تو ایسے دل میں جگہ پا سکتا ہے جو نازک آبگینوں کی مانند ہوتے ہیں۔

(14) **معنی: ماعرفنا:** اشارہ ہے کہ ہم نے تجھے اس طرح نہیں پہچانا جس طرح پہچاننے کا حق تھا۔

مطلب: اے دل! یہ تو بتا کہ اس دنیا کے خوبصورت لوگوں میں کیا کوئی ایسا حسین وجود بھی ہے جو ان خوبصورتیوں کو دیکھ کر خود بھی سراپا حسن میں ڈھل جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا وجود تخیلی حیثیت کا حامل ہی ہو سکتا ہے۔

(15) زیر تشریح غزل میں یہ شعر عملاً نعتیہ ہے جس میں حضور سرور کائنات ﷺ کے اس ارشاد کی جانب اشارہ ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہم نے خدائے بزرگ و برتر کو پہچانا تو ضرور! تاہم اس طرح سے نہیں پہچانا جیسا کہ اس کا حق تھا۔ چنانچہ سرکار دو عالم کا یہ عجز خالق حقیقی کو بہت بھایا اور اس نے حضور ﷺ کا مقام و مرتبہ دنیا بھر کے خوبصورت لوگوں سے بڑھا دیا اور ان کے مراتب مزید بلند کر دیئے۔

(16) یہ نعتیہ شعر بھی پہلے شعر کا تسلسل ہے جس میں اقبال حضور سرور کائنات ﷺ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ دنیا بھر کے فلسفی اور دانشور ایک عرصے سے آپ کی ذات والا صفات اور مراتب کے حوالے سے تذبذب میں مبتلا ہیں۔ یہ ان پر کرم ہو گا اگر حضورؐ خود ہی ان کو اپنا جلوہ دکھا دیں تو ساری صورتحال ان کی سمجھ میں آ جائے گی۔

(17) اقبال یہاں کہتے ہیں کہ اے دل ناصبور! تجھے تو اپنے محبوب سے حقیقی عشق کا دعویٰ ہے اس کے باوجود تو بھری محفل میں نالہ و فریاد کر رہا ہے۔ حالانکہ جو لوگ عشق و محبت کے دعویدار ہوتے ہیں انہیں اس حقیقت کا ادراک بھی یقیناً ہوتا ہے کہ محبت کے جو قرینے ہیں ان میں ادب و احترام اولین قرینہ ہے۔

(18) اس غزل کے مقطع میں اقبال یوں گویا ہیں کہ جو لوگ میرے نکتہ چیں اور ناقد ہیں ان کو میں کس طرح برا کہہ سکتا ہوں جب کہ میں تو خود اپنی ذات کے نکتہ چینوں اور ناقدوں میں سے ہوں۔

(10)
059

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں　　مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدہ بے حجابی　　کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو　　کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا　　وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل　　چراغ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

٭

① معنی: عشق کی انتہا: انتہائی محبت۔ سادگی: بھولا پن۔

مطلب: اس غزل کے مطلع میں محبوب سے مخاطب ہو کر شاعر کہتا ہے کہ میں تیرے عشق کے ان انتہائی مراحل تک رسائی حاصل کرنے کا خواہاں ہوں جن سے آگے اور کچھ نہیں ہے لیکن یہ خواہش

میری سادگی کے علاوہ بظاہر کچھ اور نظر نہیں آتی۔

② **معنی**: وعدۂ بے حجابی: بے نقاب ہونے کا وعدہ۔ صبر آزما: صبر آزمانا۔

مطلب: میرے نزدیک ظلم و ستم اور وعدے وعید ایک ہی نوعیت کے ہیں کہ عشق و محبت میں یہی کچھ ہوتا ہے اور اسی قسم کی توقعات رکھی جانی چاہئیں!

③ بہشت کا تصور تو زاہدوں کو ہی مبارک ہو کہ ان کا زہد و تقویٰ اسی مقصد کا حامل ہوتا ہے جب کہ میرے تو اپنے محبوب سے ملاقات ہی کافی ہے۔ یہ ملاقات ہی میرے لیے جنت سے کم نہیں۔

④ **معنی**: لن ترانی: تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

مطلب: ہر چند کہ میرا دل مختصر سا ہے لیکن اس میں جو تمنا موجزن ہے وہ یہی کہ اپنے محبوب سے بار بار ملاقات کے وعدے وعید اور پھر ان سے انکار کا تذکرہ سنوں۔

⑤ اے دنیا والو! میں تو اب صرف چند گھڑی کا مہمان ہوں۔ میری کیفیت تو صبح کے چراغ کی مانند ہے جو کسی لمحے بھی بجھ سکتا ہے۔

⑥ **معنی**: راز کی بات: معشوق کی مہربانی کا تذکرہ۔

مطلب: غزل کے اس آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میں تو اس قدر منہ پھٹ واقع ہوا ہوں کہ جو باتیں دوسروں سے چھپا کر رکھنے کی ہوتی ہیں ان کو بھی بھری بزم میں منکشف کر دیا یقیناً یہ عمل ایک جرم کے مترادف ہے۔ مجھے اس کی سزا ملے تو بے شک میں یہ سزا بھگتنے کو ہر طرح سے تیار رہوں۔

(11)

060

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی
جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے

مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا
جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت' وہ بے نیاز کرے

سخن میں سوزِ الٰہی کہاں سے آتا ہے
یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل
جہاں میں وانہ کوئی چشمِ امتیاز کرے

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

*

① **معنی**: بے نیاز: مراد ہے خدا۔ نیاز مند: انسان' بندہ۔

مطلب: اس غزل کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ خدائے عزوجل جب انسان پر کرم نوازی کرتا ہے تو وہ جو

بے شک مجبور اور تہی دامن ہے اس انسان کو تو اس کرم نوازی پر فخر و ناز ہونا چاہیے۔

② **معنی:** احتراز: پرہیز کرنا۔

مطلب: اقبال نے اس شعر میں واعظ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نازک مسئلے کو بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں چھیڑا ہے۔ ان کے مطابق واعظ اپنی تقریروں میں بار بار اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ خدائے تعالیٰ آسمان پر مقیم ہے۔ اقبال اس مفروضے پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ خدا ہی کیا جو اپنی مخلوق سے احتراز کرتے ہوئے اتنی دور جا بیٹھا ہے حالانکہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا خدا تو وہ ہے جو صرف آسمان پر ہی نہیں ہر جگہ موجود ہے۔ اقبال کے بقول واعظوں نے تو خدا کے وجود کو بھی محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ امر ان کی تنگ نظری کے سوا اور کیا ہے؟

③ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ میرے نزدیک وہ بادہ نوش صحیح معنوں میں بادہ نوش نہیں ہو سکتا جو ہوش اور مستی کی کیفیتوں میں تمیز کرنے کا اہل ہو۔ مراد یہ ہے کہ حقیقی بادہ نوش وہی شخص ہے جو ہر لمحے مست و سرشار رہے حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر دے اور سب کچھ بھول جائے۔

④ اے انسان تیرے لیے لازم ہے کہ ہر لمحے مستعد اور دل کی آواز کی طرف متوجہ رہے کہ جب یہ شکستگی کے عمل سے گزرتا ہے تو پھر اسرار حیات منکشف ہونے لگتے ہیں۔

⑤ کوئی حضرت واعظ سے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا کرے کہ اگر رب العزت کسی گناہ گار پر کرم نوازی کرتا ہے تو حضرت! یہ فرمائیے کہ اس میں آپ کا نقصان کیا ہے؟ مراد یہ کہ واعظان کرام کا طرز عمل تو یہی ہے کہ وہ لوگوں کو جرم و گناہ کے حوالے سے اپنی تقریروں میں خوفزدہ کرتے رہتے ہیں جب کہ خدا رحیم بھی ہے کریم بھی۔

⑥ اقبال اس شعر میں خالق کائنات سے استفسار کرتے ہیں کہ شعر و سخن میں جو سوز پیدا ہوتا ہے اس کے محرکات کیا ہیں؟ اس لیے کہ سوز تو ایسی حقیقت ہے جو انسان تو انسان پتھر کو بھی پگھلا کر رکھ دیتا ہے۔

⑦ بلبل کو گلاب کے پھول سے تو عشق ہے اور لالے کے پھول سے بے تعلق رہتی ہے۔ گلاب کے مرجھانے پر اسی لیے وہ اداس ہو جاتی ہے چنانچہ اگر وہ دوسرے پھولوں کو بھی گلاب کی مانند چاہے تو پھر اس کو نالہ و فریاد کی ضرورت نہ ہوگی مراد یہ کہ اس نوع کا امتیازی سلوک مناسب نہیں ہوتا۔

⑧ **معنی:** زباں دراز: برا بھلا کہنا۔

مطلب: یہ عبادت و زہد کا غرور ہے جو حضرت واعظ کو دوسرے بندگان خدا کے خلاف زبان دراز کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

⑨ غزل کے مقطع میں اقبال اس تمنا کا اظہار کرتے ہیں کہ کوئی ہوا ایسی آئے جو مجھے ہندوستان سے اڑا کر مدینے کی طرف لے جائے! مراد یہ ہے کہ خدا کرے وہ سعادت نصیب ہو کہ ہندوستان سے مدینے کے لیے عازم سفر ہوں۔

(12)

061

سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں، جاہل ہوں میں

میں جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی — جو نمود حق سے مٹ جاتا ہے' وہ باطل ہوں میں
علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست — وائے محرومی! خزف چین لب ساحل ہوں میں
ہے مری ذلت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل — جس کی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں
بزم ہستی! اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو — تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

*

① **معنی:** ظالم ہوں میں' جاہل ہوں: قرآن پاک میں ہے کہ انسان ظالم اور جاہل ہے۔

مطلب: زیر تشریح غزل کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ اپنے دشمن کی ہر زیادتی کو نظرانداز کر کے میں خود اپنی ذات پر ایک طرح سے جبر کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود اس امر کا طعنہ دیا جاتا ہے کہ میں ظالم اور جاہل ہوں۔ مراد یہ ہے کہ میری رواداری کا عالم یہ ہے کہ اپنے دشمن کی ہر زیادتی کو نظرانداز کر کے خود اپنی ذات کو ہی ہدف بنائے ہوئے ہوں۔ اس پر بھی یہ الزام تراشی کہ میں ظالم بھی ہوں اور جاہل بھی! یہ رویہ میرے کرم فرماؤں کا کس قدر افسوس ناک اور باعث شرم ہے۔

② اس شعر میں اقبال حق تعالیٰ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا وجود ان لمحات تک ہی برقرار تھا جب تک کہ تو نے اپنا جلوہ نہیں دکھایا تھا۔ دراصل میری ذات تو ایسے باطل کی طرح ہے جو سچائی کے نمودار ہوتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ میں نے جلوۂ خداوندی کا ادراک حاصل ہوتے ہی خود کو اس میں ایسے جذب کر لیا جیسے حقیقت کے نمودار ہوتے ہی جھوٹ غائب ہو جاتا ہے۔

③ **معنی:** غوطہ زن: مراد ہے طالبان علم۔ گوہر بدست: موتی لے کر۔ خزف: چنا۔

مطلب: اگر علم کو ایک دریا تصور کر لیا جائے تو اہل طلب اس دریا میں غوطہ لگا کر جب سطح پر برآمد ہوئے تو وہ علم سے مالامال تھے۔ اس کے برعکس میری کیفیت یہ تھی کہ میں اس دریا کے کنارے کھڑا کنکر چنتا رہا۔ مراد یہ کہ میں نے حصول علم کے لیے کوئی تگ و دو نہ کی چنانچہ یہ فطری امر ہے کہ اس دولت سے محروم رہا۔

④ اس شعر میں اقبال نے حضرت آدمؑ کے جنت سے نکلنے کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ تذلیل عملاً میری شرافت کی دلیل بن گئی کہ اپنی غفلت کے سبب جب مجھے جنت سے نکلنے کا حکم دیا گیا تو اس حکم پر فرشتے بھی گریاں کناں ہوئے تھے۔

⑤ اے دنیا! نہ جانے کس لیے تجھے اپنی آرائش و زیبائش پر اس قدر فخر و غرور ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تو جس محفل کا پرتو ہے وہ محفل میں ہی تو ہوں۔ مراد یہ ہے کہ انسان کا وجود ہی دراصل دنیا کی آرائش و زیبائش کا سبب ہے۔ انسان نہ ہو تو یہ دنیا ایک ویرانہ بن کر رہ جائے۔

⑥ غزل کے مقطع میں اقبال خودشناسی کے عمل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں تو خود ہی اپنے وجود کی تلاش میں سرگرداں ہوں حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ میں تو خود ہی مسافر اور خود ہی منزل ہوں۔ یہ شعر اپنی معنویت کے اعتبار سے انسانی وجود کے لیے اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اگر انسان

خودشناس ہو تو وہی سب کچھ ہوتا ہے۔

(13)

062

مجنوں نے شہر چھوڑا' تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

واعظ! کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ' خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

مانند خامہ تیری زباں پر ہے حرف غیر
بیگانہ شے پہ نازش بیجا بھی چھوڑ دے

لطف کلام کیا جو نہ ہو دل میں درد عشق
بسمل نہیں ہے تو' تو تڑپنا بھی چھوڑ دے

شبنم کی طرح پھولوں پہ رو' اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے

ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
بتخانہ بھی' حرم بھی' کلیسا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں' یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جینا وہ کیا جو ہو نفس غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

شوخی سی ہے سوال مکرر میں اے کلیم
شرط رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

*

① اس غزل کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ اگر مجنوں نے اپنی محبوبہ لیلیٰ کے عشق میں شہر کو چھوڑ کر صحرا میں ڈیرہ جما لیا تھا تو یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ لطف تو جب آتا کہ وہ شہر کی طرح صحرا کو بھی ترک کر دیتا۔ پھر اگر اسے رب ذوالجلال کا جلوہ دیکھنے کی خواہش تھی تو پھر لیلیٰ کے تصور سے بھی دستبردار ہونا ضروری تھا۔ مراد یہ ہے کہ دنیوی عشق کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے عشق کی آرزو ہے تو اس خالق کائنات سے کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

② اس شعر میں وہ واعظ کو خطاب کرتے ہوئے یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ اگر ترک علائق ہی تیرا کمال ہے اور اسی حوالے سے تو دنیا کو چھوڑنے پر مصر ہے تو پھر عقبیٰ کے تصور کو بھی چھوڑ دے کہ خالق کائنات تک رسائی تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنی تمام خواہشات اور تمناؤں کو ترک کر کے اس سے لو لگا لے۔

③ : **معنی: تقلید**: پیروی کرنا۔

مطلب: اس شعر میں کہا گیا ہے کہ کسی دوسرے کی تقلید اور پیروی سے تو بہتر یہی ہے کہ انسان خودکشی کر لے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے اپنا راستہ بھی تلاش کیے جائے اور وہاں تک رہنمائی کے لیے حضرت خضرؑ کی امداد کا تصور بھی ترک کر دیا جائے کہ اسی صورت میں انسان اپنی ذاتی جدوجہد کے ذریعے منزل تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

④ معنی: خامہ: قلم۔
مطلب: زیر تشریح شعر میں اقبال قلم کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قلم سے علم و حکمت کی کیسی کیسی باتیں رقم ہوتی ہیں لیکن یہ کمال دیکھا جائے تو قلم کا نہیں بلکہ اس لکھنے والے کا ہے جو اس قلم کے ذریعے دانش و حکمت کے جواہر بکھیرتا ہے۔ قلم تو محض اظہار کا ایک ذریعہ ہے لہٰذا اگر انسان زندگی میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس کے لیے خود جدوجہد کرے۔ دوسروں کے عمل کی تقلید پھر اس پر فخر و مباہات تو بے معنی بات ہے۔ یہ رویہ کبھی بھی اپنانا نہیں چاہیے اسی عمل میں انسان سرخروئی حاصل کرتا ہے۔

⑤ اگر دل میں عشق کا درد موجود نہیں تو شعر و سخن میں بھی سوز اور حقیقت کے رنگ نہیں بھرے جا سکتے۔ اس کی مثال یوں ہو سکتی ہے کہ وہی شخص تکلیف اور درد کے باعث تڑپتا ہے جو فی الواقع زخموں سے نڈھال ہو۔ دراصل اس شعر میں اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ تخلیقی عمل کو لکھنے والے کے خیالات و جذبات کا ترجمان ہونا چاہیے۔ اسی کے سبب تحریروں میں حقیقت کا رنگ بھرا جا سکتا ہے۔

⑥ زیر تشریح شعر ترک دنیا کے حوالے سے کہا گیا ہے۔ اس میں اقبال کہتے ہیں کہ دنیا میں قیام انسان کے لیے ایک عارضی حیثیت کا حامل ہے۔ بالآخر چند روزہ زندگی کے بعد جب موت کو گلے ہی لگانا ہے تو پھر اے انسان شبنم کی پیروی کر کہ وہ چند لمحوں تک پھولوں پر آنسو بہا کر باغ سے اڑ جاتی ہے۔ تو بھی یہی طرز عمل اختیار کر لے۔ اور اس چند روزہ زندگی کا جنون چھوڑ دے۔

⑦ عشق و عاشقی کی رسم تو یہی ہے کہ ہر شے کو ترک کر کے انسان گوشہ تنہائی اختیار کر لے۔ لہٰذا تو بھی اسی طرز عمل کی پیروی کرتے ہوئے بتخانہ، کعبہ اور کلیسا سب کو چھوڑ کر اپنی دنیا الگ بسا اور خالق حقیقی سے لو لگا لے۔

⑧ رب ذوالجلال کی عبادت تو صمیم قلب سے کی جانی چاہیے۔ اس عمل کے لیے محض جزا کو پیش نظر رکھنا خلوص دل سے عبادت کے منافی ہے۔ بلکہ بالفاظ دگر یہ تو ایک طرح سے سوداگری کے مترادف ہے۔ یوں بھی عبادت سوداگری نہیں ہوتی۔ اگر دل میں خلوص ہو تو پھر جزاء اور انعام کا تصور بے معنی شے بن جاتا ہے۔

⑨ معنی: پاسبان عقل:
مطلب: یہ امر بڑی حد تک مناسب ہے کہ مسئلہ کوئی بھی ہو اس کو بروئے کار لانے کے عمل میں دل اور عقل کے مابین رابطہ برقرار رہے اس کے باوجود کبھی کبھی یہ بھی مناسب ہوتا ہے کہ عقل کی بجائے محض اس جذبے کے تحت کام کیا جائے جس کا تعلق محض دل سے ہو۔

⑩ ایسی زندگی قطعی طور پر بے معنی ہوتی جس کا انحصار دوسروں پر ہو۔ چونکہ شہرت کا تعلق بھی دوسروں کی امداد و سرپرستی سے ہے اس لیے شہرت کی تمنا ترک کر کے اپنے لیے راستہ خود ہی بنانا چاہیے۔

(11) حضرت موسیٰ نے جلوۂ خداوندی کے لیے جو بار بار تقاضا کیا تو ان کا یہ عمل محض شوخی ہی نہیں بلکہ سوئے ادب کے مترادف تھا۔ حق تعالیٰ کی رضا کا پاس تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ جو چاہے اس کے روبرو سر خم کر دیا جائے۔

(12) معنی: مے کے جواز میں: شراب پینے کو جائز قرار دینا۔
مطلب: زیر تشریح غزل کے مطلع سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہاں بھی حسب معمول اقبال واعظوں کے کردار سے بری طرح نالاں ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ شخص شراب نوشی کے جواز میں کوئی ثبوت بھی لے آئے تو میں اس کی مخالفت کرتے ہوئے شراب پینا ترک کر دوں گا۔ بقول ان کے واعظ کا کردار تو بس یہ ہے۔

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آواز اذاں سے

حصہ دوم

(1905ء سے 1908ء تک)

063-1

"بانگ درا" کے حصے میں اقبال کی وہ تخلیقات شامل ہیں جو 1905ء سے 1908ء تک تین سال کے دوران منصۂ شہود پر آئیں۔ اس حصے کی منظومات میں بھی زیادہ تر کلاسیکی رنگ غالب ہے۔ تاہم بیشتر مقامات پر اقبال کا لہجہ ان کی بعد کی شاعری سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

محبت

063-2

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے

قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلم سے

ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے

سنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیاگر تھا
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے

لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے

نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیاگر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے

بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے

پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے

چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے

تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیحِ ابنِ مریمؑ سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

مہوس نے یہ پانی ہستیِ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے

ہوئی جنبش عیاں، ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

*

① اقبال کی یہ نظم اگرچہ ان کی ابتدائی تخلیقات میں سے ایک ہے۔ تاہم فورم کے اعتبار سے اسے اردو کی بہترین نظموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے تخیلی اور تصوراتی سطح پر محبت کے جذبے کی تشکیل کے لیے بعض اجزائے ترکیبی کو یکجا کیا ہے اور ان کے مرکب کو محبت کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ پوری نظم کا سٹرکچر خوبصورت امیجری سے مزین ہے۔ فرماتے ہیں۔

① سے ④ **معنی**: **عروسِ شب**: رات کی دلہن۔ **لذتِ رم**: بھاگنے کی لذت۔ **لباسِ نو**: مراد ہے نئی نئی صورت۔ **آئینِ مسلم**: فطرت کا قانون۔ **امکاں**: اصطلاحی معنی ممکن۔ **چشمِ خاتم**: انگوٹھی کی آنکھ۔

مطلب: جب خالق ہر دو جہاں نے کائنات کو تخلیق کیا تو اس کے ابتدائی لمحات میں جملہ موجودات کی کیفیات اور صورت حال یہ تھی کہ شب کی دلہن کی زلفیں پیچ و خم سے محروم تھیں۔ آسمان پر ستاروں کی گردش اور ان کے اپنی منزل کی طرف گامزن ہونے کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ چاند کو فطرت نے جو نیا لبادہ فراہم کیا تھا اس میں وہ اجنبی سا محسوس ہوتا تھا۔ وہ بھی ہمہ وقت گردش کے طے شدہ اصولوں سے آگاہی نہ رکھتا تھا۔ اس عالمِ رنگ و بو کا نیا نیا آغاز ہوا تھا اور اس کے جملہ عناصر ان تقاضوں سے محروم تھے۔ جا کا

تعلق زندگی سے ہے۔ یہ کائنات جو اب پایہ تکمیل کو پہنچ کر ہماری نظروں کے سامنے ہے ابھی اس کی نئی نئی ابتدا ہوئی تھی۔

⑤ سے ⑧ **معنی: عرش کے پایئے**: کنایہ ہے یعنی محبت پاکیزہ چیز ہے۔ **اکسیر کا نسخہ**: وہ مرکب جس کے لگنے سے دھات سونا بن جائے۔ **اسم اعظم**: اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا اور متبرک نام۔ **میدان امکاں**: ساری کائنات۔ **زلف برہم**: مراد ہے رات کی سیاہی۔

مطلب: قرین قیاس یہ ہے کہ ان لمحات میں آسمان پر ایک ایسے کیمیاگر کا وجود پایا جاتا تھا۔ اس کیمیاگر کو مٹی سے سونا بنانے پر قدرت حاصل تھی اور جس کے پاؤں کی دھول جمشید کے جام سے بھی زیادہ مصفا تھی۔ فی الواقعہ یہ کیمیاگر سوائے آدم کے اور کوئی نہ تھا۔ ان دنوں عرش معلی کے کسی گوشے میں اکسیر کا ایک ایسا نسخہ آویزاں تھا جس کو فرشتے ہر لمحے اس انسان کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن یہ کیمیاگر یعنی انسان ہر لمحے اس نسخے کی تاک میں رہتا تھا کہ کب فرشتوں کی آنکھ جھپکے اور وہ اس نسخے کو لے اڑے۔ اس لیے کہ یہ انسان تو اس نسخے کو اسم اعظم سے بھی زیادہ اہم اور قیمتی تصور کرتا تھا۔ ایک روز بالآخر وہ ایک حمد باری تعالیٰ کے بہانے عرش کی جانب بڑھا اور بڑی چابکدستی کے ساتھ فرشتوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ نسخہ حاصل کر لیا یوں بالآخر اپنی سعی پیہم کے سبب اس کی دلی مراد بر آئی۔

⑨ سے (12) **معنی**: **چشمہ حیواں**: وہ فرضی چشمہ جس کا پانی پی کر موت نہیں آتی۔

مطلب: نسخے کے حصول کے بعد اب انسان کو اس کے اجزاء کی فراہمی کے لیے سرگرداں ہونا تھا۔ لیکن جو فرد بارگاہ خداوندی کا محرم ہو اس کی نگاہوں سے کوئی شے بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اس نے اس نسخے کے اجزائے ترکیبی کی تلاش میں ساری دنیا کو کھنگال ڈالا اور بالآخر اسے اس سردردی کا صلہ کامیابی کی صورت میں حاصل ہو گیا چنانچہ اس نے ستاروں سے تھوڑی سی چمک حاصل کی چاند میں جو داغ ہے اس کا ایک جزو اور تھوڑی سی رات کی سیاہی بھی جمع کر لی۔

ان عناصر کی فراہمی کے بعد اس کیمیاگر یعنی انسان نے دیگر اجزاء کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں اور بجلی کی تڑپ کا کچھ حصہ حاصل کرنے کے لیے بعد حوروں کی پاکیزگی اور حضرت عیسیٰؑ کے انفاس کی حرارت بھی حاصل کر لی۔ اس کے بعد بھی اس نے نسخے کی تکمیل کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں بالآخر وہ خداوند عزوجل کی بے نیازی کے علاوہ فرشتوں کا عجز و انکسار اور شبنم کی خاکساری کے حصول میں بھی کامیاب ہو گیا۔

(13 سے 16) اس نایاب اور گراں قدر نسخے کی تکمیل کے لیے اس کے اجزائے ترکیبی کی فراہمی کوئی آسان کام نہ تھا لیکن انسان نے اپنی ہمت اور حکمت و دانش کے طفیل اس عقدۂ لاینحل کو حل کر کے ہی دم لیا۔ اب معاملہ صرف اسی قدر رہ گیا تھا کہ اجزائے ترکیبی کے حصول کے بعد نسخے کی تکمیل کی جائے۔ چنانچہ تمام اشیاء کو یکجا کر کے اس نے آب حیات میں گھولا اور اس مرکب کا نام محبت رکھا۔

نسخے کی تکمیل کے بعد اس مرکب کو انسان نے ان لمحات میں موجود کائنات کی ہر شے پر چھڑکا اور یوں ساری زندگی حرکت میں آ گئی۔ تمام خوابیدہ ذرات بیدار ہو گئے اور اٹھ اٹھ کر اپنے ہم نفسوں سے باہم گلے ملنے لگے۔ اس مرکب کے چھینٹوں کا اثر یہ ہوا کہ آفتاب نے اپنی گردش کا آغاز کر دیا اور ستارے بھی

منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ باغوں میں غنچے چٹک کر پھول بن گئے اور لالے کو اس کا داغ حاصل ہو گیا۔ مراد یہ ہے کہ یہ محبت کا جذبہ ہی ہے جس کے طفیل کائنات کی ہر شے متحرک ہے اور اس میں زندگی کی لہر دوڑ رہی ہے۔

حقیقت حسن

064

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نے مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی، اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا، سوگوار گیا

① سے ④ **معنی: تصویر خانہ**: مراد دنیا۔ **عدم کا فسانہ**: یعنی دنیا کی کوئی حقیقت نہیں۔ **اختر سحر**: صبح کا تارا۔

مطلب: اقبال نے اس نظم میں حسن کی حقیقت اور اس کے اسرار پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس حقیقت سے آگہی بقول ان کے ہر زندہ شے کے لیے ایک ایسے کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں حسن نے ایک روز خدائے ذوالجلال سے استفسار کیا کہ ہر شے پر قدرت رکھنے کے باوجود تو نے مجھے لافانی کیوں نہیں بنایا۔ تو خدا نے جواب دیا کہ یہ دنیا ہی میں نے ناپائیدار بنائی ہے۔ یہاں وہی شے خوبصورت اور حسین ہو گی جس کی زندگی مختصر ہو۔ زندگی تو تغیر اور تبدیلیوں کا نام ہے سو ہر زوال پذیر شے حسن سے عبارت ہے۔

④ سے ⑦ جس لمحے حسن اور خدا کے مابین یہ مکالمہ ہو رہا تھا تو چاند بھی کہیں قریب سے سب کچھ سن رہا تھا چنانچہ اس نے فوری طور پر یہ رازہائے درون پردہ جو اس پر آشکار ہوئے تھے ستاروں تک پہنچائے۔ جس کے سبب پورے آسمان پر یہ مکالمہ عام ہو گیا۔ صبح کے ستارے نے سحر کو، اور سحر نے ساری بات شبنم کو بتائی۔ یوں جو آسمان کا راز تھا وہ زمین کے باسیوں پر بھی منکشف ہو گیا۔ چنانچہ جس لمحے شبنم نے پھولوں کو حقیقت حسن سے آگاہ کیا تو وہ آبدیدہ ہو گئے اور کلی کا ننھا سا دل بھی اس کو سن کر پارہ پارہ ہو گیا۔ یہی نہیں کہ بلکہ اس کو سن کر موسم بہار بھی روتا ہوا چمن سے رخصت ہو گیا اور شباب بھی غم زدگی کے عالم میں منزل فنا کی جانب گامزن ہو گیا۔

پیام

065

عشق نے کر دیا تجھے ذوق تپش سے آشنا
بزم کو مثل شمع بزم حاصل سوز و ساز دے

شان کرم پہ ہے مدار عشق گرہ کشائی کا
دیر و حرم کی قید کیا! جس کو وہ بے نیاز دے

صورت شمع نور کی ملتی نہیں قبا اسے
جس کو خدا نہ دہر میں گریہ جانگداز دے

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہ سحر میں وہ
چشم نظارہ میں نہ تو سرمہ امتیاز دے

عشق بلند بال ہے رسم و رہ نیاز سے
حسن ہے مست ناز اگر تو بھی جواب ناز دے

پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں، مجھ کو تو خانہ ساز دے

تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزم کہن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مے مجاز دے

❁

① **معنی:** ذوق تپش: تڑپنے کی لذت۔

مطلب: اقبال کی یہ زیر تشریح اپنی ہیئت اور موضوعات کے حوالے سے زیادہ اہم نہیں اس لیے کہ اس نظم میں بھی انہوں نے ان مسائل کو سابقہ انداز میں دہرایا ہے جن کا تذکرہ وہ اپنی متعدد نظموں میں کر چکے ہیں۔ بہرحال وہ آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ اے ہم نشیں! عشق نے تجھے سوز سے نوازا ہے لیکن تیری انفرادیت یہ ہونی چاہیے۔ شمع محفل کی طرح اپنے عہد کو روشنی عطا کر! مراد یہ کہ سوز عشق میں خود مبتلا ہونا کافی نہیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کیفیت سے دوسرے بھی استفادہ کر سکیں۔

② **معنی:** دیر و حرم: بت خانہ اور مسجد۔

مطلب: عشق کو اگر مشکلات کا حل تصور کر لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ دولت رحمت خداوندی کی دین ہے۔ اس ضمن میں دیر و حرم کی پابندی نہیں بلکہ اسے تو وہی بے نیاز عطا کرتا ہے۔

③ شمع کو اگر شعلے کی صورت میں نور کا لباس ملا ہے تو اس کی وجہ شمع کا جلنا ہے مراد یہ کہ کوئی بھی بلند مرتبہ تکلیف اٹھائے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

④ **معنی:** سرمہ امتیاز: امتیاز کا سرمہ۔

مطلب: ستارے، چاند اور طلوع سحر میں رب ذوالجلال کا جلوہ موجود ہے اس کے لیے کسی امتیاز کی ضرورت نہیں۔ دیکھنے والے کو اپنے رویے میں توازن پیدا کرنا چاہیے۔

⑤ **معنی:** رسم و رہ نیاز: عاجزی یا غلامی کا طریقہ۔

مطلب: عشق انسان کو عاجزی اور انکساری نہیں سکھاتا چنانچہ اگر حسن ناز و انداز، فخر و غرور کا حامل ہے تو اس کا جواب بھی اسی کے انداز میں دے۔

⑥ **معنی:** پیر مغاں: مراد ہے میخانہ کا مالک۔ نشاط: خوشی۔

مطلب: اے ساقی! یہ تسلیم کہ انگریزی تہذیب بظاہر مسرت و انبساط عطا کرتی ہے لیکن یہ امر ضروری

ہے کہ اب اپنی قومی تہذیب سے آشنا کر۔

⑦ اے ساقی! تجھ کو شاید اس امر کا ادراک نہیں کہ قدیم تہذیب بڑی حد تک تبدیل ہو چکی ہے لہٰذا ہمیں ظاہری باتوں کی بجائے جملہ حقائق سے پوری طرح آشنا کر۔

066 سوامی رام تیرتھ

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا' بنا اب گوہر نایاب تو

آہ! کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو

مٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آزر بنا

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ' سیماب سیم خام ہے

توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیمِ عشق

❋

① سوامی رام تیرتھ' جن کا اصل نام تیرتھ رام تھا۔ علامہ اقبال کے سیالکوٹی احباب میں سے تھے۔ حصولِ علم کے بعد وہ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد مشن کالج لاہور میں آ گئے۔ چند سال بعد وہ ویدانت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ملازمت ترک کر دی۔ اس کے بعد ہفتوں دریائے راوی کے کنارے ریاضتِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ بعد میں وہ دریائے گنگا میں ڈوب کر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اقبال کو ان کی موت کی خبر ملی تو زیرِ تشریح اشعار کہے۔ ملاحظہ ہوں۔

① **معنی**: **ہم بغل**: واصل۔ **دریا**: مراد ہے خدا۔ **قطرۂ**: مراد ہے انسان۔ **گوہر**: مراد ہے روح۔ **غوغا**: شور و غل۔ **شورشِ محشر**: قیامت کا ہنگامہ۔ **لا**: مراد اپنی اور کائنات کی نفی۔ **تسنیم**: جنت کی ایک نہر کا نام۔

مطلب: اے میرے ہمدم و مونس! تو موت کے لیے کس قدر مضطرب تھا کہ دریا میں ڈوب کر جان دے دی۔ زندگی میں تو بے شک تو ایک موتی کی مانند تھا جب کہ موت کے بعد تو گوہرِ نایاب کی صورت اختیار کر گیا یعنی خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ اپنے پردۂ وجود کو ختم کر کے تو نے اس کائنات کی حقیقت کو آشکار کر دیا جب کہ میں ابھی تک اس محبس میں اسیرِ رنگ و بو ہوں۔ اے یارِ **ہمنشیں**! تیری زندگی کا شور و غوغا اختتام پذیر ہوا تو عملاً قیامت کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بالفاظِ دگر تیری زندگی کی چنگاری سے آزر کا آتشکدہ روشن ہو گیا۔ مراد یہ کہ اس طرح وفات پانے سے تیری اہمیت میں بے حد و حساب اضافہ ہو گیا۔ جو شخص معرفتِ حق سے آگاہ ہو جاتا ہے اسے یہ باور کرنے میں تاخیر نہیں ہوتی کہ نفی کے بعد ہی اثبات کا مرحلہ آتا ہے۔ اپنے وجود کو مٹانے سے ہی رب ذوالجلال کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ نابینا آنکھ کس طرح سے حقائق کے نتائج کا اندازہ کر سکتی ہے۔ اس کی مثال پارے کی مانند ہے کہ اس میں متحرک اور اضطراب ختم ہو جائے تو پارے کی بجائے محض کچی چاندی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ماننا پڑے گا کہ یہ جذبہ عشق ہی ہے جو ہوش و خرد کے طلسم کو ختم کر کے انسان کو حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔

067 طلبہ علی گڑھ کالج کے نام

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے
طائر زیر دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالہ طائر بام اور ہے
آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں
کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے
جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیش جاوداں، ذوق طلب اگر نہ ہو
گردش آدمی ہے اور، گردش جام اور ہے
شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز!
غمکدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے
بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسا ابھی

*

① **معنی**: اوروں: دوسروں مراد اہل دانش۔ پیام: مراد عشق کا پیام۔

مطلب: اس نظم میں اقبال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں دوسرے شاعر، ادیب اور سیاسی رہنما تمہیں جو نصیحتیں کرتے رہے ہیں امرواقعہ یہ ہے کہ میرا پیغام ان سے قطعی مختلف ہے۔ اس لیے کہ میرے دل میں عشق حقیقی کا پیدا کردہ درد موجزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا انداز بیان بھی دوسروں سے مختلف ہے۔

② قبل ازیں تم لوگ دراصل ایسے لوگوں کی باتیں سنتے رہے تھے جو ذہنی طور پر بھی انگریز کے غلام تھے۔ جب کہ میں تو ذہنی اور سیاسی بنیاد پر خود کو ہر طرح سے آزاد و خود مختار تصور کرتا ہوں چنانچہ تم سے جو کہتا ہے وہ ایک آزاد شاعر کے طور پر کہتا ہے۔

③ **معنی**: راز حیات: زندگی کی اصلیت۔ مور ناتواں: کمزور چیونٹی۔

مطلب: پہاڑ تو اپنی جگہ پر قائم و منجمد رہتا ہے اور وہ اسی کیفیت میں سکون و اطمینان محسوس کرتا ہے اس کے برعکس ایک ننھی سی کمزور چیونٹی کا رویہ پہاڑ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ہر لمحے حرکت میں رہتی ہے اس کے نزدیک حرکت ہی سکون قلب کا سبب بن سکتی ہے۔

④ **معنی**: جذب حرم: مراد ہے عشق رسول ﷺ۔ فروغ: آب و تاب۔ انجمن حجاز: ملت اسلامیہ۔

مطلب: اے عزیز طلباء! میری بات غور سے سنو کہ ملت مسلمہ کا تمام تر وقار و احترام کعبہ کی محبت اور عشق کے سبب ہے۔ اسی جذبے کے سبب یہ امر واضح ہو سکے گا کہ دوسری قوموں اور مذاہب کے مقابلے میں ملت اسلامیہ کا نظام کس قدر مختلف اور منفرد ہے۔ اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ تمہارا تعلق چونکہ اسلام سے ہے اس لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ اسی کی پیروی کی جائے۔ اور دوسرے ادیان کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے باوجود خود اپنی راہ پر گامزن رہا جائے۔

⑤ یہ بھی جان لو کہ انسان کو مستقلاً" عیش و آرام کی زندگی میسر ہو اور آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی آرزو نہ ہو تو ایسی جامد و ساکت زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔ شراب کے پیالے کی گردش اور انسان کی گردش میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جام شراب کی گردش محض چند ہاتھوں تک محدود ہوتی ہے، جب کہ انسان اسی نوع کی جدوجہد سے زندگی میں بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے۔

⑥ **معنی:** سوز: بمعنی عشق۔ **غمکدۂ نمود:** مراد دنیا ہے۔

مطلب: شمع جو شب بھر جلتی رہی صبحدم بجھتے بجھتے زبان حال سے یہ پیغام دے گئی کہ زندگی کا ارتقاء اسی حقیقت میں مضمر ہے کہ انسان تمام عمر جدوجہد کرے خواہ اس کے لیے کتنے ہی دکھ اٹھانے پڑیں۔

⑦ **معنی:** نارسا ابھی: ابھی پختگی پیدا نہیں ہوئی۔

مطلب: سرسید احمد خاں کے نظریات سے اتفاق کرتے ہوئے اقبال طلبہ سے کہتے ہیں کہ ابھی تمہیں اپنا مقصد حیات حاصل کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرنی چاہیے اور اس وقت تک انگریز سے متصادم ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک کہ ہر اعتبار سے تمہاری صفوں میں استحکام پیدا نہ ہو جائے۔

اختر صبح

068

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا! ملی نگاہ، مگر فرصت نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دم آفتاب سے ہر شے اماں مجھی کو تہِ دامن سحر نہ ملی!
بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی
کہا یہ میں نے کہ اے زیور جبین سحر غم فنا ہے تجھے؟ گنبد فلک سے اتر
ٹپک بلندی گردوں سے ہمرہ شبنم مرے ریاض سخن کی فضا ہے جاں پرور
میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی
بنا مثال ابد پائدار ہے اس کی

*

پہلا بند معنی: ستارۂ صبح: صبح کا ستارہ جس کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے۔ **بساط:** حیثیت۔

مطلب: "بانگ درا" کی یہ مختصر نظم محض دو بند پر مشتمل ہے جس میں اقبال ستارۂ صبح سے مکالمہ کرتے ہیں۔ اولین بند میں ستارۂ صبح اپنی روداد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خالق کائنات نے بے شک مجھے زندگی اور چمکنے کی صلاحیت تو عطا کی لیکن زندگی کے ان لمحات کو اس قدر محدود کر دیا کہ مناظر فطرت کا پوری طرح جائزہ لے سکوں۔ اس لیے کہ میرے طلوع ہونے کے محض چند لمحات کے بعد سورج اپنی تیز کرنوں کے ساتھ برآمد ہوا جس کے نتیجے میں میرا وجود دھندلا کر رہ گیا۔ ثابت ہوا کہ میری حیثیت بس اتنی ہی ہے جیسے کہ ہوا کسی پانی کے بلبلے میں مقید ہو یا ایک چنگاری جو لمحے بھر کے لیے چمکے اور پھر بجھ کر رہ جائے۔

دوسرا بند معنی: زیور جبین سحر: صبح کی دلہن کے ماتھے کا زیور۔ بِنا: بنیاد۔
مطلب: اس بند میں اقبال ستارۂ صبح کی شکایت کے جواب میں اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں بے شک تو صبح کی پیشانی پر جھومر کے مانند ہے اور طلوع آفتاب کے سبب تجھے اپنے فنا ہونے کا غم بھی ہے سو میرا مشورہ یہ ہے کہ آسمان سے نیچے اتر اور قطرۂ شبنم کی طرح میرے باغِ سخن میں ٹپک پڑ کہ یہاں کی فضا بڑی پرسکون اور زندگی آمیز ہے۔ جان لے کہ میری شاعری روح میں بالیدگی پیدا کرنے کی موجب ہے۔
میں ایک ایسے باغباں کی مانند ہوں اور محبت کا جذبہ میری شاعری میں بہار کی حیثیت کا حامل ہے۔ جان لے کہ میرے گلستان سخن کو زوال نہیں اس کے برعکس اس کا وجود ہمیشگی کا حامل ہے۔

حسن و عشق 069

جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمیں قمر
نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم، نور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے ید بیضائے کلیم
موجۂ نکہت گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیل محبت میں یونہیں دل میرا

تو جو محفل ہے، تو ہنگامہ محفل ہوں میں
حسن کی برق ہے تو، عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے، تو مرے اشک ہیں شبنم تیری
شام غربت ہوں اگر میں، تو شفق تو میری
مرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے
تری تصویر سے پیدا مری حیرانی ہے
حسن کامل ہے ترا، عشق ہے کامل میرا

ہے مرے باغ سخن کے لیے تو باد بہار
میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریک کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

*

یہ نظم عملاً تین بند پر مشتمل ہے اس کے مفہوم تک رسائی کے لیے اس حقیقت کا ادراک لازم ہے کہ اقبال اپنے جذبہ عشق کے حوالے سے ان اشعار میں اپنے محبوب سے مکالمہ کرتے ہوئے حسن و عشق کی نفسیات کو واضح کرتے ہیں۔ حسب معمول اس نظم کو بھی انہوں نے خوبصورت امیجز کے ذریعے سنوارا ہے اور ایسے استعارے بھی وضع کیے ہیں جو اس عہد کی شاعری میں نئی جہت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ نظم کے اولین بند میں اقبال یوں گویا ہوئے ہیں۔

پہلا بند معنی: کشتی سیمین قمر: چاند کی چاندنی کی کشتی یعنی چاند۔ نور خورشید: سورج کی روشنی۔ ید بیضائے: ہاتھ کی سفیدی۔ شمیم: خوشبو۔
مطلب: اے میرے محبوب! جس طرح طلوع سحر کے ہنگام سورج کی تیز روشنی میں چاند کی نسبتاً مدھم روشنی مدغم ہو کر رہ جاتی ہے' یا جیسے چاندنی رات میں کنول کا پھول اس کے ہم رنگ ہونے کے باعث

نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے یا جس طرح کوہ طور پر نور خداوندی کی ضو سے حضرت موسیٰؑ کا سفیدی مائل ہاتھ ایک طرح سے ناپید ہو جاتا ہے یا پھر جیسے طلوع سحر کے وقت گلستان میں پھولوں کی اجتماعی خوشبو ایک چھوٹے سے پھول کی انفرادی خوشبو کو اپنے دامن میں لپیٹ لیتی ہے بالکل اسی طرح تیری محبت اور عشق میں میرے دل کا عالم ہے مراد یہ کہ میں اپنے وجود کو تیرے وجود میں ضم کر چکا ہوں۔

دوسرا بند　مطلب: اے میرے محبوب! اگر تجھے ایک محفل تصور کر لیا جائے تو اس محفل کی رونق یقیناً میرے دم سے ہے۔ اگر تجھے بجلی سمجھ لیا جائے تو میری ذات ایک لیمپ یا بلب کی مانند ہے جو اس بجلی سے جلتا رہتا ہے۔ اگر تجھے صبح کا وقت سمجھ لیا جائے تو میرے آنسو اس لمحے تیرے لیے شبنم کی مانند ہوں گے۔ اس عالم غربت میں اگر میں شام کی حیثیت رکھتا ہوں تو تیرا وجود عملاً شفق کی طرح سے ہے۔ تیری منتشر زلفوں کی طرح میرا دل بھی مضطرب و پریشان رہتا ہے اور جب تیری تصویر کو دیکھتا ہوں تو اس میں بھی مجھے اپنی ہی کیفیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اگر تو اپنے حسن کو کامل سمجھتا ہے تو جان لے کہ میرا عشق بھی کامل ہے۔

تیسرا بند　مطلب: اے محبوب! میری شاعری کے گلستان میں تیرا وجود موسم بہار کی ہوا کے مانند ہے۔ میرے تخیل میں جو بے چینی اور اضطراب تھا تیرے سبب اس میں ٹھہراؤ اور توازن پیدا ہوا۔ جب سے تیرا عشق میرے دل میں جاں گزین ہوا ہے اس دم سے میرے فن میں بھی نئی تخلیقی صلاحیتیں رونما ہونے لگی ہیں۔ مجھے اس حقیقت کا ادراک بھی ہوا کہ حسن کے بغیر عشق کی تکمیل کا کوئی امکان نہیں ہوتا تیرے سبب ہی میری آرزوؤں اور امیدوں کو فروغ ملا چنانچہ تجھے پاتے ہی میرا قافلہ منزل تک رسائی میں کامیاب ہو گیا۔

070　........ کی گود میں بلی دیکھ کر

تجھ کو دزدیدہ نگاہی یہ سکھا دی کس نے؟
رمز آغاز محبت کی بتا دی کس نے؟

ہر ادا سے تری پیدا ہے محبت کیسی
نیلی آنکھوں سے ٹپکتی ہے ذکاوت کیسی

دیکھتی ہے کبھی ان کو، کبھی شرماتی ہے
کبھی اٹھتی ہے، کبھی لیٹ کے سو جاتی ہے

آنکھ تیری صفت آئنہ حیران ہے کیا؟
نور آگاہی سے روشن تری پہچان ہے کیا؟

مارتی ہے انھیں پونہچوں سے، عجب ناز ہے یہ
چھیڑ ہے، غصہ ہے یا پیار کا انداز ہے یہ؟

شوخ تو ہو گی، تو گودی سے اتاریں گے تجھے
گر گیا پھول جو سینے کا تو ماریں گے تجھے

کیا تجسس ہے تجھے؟ کس کی تمنائی ہے؟
آہ! کیا تو بھی اسی چیز کی سودائی ہے؟

خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں
صورت دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکیں

شیشۂ دہر میں مانند مے ناب ہے عشق!
روح خورشید ہے، خون رگ مہتاب ہے عشق

دل ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

کہیں سامان مسرت، کہیں ساز غم ہے!
کہیں گوہر ہے، کہیں اشک، کہیں شبنم ہے

*

زیر تشریح نظم کا مرکزی کردار اگرچہ بظاہر ایک بلی ہے لیکن اگر اس کے اشعار کو گہرائی میں جا کر اور نظم کے عنوان کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو اقبال نے بالواسطہ طور پر یہاں اپنی محبوبہ کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ نظم عطیہ فیضی کے بارے میں کہی گئی ہے۔

① معنی: دزدیدہ نگاہی: چوری چوری آنکھوں سے دیکھنا۔ ذکاوت: عقلمندی۔ صفت آئنہ: آئینہ کی طرح۔

مطلب: اے بلی یہ تو بتا تو جس طرح میری جانب کن اکھیوں سے دیکھ رہی ہے نظارے کے اس انداز کی تربیت تجھے کس نے دی ہے یہ عمل تو آغاز محبت سے عبارت ہے۔ یوں بھی تیری ہر حرکت اور ادا سے محبت کا اظہار ہو رہا ہے۔ تیری نیلی آنکھوں سے جس ذہانت کا اظہار ہو رہا ہے اس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ تیرے دل میں کیا ہے۔ کبھی تو اپنی مالکہ کی جانب دیکھتی ہے اور کبھی شرمیلی نظروں سے میری طرف دیکھتی ہے۔ کسی لمحے گود میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور کبھی یوں آنکھیں موند لیتی ہے جیسے محو خواب ہو۔

اے پیاری بلی! تیری آنکھیں تو آئینے کی طرح حیرت کا منظر پیش کر رہی ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تو پس پردہ حقیقت سے پوری طرح سے آگاہی رکھتی ہے۔ اور مختلف انداز سے جس جذبے اظہار بھی کر رہی ہے۔ ناز و انداز کے اظہار کے تو نے یہ عجب طریقے سیکھے ہیں کہ کبھی اپنی مالکہ پر پنجے آزماتی ہے کبھی خاموشی اختیار کر لیتی ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ یہ نفرت اور غصہ ہے یا محبت کا کوئی انداز! شاید تجھے معلوم نہیں کہ اس طرح کی شوخ ادائیں زیادہ دکھائے گی تو تیری مالکہ تجھے اپنی گود سے اتار پھینکے گی اور اگر اس کے سینے پر انکا پھول گر گیا تو تجھے اس کی سزا ملے گی۔

⑦ سے (11): معنی: تجسس: تلاش۔ دہر: دنیا۔

مطلب: نہ جانے تجھ کس شے کا تجسس ہے اور کس جذب کی تلاش ہے اور تیرے دل میں کونسی آرزو پوشیدہ ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تو بھی میری طرح اس فرد کی شیدائی ہے۔ جو میری محبوبہ ہے۔ لگتا ہے تیرے دماغ میں بھی جنون عشق کا سودا سمایا ہوا ہے۔ تیرے رویے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عشق کا جذبہ صرف انسان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ حیوانوں کو بھی ودیعت کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ہر جاندار کے سینے میں دل موجود ہے اور جذبہ عشق کا مسکن دل ہی تو ہوتا ہے۔

میں اس حقیقت کا انکشاف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دل کو اگر پیمانہ تصور کر لیا جائے تو جذبہ عشق اس پیمانے میں شراب کے مانند ہے۔ عشق تو سورج کی روح کی مانند ہے اور چاند کی کرنوں سے بھی عبارت ہے۔ مٹی کے ہر ذرے میں دیکھا جائے تو عشق کی کسک پوشیدہ ہے۔ یہ تو ایسا نور ہے جس کی جھلک ہر شے میں موجود ہے لیکن یہ اپنی متضاد خصوصیتوں میں کہیں مسرت کا سبب ہے کہیں غم و اندوہ کا! کہیں موتی ہے، کہیں آنسو اور کہیں شبنم ہے۔

071

کلی

جب دکھاتی ہے سحر عارض رنگیں اپنا کھول دیتی ہے کلی سینہ زریں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں
سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

میرے خورشید! کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہ بے تاب
تیرے جلوہ کا نشیمن ہو مرے سینے میں عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں
زندگی ہو ترا نظارہ مرے دل کے لیے روشنی ہو تری گہوارہ مرے دل کے لیے
ذرہ ذرہ ہو مرا پھر طرب اندوز حیات ہو عیاں جوہر اندیشہ میں پھر سوز حیات
اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں صفت غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں
جان مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کر دوں

*

پہلا حصہ: معنی: **عارض:** چہرہ۔ **سینہ زریں:** کلی کے اندر زرد رنگ کا مادہ' مراد سنہرا۔ **جلوہ آشام:** مراد طالب جلوہ۔ **سینہ شگافی:** سینے کا کھلنا یا تازگی۔

مطلب: اس نظم میں کہا گیا کہ جس لمحے سحر اپنا عارض رنگیں دکھاتی ہے یعنی شب کے خاتمے پر صبح کا چمکیلا روپ ظاہر ہوتا ہے تو اس روپ کو جذب کرنے کے لیے غنچہ چٹکتا ہے اور پھول بن جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ غنچہ صبح کے وقت حقیقی معنوں میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنوں سے اپنا دامن بھر لیتا ہے۔ یہ غنچہ سورج کے روبرو اپنا دل چیر کے اس طرح سے رکھ دیتا ہے کہ عملاً سورج کی کرنوں کے طفیل وہ سینہ شگافی کا لطف بھی اٹھاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایک کلی علی الصبح طلوع آفتاب کے لمحات میں چٹک کر سورج کی کرنوں سے حقیقی معنوں میں یوں لطف اندوز ہوتی ہے کہ انبساط و مسرت سے پھول بن جاتی ہے۔

دوسرا حصہ: معنی: **جوہر اندیشہ:** قوت فکر۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال سورج کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کبھی تو بھی اپنی حقیقت سے مجھے آگاہ کر کہ میری بیتاب نظریں تیرے نظارے کو تڑپتی رہتی ہیں۔ میری آرزو ہے کہ تو میرے سینے کے اندر جلوہ افروز ہو جائے اور میرے دل کے آئینے میں تیرا عکس موجزن ہو جائے۔ تیرا نظارا میرے دل کے لیے روشنی کی مانند ہو اور یہی روشنی میرے دل کے لیے گہوارہ بن جائے۔ اس صورت میں میری زندگی مسرت و انبساط کی حامل ہو سکے گی تاکہ میری فکر اور سوچ کے ذریعے زندگی کا سوز عطا ہو۔ تو بے شک مجھ سے دور چمکتا ہے پھر بھی میں تیرا نظارہ کرنے کا خواہاں ہوں اور غنچہ کی مانند تیری روشنی سے استفادہ کر سکوں۔ اس صورت میں اپنی مضطرب زندگی کے حقائق دوسروں پر نمایاں کر دوں گا اور جو خیالات میرے دل میں پوشیدہ ہیں وہ بھی سامنے آ جائیں گے۔

072 چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا چلنا، چلنا، مدام چلنا
بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب تارے، انساں، شجر، حجر، سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟
کہنے لگا چاند، ہم نشینو! اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں! جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

*

اس نظم کے عملاً دو حصے ہیں جن میں ستاروں اور چاند کے مابین ایک مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم ان انگریزی نظموں سے بڑی حد تک مماثلت رکھتی ہے جو فطرت کے مظاہر سے ہم آہنگ ہیں۔ زیرِ تشریح نظم کے ابتدائی حصے میں ستارے، چاند سے یوں استفسار کرتے ہیں۔

پہلا حصہ: معنی: بیتاب ہے: یعنی متحرک ہے۔

مطلب: طلوعِ سحر کے خدشے کے پیشِ نظر ستارے، چاند سے پوچھتے ہیں کہ یہ تو بتا کہ ہم جو چمک چمک کر تھک چکے ہیں اس کے باوجود آسمان کے نظاروں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا کام تو صبح و شام گردش میں ہی رہنا ہے اور یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

اے چاند! اتنا بتا دے کہ اس عالمِ رنگ و بو کی ہر شے تغیر سے کیوں دوچار ہے۔ ان کے اضطراب میں کمی کیوں نہیں آتی جسے سکون کہا جاتا ہے۔ یہاں اس کو آنکھیں ترستی ہیں۔ یہاں تو ہر جانب سب لوگ سفر میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہماری بات تو الگ رہی یہ انسان، درخت اور پتھر سب ہی سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے رہتے ہیں۔ آخر اتنا تو ہمیں پتہ چلے کہ یہ سفر کبھی اور کسی مرحلے پر جا کر ختم بھی ہو گا اور کبھی ہم اپنی منزلِ مقصود کو بھی دیکھ سکیں گے یا نہیں! مراد یہ ہے کہ ستاروں کے الفاظ میں اس کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے کسی کو بھی سکون حاصل نہیں! سفر جاری ہے اور منزل ناپید!

دوسرا حصہ: معنی: مزرعِ شب: رات کی کھیتی۔ **اشہبِ زمانہ:** زمانے کا گھوڑا۔ **خرام کا حسن:** یعنی

جدوجہد کا نتیجہ۔

مطلب: ان اشعار میں چاند جو بڑی خامشی کے ساتھ ستاروں کی باتیں سن رہا تھا یوں گویا ہوا کہ اے ہم نشینو! بے شک تم نے رات کی کھیتی سے فیض حاصل تو کیا لیکن میری بات غور سے سنو! کہ اس کائنات کا وجود تغیر اور حرکت میں ہی پوشیدہ ہے کہ یہی اس جہان کا قدیم اصول ہے۔ اس زمانے کو اگر گھوڑے سے تشبیہ دی جائے تو یوں سمجھو کہ گھوڑا خواہش کے چابک کھا کھا کر دوڑتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ضرورت عملاً زمانے کو حرکت میں رکھتی ہے۔ یہی اصول ازل سے چلا آ رہا ہے۔

چنانچہ منزل تک پہنچنے کے لیے جو مسافت مقرر ہے اس میں ٹھہرنے کا عمل بے موقعہ اور قطعی نامناسب ہے۔ اس لیے کہ کسی مقام پر ٹھہرے تو یوں سمجھ لو کہ مارے گئے۔ یعنی دوران سفر کہیں رکنا موت سے ہم کنار ہونے کے مترادف ہے۔ جو لوگ عازم سفر اور حرکت میں رہتے ہیں اور منزل کا تعین کر لیتے ہیں وہ ہمیشہ کامیاب و کامران رہتے ہیں اس کے برعکس جو مسافر راہ میں دم لینے کے لیے رک گئے انہیں عقب سے آنے والے روند کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ حرکت اور روانی ہی ہر شے کو بناتی سنوارتی ہے۔ اسی عمل کو حسن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کائنات کی جملہ اشیا عشق کی بدولت حرکت میں رہتی ہیں اور آخر میں سنور کر حسن کا روپ دھار لیتی ہیں۔

073

وصال

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیِ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

خود تڑپتا تھا، چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں — تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا، شرماتا تھا میں
میرے پہلو میں دلِ مضطر نہ تھا، سیماب تھا — ارتکابِ جرمِ الفت کے لیے بیتاب تھا
نامرادی محفلِ گل میں مری مشہور تھی! — صبح میری آئنہ دارِ شبِ دیجور تھی

از نفس در سینہ خوں گشتہ نشتر داشتم
زیرِ خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتم

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں — اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں
عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے — کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے
غازۂ الفت سے یہ خاک سیہ آئینہ ہے — اور آئینے میں عکسِ ہمدمِ دیرینہ ہے
قید میں آیا تو حاصل **مجھکو** آزادی ہوئی — دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے — چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر کر دی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا واسوختی

*

پہلا حصہ ① سے ⑤ **معنی: گل:** پھول۔ مراد محبوب۔ **بلبل:** مراد ہمدم دوست۔ **سینہ خوں**

گشتہ: خون سے لبریز سینہ۔ غوغائے محشر: قیامت کا شور۔

مطلب: اس نظم میں اقبال پھول کی رعایت سے بلبل کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح تو پھول کے لیے مضطرب اور بے چین رہتا ہے اپنے محبوب و مطلوب کے لیے میں بھی اسی طرح مضطرب رہا ہوں۔ یہ میرے مقدر کی خوبی ہے کہ اب میرا مطلوب مجھے مل گیا ہے۔ اس کے ہجر میں تو میں خود بھی تڑپتا رہتا تھا اور اپنے اشعار کے ذریعے دوسروں کو بھی مضطرب اور بے چین رکھتا تھا۔ محبوب کے وصال سے قبل میرے پہلو میں دل کی کیفیت پارے کے مانند تھی جو ہر لمحے تڑپتا رہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ میرا دل ہمیشہ اپنے محبوب سے ملنے کے لیے بیقرار رہتا تھا۔ ان دنوں احباب میں میری نامرادی کا چرچا عام تھا۔ یہاں تک کہ میری صبح بھی اندھیری رات کے مانند تھی۔ ان لمحات میں میرے خون شدہ سینے میں سانس کی آمدورفت اس نوعیت کی تھی جیسے کوئی نشتر چلا رہا ہو۔ جب کہ میری خامشی میں قیامت کے ہنگامے پوشیدہ تھے۔

زیر تشریح نظم کی تفصیل میں جانے سے قبل اس امر کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی تھی بلبل جو پھول پر اپنی جان نچھاور کرنے پر آمادہ رہتی ہے جب اس کی جدائی کے کرب سے آشنا ہونے سے اس کا ملاپ پھول سے ہوتا تو کس کی کفیت سے دوچار ہوتی ہے۔ اقبال نے بھی اسی مماثلت سے اپنے محبوب کے فراق کے بعد وصال کی کیفیت کا خوبصورت انداز میں اظہار کیا ہے۔

دوسرا حصہ: معنی: غازہ: پاؤڈر۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ محبوب سے وصال کے بعد میرے تاثرات میں اضطراب و انتشار کی کیفیت ختم ہو گئی ہے جس کے نتیجے میں میرے اشعار میں وہ شگفتگی اور مسرت کا اظہار ہو رہا ہے کہ میرے احباب ماضی کی طرح پریشان ہونے کے برعکس ان اشعار سے بڑی حد تک لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ عشق کی حرارت سے میرے آبلوں میں حرارت پیدا ہو گئی ہے اور میرے نالے اب بجلیوں سے کھیل رہے ہیں یعنی ان میں بجلی کی سی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ محبت کے جذبے نے میرے آئینہ دل میں چمک پیدا کر دی ہے جس میں محبوب کا عکس نمایاں ہو رہا ہے۔ عشق کی قید میں گرفتار ہوا تو میرے دلی جذبات کو حقیقی آزادی حاصل ہو گئی۔ میں نے اپنے دلی جذبات اپنے محبوب پر نچھاور کر دیے تو یوں محسوس ہوا کہ میرا ویران دل صحیح معنوں میں آباد ہو رہا ہے۔ یہ وصال ایک ایسے خورشید کی مانند ہے جو میرے جذبات کے ستاروں کو روشنی اور تابندگی عطا کر رہا ہے اور جس کی راہ میں سرگرداں غبار کے سبب خود روشنی بھی شرمسار ہو رہی ہے۔ آخری شعر فارسی زبان میں ہے جس میں محبوب سے مخاطب ہو کر اقبال کہتے ہیں کہ تو نے مجھ پر ایک نظر ڈال کر عشق میں فنا ہونے کا طریقہ سکھا دیا ہے وہ لمحات خوب تھے۔ جب تیرے عشق نے میرے جسم کے خاشاک کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔

سلیمیٰ

074

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں نے   خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں

صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا　شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
جس کی چمک ہے پیدا، جس کی مہک ہویدا　شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر　ہنگامہ جس کے دم سے کاشانہ چمن میں
ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلمیٰ! تیری کمال اس کا

*

معنی: نمود: ظہور۔ **چشم ستارہ بیں:** ماہر فلکیات۔ **ظلمت کدہ:** اندھیری جگہ۔ **پیرہن:** کرتہ، لباس۔

مطلب: یہ مختصر سی نظم اگرچہ محض پانچ اشعار پر مشتمل ہے اس کے باوجود گوناگوں خوبیوں کی حامل ہے۔ نظم کی مرکزی کردار سلمیٰ بظاہر علامہ اقبال کی پسندیدہ خاتون ہے یا محبوبہ! اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن نظم کے اشعار میں باری تعالیٰ کی جو خصوصیات کائنات کے جملہ عناصر میں نظر آتی ہیں وہ ان کے بقول سلمیٰ کی نیلی آنکھوں میں محفوظ ہیں۔

چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ وہ خالق کائنات جس کا جلوہ ستاروں کا نظارہ کرنے والی آنکھوں نے دیکھا۔ سورج، چاند اور تاروں کے جھمکٹے میں غور سے دیکھیں تو وہی نظر آتا ہے۔ جس کو صوفی نے اپنے دل کے ظلمت کدے میں پایا۔ اس کے علاوہ شاعر اس کے نور کو فطرت کے بانکپن میں محسوس کرتا ہے۔

وہ باری تعالیٰ جس کا جلوہ شبنم کے قطروں میں اور جس کی خوشبو پھولوں میں موجود ہے وہی جس نے عالم سکوت میں صحرا میں اپنی بستی بسائی ہوئی ہے اور جس کے وجود کے باعث کائنات میں ہمہ وقت ہنگامہ اور رونق برقرار رہتی ہے۔ بے شک وہی ہے جس کا حسن دنیا کی ہر شے میں موجود ہے لیکن اے سلمیٰ تیری خوبصورت آنکھوں میں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام کمالات کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ مراد یہ کہ جلوۂ خداوندی کا مشاہدہ کرنا ہے تو پھر اسے پورے کمالات کے ساتھ سلمیٰ کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھنا چاہیے۔

عاشق ہرجائی

075-1

①

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال! تو　رونق ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے
تیرے ہنگاموں سے اے دیوانۂ رنگیں نوا!　زینت گلشن بھی ہے، آرائش صحرا بھی ہے
ہم نشیں تاروں کا ہے تو رفعت پرواز سے　اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک پیما بھی ہے
عین شغل مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز　کچھ ترے مسلک میں رنگ مشرب مینا بھی ہے
مثل بوئے گل لباس رنگ سے عریاں ہے تو　ہے تو حکمت آفریں، لیکن تجھے سودا بھی ہے
جانب منزل رواں بے نقش پا مانند موج　اور پھر افتادہ مثل ساحل دریا بھی ہے

حسن نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لیے
پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے

تیری ہستی کا ہے آئین تفنن پر مدار
تو کبھی ایک آستانے پر جبیں فرسا بھی ہے

ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب
اے تلون کیش! تو مشہور بھی' رسوا بھی ہے

لے کے آیا ہے جہاں میں عادت سیماب تو
تیری بیتابی کے صدقے' ہے عجب بیتاب تو

②

075-2

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے
مشت خاک ایسی نہاں زیر قبا رکھتا ہوں میں

ہیں ہزاروں اس کے پہلو' رنگ ہر پہلو کا اور
سینے میں ہیرا کوئی ترشا ہوا رکھتا ہوں میں

دل نہیں شاعر کا' ہے کیفیتوں کی رستخیز
کیا خبر **تجھکو**' درون سینہ کیا رکھتا ہوں میں

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے
مضطرب ہوں' دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں

گو حسین تازہ ہے ہر لحظہ مقصود نظر
حسن سے مضبوط پیمان وفا رکھتا ہوں میں

بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز
سوز و ساز جستجو مثل صبا رکھتا ہوں میں

موجب تسکیں تماشائے شرارا جستجو
ہو نہیں سکتا کہ دل برق آشنا رکھتا ہوں میں

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ! وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں

جستجو کل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حسن بے پایاں ہے' درد لادوا رکھتا ہوں میں

زندگی الفت کی درد انجامیوں سے ہے مری
عشق کو آزاد دستور وفا رکھتا ہوں میں

سچ اگر پوچھے تو افلاس تخیل ہے وفا
دل میں ہر دم اک نیا محشر بپا رکھتا ہوں میں

فیض ساقی شبنم آسا' ظرف دل دریا طلب
تشنہ دائم ہوں' آتش زیر پا رکھتا ہوں میں

مجھکو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں' اپنے مصور سے گلا رکھتا ہوں میں

محفل ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن
پھر تخیل کس لیے لاانتہا رکھتا ہوں میں

در بیابان طلب پیوستہ می کوشیم ما
موج بحریم و شکست خویش بردوشیم ما

*

زیر تشریح نظم "عاشق ہرجائی" خود علامہ اقبال کی اپنی شخصیت سے متعلق ہے جس میں علی الترتیب دس اور پندرہ اشعار شامل ہیں۔ نظم کی تشریح سے قبل اس کے عنوان کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہرجائی عام طور پر برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس اعتبار سے اس عنوان کا مفہوم "بے وفا عاشق" ہونا چاہیے۔ جب کہ یہاں اس لفظ کی بعض دوسری جہات بھی سامنے آتی ہیں جن کے تحت اس کے معنی ہیں ہر جگہ موجود رہنے والا' ہر ایک سے تعلق رکھنے والا اور ایک ایسا شخص جو کسی ایک مقام سے وابستہ نہ رہ سکے۔ اب نظم کے اولین حصے کے اشعار کی طرف آئیے۔

پہلا حصہ: ① سے ⑩ **معنی: مجموعہ اضداد:** ایسے اوصاف کا مجموعہ جو ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ **زمیں فرسا:** زمین پر چلنے پھرنے والا۔ **مانند موج:** لہر کی طرح۔ **تفنن:** گوناں گونی۔ **جبیں فرسا:** پیشانی گھسنے والی۔ **تلون کیش:** وہ شخص جو اپنے انداز بدلتا رہے۔

مطلب: اس بند کے اشعار سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ کوئی اور شخص اقبال سے اس کی ذات اور ان کی خصوصیت کے بارے میں استفسار کر رہا ہے لیکن خیال یہی ہے کہ نظم کے پہلے حصے میں اقبال خود ہی اپنے آپ سے مکالمہ کر رہے ہیں جب کہ دوسرے حصے میں ان استفسارات کے جواب دیتے ہیں جو پہلے حصے میں اٹھائے گئے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ اے اقبال! یوں محسوس ہوتا ہے کہ تو متضاد صفات کا حامل ہے۔ کبھی تو پوری محفل کی رونق تیرے دم سے ہے اور کبھی تنہائی کا شکار نظر آتا ہے۔ تیرے نغموں نے وہ ہنگامے برپا کیے ہیں جن کے سبب خواہ گلستان ہو خواہ صحرا دونوں میں بہار آئی ہوئی ہے۔ تیرے تخیل کی بلندی نے عملاً تجھے فلک پر درخشندہ ستاروں کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔ ہرچند کہ تیری بود و باش تو زمین پر ہی اس کے باوجود آسمانوں تک بھی تیری رسائی ہے۔ تو شراب پیتا ہے اور اسی عالم میں حیرت ہے کہ خالق حقیقی کے حضور سجدہ ریز بھی ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تیرے مسلک میں شراب حرام نہیں بلکہ حلال ہے۔

جس طرح پھول کی خوشبو کسی رنگ اور لباس کی محتاج نہیں کچھ ایسی ہی کیفیت تیری بھی ہے۔ اگرچہ تیرا وجود حکمت و دانش سے بہرہ ور ہے۔ اس کے باوجود تیری شخصیت میں کچھ جنوں کے آثار بھی ہیں جس طرح پانی کی لہر اپنا کوئی نشاں چھوڑے بغیر رواں دواں رہتی ہے اسی طرح تو بھی منزل کی طرف رواں ہے لیکن تمامتر حرکت کے باوجود دریا کے کنارے ایک ہی مقام پر ٹھہرا ہوا بھی ہے۔

تیری فطرت کے لیے حسن نسوانی بجلی کی مانند کشش انگیز ہے۔ اس کے باوجود اس حسن کے لیے تیرے دل میں بے نیازی کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے جو کسی روایتی عاشق کے رویے سے قطعی مختلف ہے۔ تیری زندگی کا انحصار عملی سطح پر تغیر اور انقلاب سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کسی ایک مقام اور آستانے سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔ حسینوں کی بزم میں تجھے ایک ایسے فرد کی مانند گردانا جاتا ہے جو وفا سے نا آشنا ہوتا ہو۔ یہی نہیں بلکہ تجھے بے وفا کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ تجھ میں مستقل مزاجی نام کو نہیں۔ اسی باعث تو ہر جگہ بدنام اور رسوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تو اس عالم رنگ و بو میں پارے کی سی صفات لے کر آیا ہے۔ تیری مضطرب کیفیت کے قربان جائیے! بے شک تو عجب بے چین اور بے تاب انسان واقع ہوا ہے۔

دوسرا حصہ: ① سے ⑦ **معنی:** آشفتگی: پریشانی۔ **رستخیز:** قیامت۔ **شرار جستہ:** تڑپ کر اچھلنے والی چنگاری۔

مطلب: جیسا کہ اس نظم کے ابتدائی حصے میں بتایا گیا ہے کہ دوسرے حصے میں اقبال ان استفسارات کا جواب دیتے ہیں جو پہلے حصے میں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عشق کی آشفتہ سری نے میری شخصیت کو ویران و برباد کر کے رکھ دیا ہے اور سچ پوچھیے تو زیر لباس جو جسم چھپا ہوا ہے وہ گوشت پوست کا نہیں بلکہ مٹی کا ہے۔ میرے دل کے اسی طرح بے شمار پہلو ہیں اور ہر پہلو کا رنگ ایک ترشے ہوئے ہیرے کے رنگوں کی مانند ہیں کہ یہ رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

دیکھا جائے تو شاعر کا دل عملاً دل نہیں ہوتا بلکہ یہ تو ایک طرح سے جذبات و احساسات کے ہنگاموں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ اے بے خبر! تجھے کیا پتہ کہ اس سینے میں کیا ہے؟ دل یا کوئی اور شے! کہ یہ سکون سے بالکل بے گانہ ہے۔ میری ہر کیفیت میں ایک نئے جلوے کی آرزو پوشیدہ ہے۔ یہی باعث ہے کہ میرا دل

بے چین رہتا ہے۔ یہی بے چینی میرا سکون برباد کیے ہوئے ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ میرے پیشِ نظر عام طور پر ایک نیا مظہر حسن ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود یہ امر بھی واضح ہے کہ میں نے ہمیشہ حسن سے جو پیمانِ وفا باندھا ہوتا ہے وہ ہمیشہ مستحکم ہوتا ہے۔

یہ بھی سن لو! کہ میرے حوالے سے جس شے کو بے نیازی کہا جاتا ہے وہی تو میری فطرت میں عجز و انکسار کی آئینہ دار ہے۔ جس طرح صبا تجسس اور سوز و ساز کی آئینہ دار ہوتی ہے میرے دل کا عالم بھی ایسا ہی ہے۔ لمحے بھر کے لیے لو دینے والی چنگاری کا نظارہ میرے لیے کسی طور پر بھی سکون کا سبب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ میرا دل تو بجلی کی صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ ہے جو کسی بھی شے کو خاکستر بنا دینے کی قدرت رکھتی ہے۔

⑧ سے (15) **معنی**: **دردِ انجامیوں**: وہ کیفیت جس کی انتہا درد ہے۔ **افلاسِ تخیل**: خیال کی ناداری۔ **شبنم آسا**: شبنم کی مانند۔ **تنک جلوہ**: خفیف جھلک دکھانے والا۔

مطلب: اس شعر میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ میں اس مکمل جلوے کے دیکھنے کا متمنی ہوں جس کو دیکھنے کے بعد عشق کا ہر تقاضا پورا ہو جائے۔ باری تعالیٰ کے جلوے کی تلاش و جستجو مجھے دنیا کی مختلف اشیا میں جھانکنے کی طرف مائل کرتی ہے اور جس طرح حسن کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہوتی بالکل یہی کیفیت میرے دل کے درد کی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس درد کا کوئی علاج نہیں۔

چونکہ میری پوری زندگی محبت کی ناکامیوں کے درد سے عبارت ہے اس لیے یہ امر قطعی حیرت انگیز نہیں ہونا چاہیے کہ میں اپنے عشق کو وفا کی پابندیوں میں محصور نہ کروں۔ اس امر کی وضاحت وہ زیرِ تشریح شعر میں یوں کرتے ہیں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ وفا عملی سطح پر تخیل کے افلاس کا دوسرا نام ہے اور میرا تخیل چونکہ مفلس نہیں اس لیے میں اپنے دل میں ہر لمحے ایک نیا ہنگامہ برپا رکھتا ہوں۔

میرا دل تو اس قدر وسیع الظرف ہے کہ اس میں دریا بھی سما سکتے ہیں جب کہ میرا ساقی جو شراب دے رہا ہے اس کی مقدار نہایت معمولی سی ہے جب کہ میں تو ایک ازلی پیاسا ہوں۔ یوں لگتا ہے میرے پیروں تلے آگ کا سمندر ہے۔ دراصل میری تخلیق کے باعث دیکھا جائے باری تعالیٰ نے خود ہی اپنا نقاد پیدا کر لیا ہے۔ میں تو فی الواقع ایک ایسی تصویر ہوں جسے اپنے مصور سے گلا ہے کہ جب اس دنیا میں حسن کا جلوہ اتنا ہی محدود تھا تو پھر مجھے وہ فکر و تخیل کیوں دیے جن کی پرواز کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں تو تلاش و جستجو کے صحرا میں مسلسل جدوجہد میں مصروف ہوں اور سمندر کی موجوں کی طرح اپنی شکست کا سامان خود اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرتا ہوں۔

076 کوششِ ناتمام

فرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تابِ صبح
چشمِ شفق ہے خوں فشاں اخترِ شام کے لیے

رہتی ہے قیسِ روز کو لیلیِ شام کی ہوس
اخترِ صبح مضطرب تابِ دوام کے لیے

کہتا تھا قطبِ آسماں قافلۂ نجوم سے
ہمرہو! میں ترس گیا لطفِ خرام کے لیے

سوتوں کو ندیوں کا شوق، بحر کا ندیوں کو عشق! موجۂ بحر کو تپش ماہ تمام کے لیے
حسن ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لیے
راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

*

یہ مختصر نظم محض چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ تاہم اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اقبال نے اپنی مخصوص امیجری استعمال کرتے ہوئے موجودات اور ان کی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں بعض رازہائے سربستہ کھولے ہیں جن سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر شے تلاش و جستجو اور حرکت و عشق کے سبب زندہ ہے۔

معنی: فرقت آفتاب: سورج کی جدائی۔ **خوں فشاں**: خون روتی ہے۔ **تاب دوام**: ہمیشہ کی چمک۔ **لطف خرام**: چلنے کا مزہ۔ **خجستہ گام**: مبارک قدم والا۔

مطلب: چنانچہ زیر تشریح اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ سحر' آفتاب عالمتاب کی جدائی میں بے چین و مضطرب رہتی ہے اور چشم شفق' ستارۂ شام کے فراق میں خون کے آنسو بہاتی ہے۔ اگر دن کے وقت کو مجنوں اور شام کو لیلیٰ تصور کر لیا جائے تو یہ مجنوں اپنی لیلیٰ کو پانے کا خواہاں رہتا ہے۔ جب کہ ستارۂ صبح جو تھوڑی دیر کے لیے چمکتا ہے ہمیشہ زندہ رہنے اور چمکنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔

قطب ستارہ و آسمان پر ایک ہی مقام پر چمکتا رہتا ہے۔ زبان حال سے دوسرے ستاروں سے کہتا ہے کہ میں تو کھڑے کھڑے تھک گیا ہوں اور چلنے کا لطف حاصل کرنے کے لیے بری طرح سے ترس رہا ہوں۔ چشمے ندیوں تک پہنچنے اور ندیاں سمندر میں شامل ہونے کے عشق میں مبتلا رہتی ہیں جب کہ سمندر کی موجیں چودھویں رات کے چاند کی منتظر رہتی ہیں۔ حسن ازل جو لالہ و گل اور دوسرے مظاہر فطرت میں پوشیدہ ہے۔ سنا ہے کہ اپنا جلوہ دکھانے کے لیے مضطرب ہیں۔ اس صورت حال میں اگر کوئی رازہائے زندگی سے آشنا ہونا چاہے تو حضرت خضر سے رجوع کرے۔ وہ یہی جواب دیں گے کہ زندگی کا راز تلاش و جستجو اور حرکت و عشق میں مضمر ہے۔

نوائے غم

077

زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
بربط کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار جس کے ہر تار میں ہیں سیکڑوں نغموں کے مزار
محشرستان نوا کا ہے امیں جس کا سکوت اور منت کش ہنگامہ نہیں جس کا سکوت
آہ! امید محبت کی بر آئی نہ کبھی!
چوٹ مضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی
مگر آتی ہے نسیم چمن طور کبھی! سمت گردوں سے ہوائے نفس حور کبھی

چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے مرا تار حیات　　جس سے ہوتی ہے رہا روح گرفتار حیات
نغمۂ یاس کی دھیمی سی صدا اٹھتی ہے　　اشک کے قافلے کو بانگ درا اٹھتی ہے
جس طرح رفعت شبنم ہے مذاق رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

*

پہلا بند معنی: **رباب:** سارنگی کی قسم کا ایک ساز۔ **بربط:** ایک ساز۔ **محشرستان:** نغموں کی قیامت گاہ۔ **منت کش:** احسان مند۔ **مضراب:** ساز بجانے کا آلہ۔

مطلب: دو بند کی اس مختصر نظم میں اقبال اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری زندگی اس رباب کے مانند ہے جو بظاہر خاموش ہے لیکن جس کے تاروں میں ہر انداز کے نغمے پوشیدہ ہیں اور جس کی خامشی پر کائنات کا وہ ساز بھی نثار ہے جس کا ہر سر دل بستگی کا آئینہ دار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس ساز کی خموشی بھی ایسی نواؤں کی مظہر ہے جو اہل دل کے سینے میں حشر بپا کر دیتی ہیں اور جن کی خامشی کسی ہنگامے کی آئینہ دار نہیں ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ میں نے محبت کی جو آرزو کی وہ کبھی شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی اور میرے قلب پر کبھی اس جذبے نے کوئی زخم نہیں لگایا۔

دوسرا بند معنی: **بانگ درا:** قافلہ کی گھنٹی کی آواز۔ **مذاق رم:** اڑ جانے کا ذوق۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ محبت کے جذبے سے محرومی کے باوجود کبھی کبھی طور سینا سے عشق حقیقی کی ایک لہر میرے دل کے دروازے تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح آسمان کی جانب سے حوروں کے انفاس کی معطر ہوا کی مجھ تک رسائی ہو جاتی ہے۔ یہ سب مل کر قدرے آہنگی کے ساتھ میری زندگی کے تار چھیڑ دیتی ہیں جس کے سبب زندگی کے دام میں گرفتار روح آزاد ہو جاتی ہے۔ اس لمحے غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی ایک دھیمی سی آواز بلند ہوتی ہے۔ اس آواز کو سن کر میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں۔

چنانچہ دیکھا جائے تو جس طرح شبنم کے مرتبے کی بلندی سفر اور حرکت سے وابستہ ہے اسی طرح مایوسی اور نامرادی میری فطرت کے لیے مہمیز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

078 عشرت امروز

نہ مجھ سے کہہ کہ اجل ہے پیام عیش و سرور　　نہ کھینچ نقشۂ کیفیت شراب طہور
فراق حور میں ہو غم سے ہمکنار نہ تو　　پری کو شیشۂ الفاظ میں اتار نہ تو
مجھے فریفتۂ ساقی جمیل نہ کر　　بیان حور نہ کر، ذکر سلسبیل نہ کر
مقام امن ہے جنت، مجھے کلام نہیں　　شباب کے لیے موزوں ترا پیام نہیں
شباب آہ! کہاں تک امیدوار رہے　　وہ عیش، عیش نہیں جس کا انتظار رہے

وہ حسن کیا کہ جو محتاج چشم بینا ہو نمود کے لیے منت پذیر فردا ہو
عجیب چیز ہے احساس زندگانی کا
عقیدہ "عشرت امروز" ہے جوانی کا

*

معنی: **شراب طہور:** پاک شراب جو بہشت میں ملے گی۔ **فراق حور:** حور کی جدائی۔ **سلسبیل:** بہشت کی ایک نہر۔

مطلب: سات اشعار پر مشتمل اس مختصر نظم میں واعظ کو خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ تو میرے سامنے حیات بعد ممات کا جو نقشہ پیش کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ موت تو فی الواقع عیش و عشرت کا پیغام ہے۔ اس کے ساتھ ہی تو مجھے شراب طہور کا جھانسہ بھی دے رہا ہے کہ جنت میں پینے پلانے پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔ اور یہ کہ شراب طہور میں وہ نشہ ہے جو دوسری شرابوں میں نہیں۔

سوائے واعظ! میں تجھ سے واضح طور پر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جنت کی حور کے تصور اور اس کی جدائی میں خود کو مایوسی کے کرب میں گرفتار نہ کر! ساتھ ہی دوسروں کے لیے اس پری کو لفاظی شیشے میں نہ اتار! اے واعظ! مجھے اس خیالی اور تصوراتی حسین و جمیل ساقی کے تذکرے میں نہ الجھا۔ نہ میرے روبرو حوروں کا تذکرہ کر۔ نا ہی جنت میں موجود اس نہر کا جسے سلسبیل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

بے شک مجھے اس خیال سے اختلاف نہیں کہ جنت میں ہر طرح سے امن و امان ہو گا اور دنیا کی طرح ہنگامے نہیں ہوں گے لیکن اے واعظ! تیری یہ خوش کلامیاں عالم شباب کے لیے ناقابل التفات ہیں کہ جوانی کے نزدیک وہ عیش کوئی حیثیت نہیں رکھتا جس کے لیے موت کے بعد تک کا انتظار کرنا پڑے۔ شباب کا عقیدہ تو یہ ہے کہ عیش و عشرت وہی ہے جو انسان کو آج حاصل ہو۔ شباب آخر کتنے عرصے تک حور و شراب اور ساقی کا انتظار کر سکتا ہے اس کے لیے تو عیش و عشرت وہی ہے جو اسے کسی انتظار کے بغیر حاصل ہو جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے واعظ! یہ تو بتا کہ اس حسن کی حیثیت کیا ہے جو کسی دیکھنے والی آنکھ کا محتاج ہو اور اپنے وجود کے اظہار کی خاطر مستقبل کا احسان اٹھانے پر مجبور ہو۔ جب کہ میں تو اس حسن کا قائل ہوں جس کو آج میری نگاہیں دیکھ رہی ہوں۔

زندگانی کا احساس تو اس مفروضے سے قطعی مختلف ہے جس کا اظہار اے واعظ تو ہمارے روبرو ہزار بار کر چکا ہے اس لیے کہ میرے نزدیک تو شباب اس عقیدے کا حامل ہے کہ جو کچھ ملنا ہے آج مل جائے' کل کا انتظار کون کرے۔

ان اشعار میں بظاہر اقبال نے حیات بعد [illegible]ات کے عقیدے کی نفی کی ہے۔ جنت' حور و غلماں اور شراب طہور کے بارے میں واعظ کو طنز کا نش[illegible] بنایا [illegible] لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے فرد کے جذبات کا اظہار کیا ہے کہ جو عالم شبا[illegible] میں ہے۔ [illegible]س کا [illegible] نظر واعظ سے خیالات سے کسی طور پر بھی ہم آہنگ نہیں۔ وہ تو زندگی میں اس [illegible] امر کا قائل [illegible] عالم شباب میں ہی حقیقی لطف سے ہمکنار ہوا جا سکتا ہے۔

079

انسان

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جو بنایا! راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے؟
ہے گرم خرام موج دریا دریا سوئے بحر جادہ پیما
بادل کو ہوا اڑا رہی ہے شانوں پہ اٹھائے لا رہی ہے
تارے مست شراب تقدیر زندان فلک میں پابہ زنجیر
خورشید وہ عابد سحر خیز لانے والا پیام "برخیز"
مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر پیتا ہے مے شفق کا ساغر
لذت گیر وجود ہر شے سرمست مے نمود ہر شے
کوئی نہیں غمگسار انساں!
کیا تلخ ہے روزگار انساں!

*

معنی: راز جو: بھید تلاش کرنے والا۔ **گرم خرام:** چلنے میں مگن۔ **جادہ پیما:** جا رہا ہے۔ **پابہ زنجیر:** پاؤں میں زنجیر پہنی ہوئی ہے۔ **لذت گیر:** مزے لینا۔

مطلب: اقبال کی شاعری اور ان کے تصورات میں یہ امر ایک طرح سے بنیادی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے کہ وہ بے شمار مقامات پر رب ذوالجلال سے گلہ مند نظر آتے ہیں لیکن اس گلہ مندی میں ایک طرح سے اپنائیت کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اس رویے کو تصوف کے حوالے سے بھی دیکھا سکتا ہے بہرحال یہ مقام اس موضوع پر کسی تفصیلی بحث کا نہیں۔ اسی حوالے سے زیر تشریح نظم بھی دیکھیے جس میں قدرت سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اے خدائے عز و جل! اس سے زیادہ انسان پر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کو کائنات کے اسرار و رموز سے واقفیت کے لیے اس میں تحقیق و جستجو کا مادہ پیدا کیا دوسری طرف کائنات کے تمام اسرار کو بھی پردۂ غیب میں رکھا۔ اب جو میں ان بھیدوں کو جاننے کے لیے مضطرب ہوں اس کے باوجود یہ بھید مجھ پر نہیں کھلتے تو مجھے اپنی جستجو کی ابتداء اور انجام پر حیرانی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ یہ کائنات تو ایک طرح سے شیشے کا گھر ہے جس میں وہی کچھ نظر آتا ہے جو اس کے سامنے ہو! یہی وجہ ہے کہ کائنات کے تمام راز انسان کی حیرانی کا سبب ہیں۔

بظاہر کائنات کے مناظر اور ان کی صورت حال یہ ہے کہ دریا کی لہریں تیز رفتاری کے ساتھ محو سفر ہیں اور دریا جو ہے وہ اسی رفتار سے سمندر کی جانب گامزن ہے۔ فضاء میں موجود بادلوں کو ہوا اڑا کر بلندی پر لا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انہیں اس نے اپنے شانوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ آسمان پر ستارے اس انداز

سے روشن ہیں جو ازل سے ان کے لیے مقدر ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آسمان ایک قید خانہ ہے جس میں ستاروں کو قید کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اور ان کے پاؤں میں زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔
سورج جو علی الصبح ایک طرح سے کسی عبادت گزار کی طرح طلوع ہوتا ہے ارو تمام عالم موجودات کے لیے مصروف کار ہونے کا پیغام لاتا ہے اس کا مقدر یہ ہے کہ شام کو مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر شفق کے جام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ مراد یہ کہ غروب آفتاب کے بعد مغرب سے شفق نمودار ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر شے اپنے وجود سے لطف اندوز ہو رہی ہے اور مسرور سرشار ہو کر خود کو ظاہر کرنے کے عمل میں ہے۔
ان تمام حقائق کے پیش نظر کائنات میں صرف انسان ہی ایسی شے ہے جس کا کوئی ہمدرد و غمگسار نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شب و روز کس قدر تلخ واقع ہوئے ہیں۔

جلوۂ حسن

080

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب ۔۔۔ پالتا ہے جسے آغوش تخیل میں شباب
ابدی بنتا ہے یہ عالم فانی جس سے ۔۔۔ ایک افسانہ رنگیں ہے جوانی جس سے
جو سکھاتا ہے ہمیں سر بہ گریباں ہونا ۔۔۔ منظر عالم حاضر سے گریزاں ہونا
دور ہو جاتی ہے ادراک کی خامی جس سے ۔۔۔ عقل کرتی ہے تاثر کی غلامی جس سے

آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں؟
خاتم دہر میں یا رب وہ نگیں ہے کہ نہیں؟

٭

معنی: سر بہ گریباں: گریباں میں سر ڈالنا۔ ادراک: عقل۔

مطلب: یہ مختصر سی نظم محض پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال کے مختلف عناصر میں جلوۂ حسن کی موجودگی کے حوالے سے ایک ایسا نتیجہ اخذ کرتے ہیں جو بڑی حد تک تذبذب اور تشکیک سے ہم آہنگ ہے۔ ہر چند کہ بعض عناصر میں اس کے وجود کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اس کے باوجود وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچتے۔ اقبال کہتے ہیں۔
جلوۂ حسن جو ہماری آرزوؤں اور خواہشات کو مضطرب رکھتا ہے جس کی پرورش کی ذمے داری جوانی نے اپنے تخیل کی آغوش میں لی ہوئی ہے اور جس کے سبب یہ عالم فانی ابدی حیثیت اختیار کیے ہوئے نظر آتا ہے اور جس کے نم سے شباب بذات خود ایک رنگین افسانے کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے یہی جلوۂ حسن جو ہمیں مختلف مسائل کے بارے میں غور و فکر کرنا سکھاتا ہے اور جس کے سبب ہم اپنے حال اور اس کے مسائل سے کٹ کر رہ جاتے ہیں اور جو ہماری سوجھ بوجھ اور عقل کی خامیوں کو دور کرتا ہے اور جس کی وجہ سے عقل و خرد عملاً تاثر و احساسات کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسی جلوۂ حسن کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ کیا وہ حسن موجود بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر دنیا کو انگوٹھی اور جلوۂ حسن کو نگینہ تصور کر لیا جائے تو انگوٹھی میں یہ نگینہ موجود بھی ہے یا نہیں۔

081

ایک شام

(دریائے نیکر (ہائیڈل برگ) کے کنارے پر)

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بیہوش ہو گئی ہے آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

*

یہ نظم اقبال نے جرمنی میں ان دنوں لکھی جب وہ 1907ء میں وہاں فلسفے کے مضمون میں پی ایچ ڈی کرنے گئے تھے۔ میونخ سے وہ ہائیڈل برگ چند روز کے لیے یوں گئے کہ وہاں کے کتب خانے سے استفادہ کر سکیں۔ دریائے نیکر بھی ہائیڈل برگ کے گردونواح میں بہتا ہے۔ اسی دریا کے کنارے پر بیٹھ کر اقبال نے یہ اشعار کہے۔

معنی: نوا فروش: نغمے گانے والے یعنی پرندے۔ **سبز پوش**: مراد درخت۔ **بے درا**: گھنٹی کے آواز کے بغیر۔ **مراقبے**: گیان دھیان۔

مطلب: فرماتے ہیں کہ عجب منظر ہے۔ چاند کی چاندنی خاموش ہے اور دریا کے کنارے جو درخت استادہ ہیں ان کی شاخیں بھی ساکن و ساکت ہیں۔ اس وادی کے تمام چرند پرند اور سامنے پہاڑوں پر اگے ہوئے تمام سرسبز و شاداب پودے بھی اس طرح خاموشی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں جیسے تمام مظاہر فطرت اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکے ہوں۔ فطرت شاید مدہوش ہو کر رات کی گود میں سو رہی ہے۔

اس خامشی کا جادو کچھ ایسے چل رہا ہے کہ دریائے نیکر کا بہتا ہوا رواں دواں پانی بھی خاموش نظر آتا ہے۔ آسماں پر ستاروں کا قافلہ انتہائی خامشی کے ساتھ رواں دواں ہے اور کسی شور و شغب کے بغیر اپنی منزل کی جانب گامزن ہے۔ اس وادی کے پہاڑ، صحرا اور دریا اس طرح سے خاموش نظر آتے ہیں کہ ان کی خامشی سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فطرت نہایت انہماک کے ساتھ گیان دھیان اور غور و فکر میں مصروف ہے۔ اس صورت حال میں اقبال اپنے دل کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ یہاں کہ جملہ عناصر کی طرح تو بھی خاموش ہو جا اور غم کی آغوش میں سو جا۔

تنہائی

082

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا؟ انجم نہیں تیرے ہمنشیں کیا؟
یہ رفعت آسمان خاموش خوابیدہ زمیں' جہان خاموش
یہ چاند' یہ دشت و در' یہ کہسار فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوش رنگ پیارے پیارے یعنی' ترے آنسوؤں کے تارے
کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

*

معنی: حزیں: غمگین۔ نسترن زار: موتی کے پھولوں کا باغ۔

مطلب: معلوم ہوتا ہے کہ "بانگ درا" میں اس دور کی جو نظمیں ہیں اقبال نے بیشتر مناظر فطرت کے حوالے سے تخلیق کی ہیں۔ ان میں کہیں کہیں ان کے فکر و فلسفے کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے تاہم نظموں کی بنیادی خصوصیت ان کی امیجری ہے۔ زیر تشریح نظم "تنہائی" کو بھی انہی معروضات کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ یہ نظم بھی محض پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ جن میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں۔

اے انسان! شب کی اس تنہائی میں تو خود کو کیوں ملول و افسردہ محسوس کر رہا ہے۔ تو نظر اٹھا کر دیکھتا نہیں کہ ستارے بھی تیرے ہم نشیں ہیں۔ تو ذرا غور کرے تو یہ حقیقت تجھ پر واضح ہو جائے گی کہ اتنا بلند ہونے کے باوجود آسمان بھی خاموش اور پر سکوت ہے اور یہ زمین تو اس طرح سے خاموش ہے جیسے سوئی ہوئی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ پوری دنیا میں سناٹا ہے اور شور و شغب سے خالی ہے۔

اے انسان! ان مظاہر فطرت پر نظر ڈال کہ ان میں چاند' صحرا اور پہاڑ سب کچھ شامل ہیں ان کے باعث یہ کائنات پھولوں سے مزین ہے اور گلستان بنی ہوئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ جو خوش رنگ' خوبصورت اور پیارے پیارے موتی ہیں وہ تیرے آنسوؤں کی مانند ہیں۔ اے انسان! یہ تو بتا کہ ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے بھلا تجھے اور کس شے کی تمنا اور ہوس ہے۔ جب کہ ساری فطرت اور تمام مناظر فطرت تیرے جذبات سے ہم آہنگ ہو کر تیرے رفیق بن چکے ہیں۔

پیام عشق

083

سن اے طلبگار درد پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومنات دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا

نہیں ہے وابستہ زیر گردوں' کمال شان سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

غرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرض قدیم ہے تو' ادا مثال نماز ہو جا

نہ ہو قناعت شعار گلچیں! اسی سے قائم ہے شان تیری
وفور گل ہے اگر چمن میں' تو اور دامن دراز ہو جا

گئے وہ ایام' اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانند شمع سوزاں میان محفل گداز ہو جا

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستی قوم ہے حقیقی فدا ہو ملت پہ، یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

*

سات اشعار پر مشتمل اقبال کی یہ نظم عملی سطح پر ایک ایسے پیغام کی حیثیت رکھتی ہے جو ابتدائی ایام میں ان کے فکر و فلسفے کا نمائندہ رہا۔ یہ امر پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ "بانگ درا" اقبال کا اولین شعری مجموعہ ہے جو ان کی شاعری کے ابتدائی حصے پر مشتمل ہے۔ زیر تشریح نظم میں اقبال اپنے ہم عصر لوگوں کو پیغام دیتے ہیں۔

① سے ⑦ **معنی**: **غزنوی**: سلطان محمود غزنوی۔ **ایاز**: سلطان محمود کا مشہور غلام۔ **پیکار زندگی**: زندگی میں جدوجہد۔ **قناعت شعار**: قناعت پسند۔ **وفور گل**: پھولوں کی بہتات۔ **دامن دراز**: لمبے دامن۔ **صحرا نوردیوں**: بیاباں میں گھومنا۔ **آتش زن**: آگ لگانے والا۔ **فرقہ ساز**: فرقے بنانے والا۔

مطلب: اے میرے ہم عصر انسان! اگر تو عشق حقیقی کا طلبگار ہے تو میری طرح محبوب کی شخصیت کو عزیز رکھتے ہوئے تو بھی یہی رویہ اختیار کر۔ اگر دل کو سومنات کا مندر تسلیم کر لیا جائے تو میری شخصیت محمود غزنوی کے مماثل ہے۔ جس نے اس مندر کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا جب کہ تجھے ایاز کا روپ دھار کر عجز و انکسار کا وہی رویہ اختیار کر لینا چاہیے جو ایاز کا خاصہ تھا۔ یہ جان لے کہ کائنات میں حصول عروج و کمال کے لیے سکندر اعظم جیسے فرمانروا کی شان و شوکت ضروری نہیں ہوتی۔ سکندر نے بے شک وہ تاریخی آئینہ ایجاد اور نصب کیا جو بعد میں تاریخ کا حصہ بن گیا لیکن جان لے کہ تیرے سینے میں بھی ایسے کمالات چھپے ہوئے ہیں تو اگر ان کو ظاہر کر دے تو تجھے بھی لوگ سکندر اعظم سے کم مرتبہ کا اہل نہیں سمجھیں گے۔

مسلسل جدوجہد زندگی میں عروج و کمال حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے بے شک تیری شخصیت ابھی پہلی رات کے چاند کی سی ہے تاہم مسلسل جدوجہد کے ذریعے یہ امر ناممکن نہیں کہ تو بدر کامل بن جائے یعنی انتہائی عروج و کمال حاصل کر لے۔ تجھے تو باری تعالیٰ نے ہزاروں برس قبل دنیا میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اسی طرح نماز کی ادائیگی کے لیے مخصوص ضابطوں پر عمل ضروری ہوتا ہے۔ یہ امر بھی ذہن نشین کر لے کہ کبھی کبھی قناعت کا شعار بھی حالات سے ہم آہنگ نہیں ہوتا اگر خداوند ذوالجلال اپنی نعمتوں میں مزید وسعت پیدا کرتا ہے تو تیری طلب کا دامن بھی دراز ہو جانا چاہیے۔ بصورت دیگر تیرا رویہ کفران نعمت سے تعبیر کیا جائے گا۔

وہ دور تو کبھی کا ختم ہو چکا جب قیس کی طرح عشق میں لوگ صحرا نوردی اختیار کر لیتے تھے اور اپنے شہر کے علاوہ گھر اور عزیز و اقارب سے بھی بے نیاز ہو جاتے تھے اب تو یہ امر لازم ہے کہ شمع کی طرح محفل کو روشنی عطا کر۔ اس شعر میں اقبال نے عملاً رہبانیت کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ اب تو لوگوں کے درمیان رہ کر ہی ملک و ملت کے لیے جدوجہد کرنا لازمی امر ہے۔

زیر تشریح شعر میں اقبال ایک اہم نکتہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں فرد کی زندگی تو مجازی اور غیر حقیقی ہوتی ہے جو نا قابل اعتبار ہے۔ کوئی بھی تو یہ نہیں جانتا کہ وہ کب تک زندہ رہے گا۔ جب کہ فرد کے بالمقابل قوم کا وجود حقیقی ہوتا ہے۔ افراد مٹ جاتے ہیں لیکن قومیں زندہ رہتی ہیں چنانچہ یہ امر لازم

ہے کہ ذاتی نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر قوم کی تعمیر کے لیے جدوجہد کی جائے۔
نظم کے اس آخری شعر میں اقبال اپنے عہد میں ہندی مسلمانوں کی فرقہ پرستی کو آزری اور بت تراشی کے علاوہ بت پرستی سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ ان لوگوں کا یہ رویہ افسوسناک ہے لہذا بہتر یہی ہے کہ اس نوع کی بت پرستی سے دامن بچا کر مدینہ کی راہ اختیار کی جائے اور وہیں زندگی گزاری جائے۔

فراق

084

تلاش گوشہ عزلت میں پھر رہا ہوں میں — یہاں پہاڑ کے دامن میں آ چھپا ہوں میں
شکستہ گیت میں چشموں کے دلبری ہے کمال — دعائے طفلک گفتار آزما کی مثال
ہے تخت لعل شفق پر جلوس اختر شام — بہشت دیدۂ بینا ہے حسن منظر شام
سکوت شام جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے

یہ کیفیت ہے مری جان ناشکیبا کی! — مری مثال ہے طفل صغیر تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز — صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز
یونہیں میں دل کو پیام شکیب دیتا ہوں
شب فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

*

پہلا بند معنی: طفلک گفتار آزما: وہ بچہ جو بولنے کی مشق کر رہا ہو۔ **تخت لعل شفق:** شفق کا لعل جڑا ہوا تخت۔ **بہشت دیدۂ بینا:** دیکھنے والی آنکھ کے لیے بہشت۔

مطلب: اقبال کی یہ نظم دو بند پر مشتمل ہے جن میں سات اشعار ہیں۔ ان اشعار میں وہ محبوب سے ہجر و فراق کے لمحات میں اپنی نفسیاتی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری بے چینی اور اضطراب کا یہ عالم ہے کہ ایسے مقام پر جہاں تنہائی نصیب ہو سکے اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں چنانچہ اسی تلاش کے سبب مجھے ایک پہاڑ کے دامن میں پناہ لینا نصیب ہوا ہے۔ یعنی تنہائی کی تلاش پہاڑ کے دامن تک لے آئی ہے۔

یہاں پہاڑ سے نکلنے والے چشموں کی روانی سے اپنے نغمے پھوٹ رہے ہیں جو دلکشی اور محبوبیت کے حامل ہیں۔ یہ نغمات اس بچے کی آواز کے مانند ہے جو اپنی توتلی زبان میں بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس لمحے پہاڑ کے دامن سے بوقت شام سورج غروب ہونے کے عمل میں ہے اور اس کے سبب جو شفق پھوٹی ہے اس کے پس منظر میں شام کا ستارہ اپنی پناہ گاہ سے برآمد ہو رہا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ خوبصورت منظر بہشت کے مناظر کی طرح حسن و جمال سے ہم آہنگ ہے۔ محبوب کے ہجر و فراق میں شام کے وقت کا سکوت اور تنہائی میرے لیے ایک بہانہ ثابت ہو رہے ہیں کہ اپنے محبوب کی یاد میں نغمے گاؤں۔

دوسرا بند **معنی:** سرود: راگ گیت۔

مطلب: پہلے بند میں محبوب کے ہجر و فراق کے سبب جو کیفیت پیدا ہوئی ہے اس کے تسلسل میں دوسرے بند کے اشعار میں اقبال اسی کیفیت کی دوسرے انداز میں اعادہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ

میری مضطرب، بے چین اور بے صبر روح کی حالت محبوب کی جدائی میں اس ننھے بچے کی مانند ہے جو کچھ بولنے کی کوشش میں غوں غاں کرتا رہتا ہے اور اس سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے اس کو کسی دوسرے شخص کی آواز سمجھ کر مسرت و خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کلکاریاں مارتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس تنہائی میں میں بھی اس ننھے بچے کی طرح اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا ہوں اور نغمے گا گا کر ہجر و فراق کی رات کو فریب دینے کی سعی میں ہمہ تن مصروف ہوں۔

مراد یہ ہے کہ محبوب سے جدائی اور فراق کی گھڑیاں ایک عاشق کے لیے اس قدر کرب آمیز اور جانگسل ہوتی ہیں کہ وہ تمام ہنگامہ ہاؤ ہو کو ترک کر کے کوئی ایسا گوشہ تنہائی تلاش کرتا ہے جہاں فراق کے اس کرب سے نجات حاصل ہو سکے وہاں وہ اپنی دھن میں اسی طرح ہجر و فراق کے نغمے گا کر خود کو اس طرح سے فریب دیتا ہے جیسے ایک ننھا بچہ اپنی غوں غاں کو دوسرے کی آواز جان کر خوش ہوتا ہے۔

عبد القادر کے نام

085

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں

اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق
سنگ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خون زلیخا کر دیں

اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں

رخت جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محو رخ سعدی و سلیمی کر دیں

دیکھ! یثرب میں ہوا ناقۂ لیلی بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگر شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردی مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دیں

شمع کی طرح جییں بزم گہ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

ہر چہ در دل گذرد وقف زباں دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

❋

زیر تشریح نظم سے اس امر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اقبال نے یہ اشعار خط کی صورت میں اپنے بہترین اور جگری دوست سر عبد القادر کے نام لکھ کر بھیجے تھے۔ اقبال اور سر عبد القادر خیالات و نظریات کے خوا[illegible] قدر ہم آہنگ نظر آتے کہ علامہ کی شاعری کا ایک بڑا حصہ سر عبد القادر کی زیر

ادارت مشہور زمانہ جریدے مخزن میں ہی شائع ہوا۔ اس امر کی شہادت میں مخزن کی فائلوں اور علامہ کی بعض دوسری تحریروں سے ہوتا ہے۔

معنی: افقِ خاور: مشرق۔ **شعلہ نوائی:** ایسے نغمے گانا جن سے شعلے نکلیں۔ **اثر صیقل عشق:** سچے عشق کی جلا کا اثر۔ **تپش آمادہ:** تڑپنے کے لیے تیار۔ **آئین نمو:** پھلنے پھولنے کا قانون۔ **سعدی و سلیمی:** عرب لڑکیوں کے نام۔ **دردل گذرد:** جو دل پر گزرتی ہے۔

مطلب: چنانچہ سر عبدالقادر سے مکالمہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ یہ خطہ مشرق جو ہمیشہ علم و فضل کا گہوارہ رہا ہے اور جس سے فہم و دانش کی روشنی ہمیشہ طلوع ہوتی ہے وہاں پر ظلمت' تاریکی اور جہالت نے اپنا تسلط جما لیا ہے۔ ان حالات میں ہم پر لازم ہے کہ اپنی جدوجہد اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے اس ظلمت اور جہالت کو فکر و احساس کی روشنی سے منور کر دیں۔ ہم میں اظہار کی قوت تو موجود ہے۔ یہی قوت قوم و ملت کی فرسودہ بساط کو تہ و بالا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اسی طور یہاں انقلاب کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے۔

اگر ہم ملت کو یہ باور کرا دیں کہ عشق حقیقی کو ہی تکمیل مقاصد کے لیے بروئے کار لایا جائے اور حالات کا مقابلہ سچے جذبے اور تڑپ سے کیا جائے تو ہمارے حال کی سنگینی مستقبل کی خوش حالی اور بہتری میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اپنی قوم کو درخشاں ماضی کی جھلک دکھا کر اس کے افراد کے قلوب میں وہی جذبہ اور تڑپ پیدا کر دیں جو یوسفؑ کو دیکھ کر زلیخا کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ مراد یہ کہ حصول مدعا کا تصور بھی انسان کے لیے عمل ارتقاء کا موجب ہو سکتا ہے۔

قوم کو ترقی کے لیے اس طرح آمادہ کریں کہ وہ جدوجہد کر کے انتہائی عروج پر پہنچ جائے۔ اب تک تو ہم دوسروں کی تہذیب کے شیدائی رہے ہیں اور انہی کی نقل کرتے رہے ہیں لیکن اب یہ ضروری ہو گیا کہ ملت کو اپنی تہذیب اور اقدار کی طرف راغب کریں۔ افسوسناک امر تو یہ ہے کہ اب تو مدینے میں یعنی اسلامی دنیا میں بھی وہ صلاحیت باقی نہیں رہی کہ دوسروں کو متاثر اور گرویدہ کر سکے لہٰذا یہ ضروری ہو گیا ہے کہ انہیں ایسی نئی روایت سے آگاہ کیا جائے جو ہماری بنیادی تہذیب اور اقدار سے ہم آہنگ ہو۔

اے میرے رفیق! اب تو صورت حال یہ ہے کہ لوگوں کو عام نشے سے مدہوش نہیں کیا جا سکتا بلکہ اب تو ایسے نشے کی ضرورت ہے جو انتہائی جدید اور تیز ہو۔ ایسا نشہ جو آلات مے نوشی کو پگھلا کر رکھ دے۔ یورپ کے دوران قیام ہم ملت اسلامیہ کی تنظیم اور عروج کے لیے جو منصوبے بنایا کرتے تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب ان منصوبوں کو ان کی تفصیلات کے ساتھ افراد ملت کے دلوں میں منتقل کر دیں۔ بالکل شمع کی طرح کہ شمع خود بھی جلتی ہے اور اپنی روشنی سے بزم کو منور بھی کر دیتی ہے۔ ہمیں بھی شمع کی روش اختیار کرتے ہوئے اپنی فکر و محسوسات کو اپنی تخلیقات کے ذریعے لوگوں تک پہنچانا چاہیے۔

صقلیہ

086

(جزیرۂ سسلی)

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اک جہان تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصر کہن کو جن کی تیغ ناصبور

مردہ عالم زندہ جن کی شورش قم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیر توہم سے ہوا

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

آہ! اے سسلی! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو

زیب تیرے خال سے رخسار دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے

ہو سبک چشم مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر

آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں؟
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں

درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

*

ہسپانیہ کا مشہور جزیرہ **صقلیہ** جسے سسلی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ خلفائے عثمانیہ کے عہد میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پورا ہسپانیہ مسلمانوں کے زیر نگیں تھا۔ اقبال جب بحری جہاز کے ذریعے یورپ سے ہندوستان واپس آ رہے تھے تو ان کا جہاز صقلیہ کے جزیرے سے بھی گزرا۔ ماضی کی شاندار تاریخ کے حوالے سے اس دم ان کے ذہن پر جو تاثرات مرتب ہوئے ان کا اظہار اس نظم میں کیا گیا ہے۔

پہلا حصہ **معنی:** خونابہ بار: خون برسانے والی۔ **عصر کہن:** پرانا زمانہ۔ **تیغ ناصبور:** بے صبر تلوار۔

مطلب: سترہ اشعار پر مشتمل یہ نظم عملاً تین حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اقبال پہلے حصے کے اشعار میں کہتے ہیں کہ وہ سامنے عرب مسلمانوں کی شان و شوکت اور تہذیب کا مزار نظر آ رہا ہے۔ اس کے باقیات کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھ اور پھر خون کے آنسو بہا لے! کبھی یہ جزیرہ ان عرب صحرا نشینوں کے اقتدار کا مظہر ہوا کرتا تھا جن کے لیے سمندر ایک تماشے کی حیثیت رکھتا تھا۔ جن کے خوف سے بڑے بڑے شہنشاہوں کے درباروں میں لرزہ آ جاتا تھا۔ اور جن کی تلواروں میں بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ جو دشمنوں کو خاک و خون میں ملا کر رکھ دیتی تھیں۔

ان مجاہدین کا وجود فرسودہ روایات کا خاتمہ کر کے ایک نئی تہذیب کو جنم دینے کا سبب بنا کرتا تھا۔ ان کی تلواروں نے ماضی کی فرسودہ روایات کو فنا کر کے رکھ دیا تھا۔ جن کے نعروں سے اس وقت کے مردہ عہد میں جان پڑ گئی تھی اور وہاں کے باسی توہمات کی دنیا سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے لگے تھے۔ وہی عرب جن کے نعرے اب تک فضا میں گونج رہے ہیں کیا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے؟

دوسرا حصہ: **معنی:** **بحر پیما:** سمندر میں سفر کرنے والا۔ **سبک:** پر لطف رہے۔

مطلب: زیر تشریح نظم کے ان اشعار میں اقبال "جزیرۂ سسلی" کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے ہیں کہ! بیشک اے سسلی! سمندر کا وقار اور عظمت تیرے ہی دم سے ہے اگر اس سمندر کو پانی کا ایک صحرائے بیکراں تصور کر لیا جائے تو تیرا وجود اس صحرا میں بھٹکے ہوئے جہازوں اور مسافروں کے لیے ایک رہنما کی حیثیت کا حامل ہے۔ اے سسلی! تیرا وجود تو اس ماحول میں ایک ایسے تل کے مانند ہے جو خوبصورت چہروں پر زیب و زینت کا باعث ہوتا ہے۔ رات کے لمحات میں تیری روشنیاں جہازرانوں کے لیے اطمینان اور رہنمائی کا سبب بنتی ہیں۔

اے سسلی! خدا کرے اس سمندر میں تیرا وجود ہمیشہ برقرار رہے اور اہل مسافرت کے لیے تو ہمیشہ رہنمائی کے فرائض انجام دیتا رہے اور سمندر کی بپھری ہوئی موجیں ہمیشہ تیرے ساحل کی چٹانوں پر رقص کرتی رہیں۔

اے سسلی! یہ مت بھول کہ تو کبھی اس قوم کی تہذیب سے ہم آہنگ تھا جس کے طنطنے سے ساری دنیا لرزتی تھی۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے زیر تسلط تیری شان و شوکت انتہائی عروج پر رہی۔ آج وہ موجود نہیں پھر بھی تو دنیا کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔

تیسرا حصہ **معنی:** **نالہ کش:** نوحہ کرنے والا۔ **شیراز کا بلبل:** شیخ سعدی۔ **جہان آباد:** دہلی کا دوسرا نام۔

مطلب: اے سسلی! میں جانتا ہوں کہ بغداد کی تباہی نے سعدی جیسے بلند پایہ شاعر کو خون کے آنسو بہانے پر مجبور کیا۔ داغ مرحوم دہلی کی تباہی پر نالہ کشاں ہوئے۔ جب غرناطہ کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور وہاں کی تہذیب کو گھن لگ گیا تو ابن بدروں اس المیے پر نالہ و فریاد کرتا رہا۔ یہ سارے غم اس عہد کے شعراء اور دانشوروں نے اپنے لیے مخصوص کر لیے جب کہ مجھے یعنی اقبال کو قدرت نے تیری تباہی کے دکھ سے نوازا ہے۔ اس لیے کہ میں ہی تیری عظمت و شان سے آگاہی رکھتا ہوں۔

چوتھا حصہ **معنی:** **آثار:** کھنڈر۔

مطلب: نظم کے ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ اے سسلی! مجھے زبان حال سے اتنا بتا دے کہ تیری برباد ہونے والی قدیم عمارتوں میں کن لوگوں کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ہر چند کہ تیرا ساحل ساکت و خاموش ہے۔ اس کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنے کا خواہاں ہے۔ سو میں جو خود بھی سراپا درد کی حیثیت رکھتا ہوں اس سے اپنے دکھ اور کرب کا احوال بیان کر دے۔ یہ جان لے کہ جس قوم نے تجھے اپنی منزل قرار دے کر تیری شان و شوکت میں اضافہ کیا تھا میں بھی اسی قوم کا ایک فرد ہوں۔

اے جزیرہ سسلی! آج پھر مجھے ایام ماضی کی داستانیں سنا دے اور یہ بتا دے کہ میرے اسلاف کی شان و شوکت کیسی تھی۔ بے شک ان داستانوں کو سن کر میں مضطرب ہو جاؤں گا تاہم اپنے وطن جا کر وہاں کے لوگوں کو بھی یہ داستانیں سناؤں گا اور جس طرح میں یہاں آنسو بہا رہا ہوں وہاں کے لوگ بھی اس انقلاب زمانہ پر خون کے آنسو روئیں گے۔

(حصہ دوم)

محققین کے مطابق حصہ دوم کی چھ غزلیں اقبال نے 1905ء سے 1907ء تک کے عرصے میں تخلیق کیں۔ انہی ایام میں انہوں نے جو نظمیں لکھیں ان کی تشریح گزشتہ صفحات میں کی جا چکی ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر غیر ضروری نہ ہو گا کہ حصہ اول کی تخلیقات کے مقابلے میں زیر تشریح غزلیں فکری سطح پر قدرے مختلف ہیں اور اقبال کی شاعری میں جو تبدیلی رونما ہوئی ان کی آئینہ دار ہیں۔

غزلیات

غزل ①

087

زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے رم کے سوا کچھ بھی نہیں
گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی، گریہ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم، تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں
زائران کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں؟

*

حصہ دوم میں علامہ اقبال کی زیر تشریح غزل محض چار اشعار پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ گذشتہ سطور میں بتایا گیا ہے کہ حصہ دوم کی نظموں اور غزلوں میں اقبال اپنی پہلی تخلیقات سے قدرے مختلف نظر آتے ہیں اور یہ ایک فطری امر ہے۔ اس لیے کہ ہر بڑا فنکار تخلیقی سطح پر ارتقاء کے عمل میں رہتا ہے۔ اس کے لیے کسی ایک مقام پر ٹھہر جانا ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا اقبال کے آئندہ کلام کو بھی اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔ زیر تشریح غزل کے مطلع میں وہ یوں گویا ہوئے ہیں کہ

① **معانی:** رم: بھاگنا۔

مطلب: کائنات میں حیات انسانی دیکھا جائے تو ایک سانس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ کسی لمحے بھی اس جہان فانی سے رخصت ہو سکتا ہے۔ پھر یہ سانس بھی کیا ہے محض ہوا کی ایک لہر کے مانند۔ جو ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے کبھی ایک سمت جاتی ہے اور کبھی دوسری سمت میں سرگرم سفر رہتی ہے۔ نتیجتہ" یہ کہنا درست ہو گا کہ دنیا میں انسان کی زندگی ناپائیدار ہوتی ہے

② پھول کے نزدیک زندگی محض مسکرانے کا دوسرا نام ہے۔ جب کہ شمع کے نزدیک اس کی حیثیت غم واندوہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

③ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ زندگی اس وقت ایک راز کی حیثیت رکھتی ہے جب تک کہ اس کے رازہائے درون پردہ سے کوئی آگاہی حاصل نہ کر لے لیکن جب اس پر یہ راز منکشف ہو جائیں تو پھر اصل حقیقت اس محرم راز کی بھی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ راز منکشف ہونے کے بعد اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔

④ **معنی:** **زائران کعبہ:** کعبہ کی زیارت کرنے والے۔ **زمزم:** کعبہ کے نزدیک ایک کنواں۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جو لوگ حج یا عمرے کے لیے کعبہ تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور وطن واپسی پر بڑے فخر سے ہمراہ لائے جانے والے آب زمزم کو دوستوں اور عزیزوں میں اس طرح تقسیم کرتے ہیں جیسے کہ یہاں اس سے بڑا دوسرا کوئی تحفہ نہ تھا حالانکہ وہاں سے لانے کے لیے تو حرارت ایمانی سے بڑھ کر دوسرا کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔

②

088

الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سر پیرہن نہیں ہے

ملا محبت کا سوز مجھ کو، تو بولے صبح ازل فرشتے
مثال شمع مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہیں ہے

یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیر چرخ کہن نہیں ہے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری، کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، انہیں مذاق سخن نہیں ہے

❋

① **معنی: خجستہ پے**: مبارک قدم والی۔ **سودائے بخیہ کاری**: سینے کا خبط۔ **سر پیرہن**: لباس کا خیال۔

مطلب: اقبال زیر تشریح غزل کے پہلے شعر میں رب ذوالجلال سے درخواست کرتے ہیں کہ انسان کے لیے عقل و دانش بے شک باعث افتخار ہوتی ہیں تاہم جب تک اس میں جنون کی آمیزش نہ ہو تو تنہا عقل، عضو معطل کی سی حیثیت رکھتی ہے کہ عقل کا رویہ تو اکثر جذبہ عشق کی نفی کے مصداق ہوتا ہے جو کسی طور بھی فطرت انسانی سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔

② جب مجھے اللہ تعالیٰ نے اس عالم رنگ و بو میں بھیجتے ہوئے محبت کا سوز عطاء کیا تو فرشتوں کو اس نعمت پر حسد ہوا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ تیرا وجود تو کسی مقبرے پر روشن ہونے والے دیئے کی مانند ہے اور یہ دنیا ہمیشہ تیرے اس جذبے سے بیگانہ رہے گی۔

③ **معنی: چرخ کہن**: بوڑھا آسمان۔

مطلب: اے دل! جان لے کہ اس دنیا میں کسی کا کوئی مونس و غمخوار نہیں ہے۔ اس کے باوجود تو کسی ایسے ہمدرد شخص کا خواہاں ہے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کوشش میں تجھے قطعی طور پر ناکامی ہو گی۔

④ اقبال نے اس شعر میں وطنیت کے تصور کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری ملت دوسری اقوام کے مقابلے میں وطن اور اس کی وحدت کے تصور سے بے نیاز ہے اس کی انفرادیت بھی یہی ہے۔

⑤ یہ کہنا مبالغہ پر مبنی ہے کہ انسان عدم سے وجود میں آتا ہے اور پھر مرنے کے بعد عدم کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ تصور ایک دھوکے کی مانند ہے۔ بحیثیت مسلمان ہم تو کسی دوسرے مقام کو تو کیا عقبیٰ کو بھی اپنا وطن تصور نہیں کرتے اس لیے کہ ہم تو ہر شے میں موجود ہیں۔

⑥ **معنی: مدیر مخزن**: رسالہ "مخزن" کے ایڈیٹر۔

مطلب: مقطع میں اقبال یوں گویا ہیں کوئی سر عبدالقادر (مدیر مخزن) کو میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ دنیا بھر کی قومیں اپنی جدوجہد کے ذریعے بے شک کارنامے انجام دے رہی ہیں اور ترقی کی راہ پر بھی گامزن ہیں لیکن

حقیقت یہ ہے کہ وہ عملاً تخلیقی جوہر کا ادراک نہیں رکھتیں۔

089

③

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے، گویا مزار ہے حرف آرزو کا

جو موج دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری
گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھکو سامان آبرو کا

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سرو کنار جو کا

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسم ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسم خاکی، غبار تھا کوئے آرزو کا

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں؟
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا، اتنا بیدرد کیوں ہے انساں؟
تری نگاہوں میں ہے تبسم شکستہ ہونا مرے سبو کا

ریاض ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقت گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

سپاس شرط ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے، وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھکو گرے رگ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رخت سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا؟

جو گھر سے اقبال دور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثال گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا

*

① سے ③ معنی: صدف نشینی: سیپی میں چھپا ہوا۔ **کنار جو:** ندی کا کنارا۔

مطلب: اقبال کی یہ غزل تیرہ اشعار پر مشتمل ہے جس کے مطلع میں وہ کہتے ہیں کہ بظاہر میں خاموش ہوں اور میری یہ خاموشی ایک طرح سے آرزوؤں اور تمناؤں کے مقبرے کے مانند ہے تاہم زمانہ اس حقیقت سے جلد ہی آگاہ ہو جائے گا۔ جب میری شاعری یہاں ایک انقلاب برپا کر دے گی۔ دوسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کا حقیقی مفہوم ہر شے کی ضرورت اور تجربے کے مطابق متعین ہوتا ہے۔ دریا کی موجوں کی شان و شوکت اگر ان کی روانی میں مضمر ہے تو موتی سیپی میں بند رہ کر اپنی شناخت کا ضامن بنتا ہے۔ تیسرے شعر میں اقبال یوں گویا ہوئے ہیں کہ کسی شے میں جوہر قابل ہی نہ ہوں تو اس کی دیکھ بھال اور تربیت سے کچھ فرق نہیں پڑتا اس کی ایک مثال ندی کے کنارے ایستادہ سرو کی ہے جو اپنی فطرت کے مطابق نمی حاصل کر کے سرسبز و شاداب رہتا ہے جب کہ اس کا عکس ہمہ وقت پانی میں موجود رہنے کے باوجود کسی قسم کی نشوونما کا متحمل نہیں ہوتا۔

④ سے ⑥ معنی: نگار خانہ ہے آرزو کا: آرزو کے نقش و نگار دکھائی دیتے ہیں۔ **طلسم ہوس:** تمناؤں کا گورکھ دھندا۔

مطلب: اقبال زیر تشریح شعر میں رب ذوالجلال کو متوجہ کر کے کہتے ہیں کہ میں یہاں جس شخص کو بھی

ملا ہوں اس کے دل میں خواہشات اور آرزوؤں کی ایک دنیا آباد پائی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ تیری یہ دنیا آرزوؤں اور خواہشات کا طلسم کدہ ہے۔ بعد از ممات اس حقیقت کا ادراک نہیں کہ زندگی سراسر ایک طلسم کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ حتیٰ کہ عمر بھر جس جسم کو مٹی سے بنا ہوا تصور کرتے رہے وہ بھی فی الواقع آرزو اور خواہشات کی گرد کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ غزل کے چھٹے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ انسان ہمیشہ کسی ایسی شے کی تلاش میں ہی سرگرداں رہتا ہے جو کہ اس کی نظروں سے چھپی ہوئی ہو اس لیے کہ دل اس شے کا نظارہ کرنا چاہتا ہے اس لیے اس کی تلاش و جستجو رہتی ہے۔ بلاشک و شبہ یہ شعر تلاش حق کے حوالے سے کہا گیا ہے۔

⑦ سے ⑨ **معنی:** ریاض ہستی: ہستی کا باغ۔

مطلب: اس شعر میں بقول اقبال جب باغ میں پھول توڑنے والے نے شاخ سے غنچے کو تراش لیا تو وہ زبان حال سے گویا ہوا کہ مجھے اتنا بتا دے کہ جب میں کھل کر پھول بن جاتا ہوں تو تو اسے میرے تبسم سے تعبیر کرتی ہے جب کہ یہ عمل تو فنا کی جانب ایک قدم ہے۔ زندگی کو اگر ایک باغ تصور کر لیا جائے تو اس باغ کے ہر ذرے سے محبت ہی محبت کا جلوہ نظر آئے گا۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے اے انسان! تو پھول کی حقیقت سے آگاہی حاصل کر کہ اس کی اہمیت اس وقت تک یہی ہے کہ اس میں رنگ اور خوشبو کا امتزاج برقرار ہے۔

اس شعر میں اقبال غالباً اپنے بعض نقادوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک میری منظومات کے تمام مضامین قدامت سے ہم آہنگ ہیں اور میری شاعری بھی اغلاط سے پر ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی نقاد کے لیے اس میں کوئی خوبی ہے تو یہ اس نقاد کی کم علمی کا ثبوت ہے۔

⑩ سے (13) **معنی:** محزوں: غمگین۔

مطلب: اے خدائے بزرگ و برتر! یہ تیری کرم نوازی ہے کہ تو نے مجھے دل جیسی دولت عطا کی لیکن اتنے مختصر دل میں خواہشات کا جو طوفان موجزن ہے اگر تیرا پاس ادب نہ ہوتا تو میں اسے کرم کی بجائے ستم سے تعبیر کرتا۔ اس شعر میں اقبال ایک سائنسی نظریے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کائنات میں موجود عناصر ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ اگر نوک نشتر سے پھول کو چھیڑا جائے تو نتیجتہ" اس میں سے جو لعاب برآمد ہو گا وہ انسانی خون کے مانند ہو گا۔ اسی نکتے کو اقبال ایک اور مقام پر یوں بیان کرتے ہیں!

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

اس شعر میں کہا گیا ہے کہ اب نقالی اور دوسروں کی پیروی کرنے کا دور تو ختم ہوا اب خیالی دنیا پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دور تو حقیقت پر مبنی ہے اور جب انسان کو حقیقت کا ادراک ہو جائے تو پھر اس پر کسی قسم کی انگشت نمائی نہیں کی جا سکتی۔ غزل کے مقطع میں اقبال کہتے ہیں کہ اگر میں اپنے وطن سے دور ہوں یعنی بغرض تعلیم انگلستان میں ہوں تو میرے احباب اور عزیز و اقارب کو غمگین نہیں ہونا چاہیے کہ موتی کی قدر و قیمت سیپی سے باہر نکل کر ہی معلوم ہوتی ہے۔ دیار غیر میں حصول تعلیم کے بعد میری عزت و توقیر میں بھی اضافہ ہو گا۔

④

090

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں تارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، افتادگی تیری کنارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

سکوں نا آشنا رہنا اسے سامانِ ہستی ہے
تڑپ کس دل کی یارب چھپ کے آ بیٹھی ہے پارے میں

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

*

① **معنی:** **ہویدا:** ظاہر۔ **استعارے:** چھپا کر بات کرنا۔ **گریباں گیر:** گریبان پکڑے۔ **خسارے:** گھاٹا۔ **پھونکا:** جلا دیا۔

مطلب: اس غزل میں مطلع میں کہا گیا ہے کہ اے باری تعالیٰ! تیرا جلوہ بجلی، آگ اور اس کے شعلے میں پنہاں ہے۔ اس کے علاوہ چاند، سورج اور ستاروں سے بھی تیری جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ ان آسمانوں کی بلندی اور زمین کی پستی بھی تیرے سبب ہی ہے۔ سمندر کی موجوں میں روانی اور ساحل کا ایک ہی مقام پر قیام تیرے ہی دم سے ہے۔ میرے مکالمے اور تخلیقی عمل پر اہل شریعت یعنی واعظ و ملا چونکہ معترض ہوتے ہیں اسی لیے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار اب تشبیہات اور استعاروں میں کرنے لگا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرا یہ طرز عمل ان لوگوں کے لیے نارسائی کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے وہ خامشی اختیار کر جاتے ہیں۔ میں اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہوں کہ درخت، پھول، عام انسان، پتھر اور ستاروں میں وہ صلاحیت اور کیفیت موجود نہیں جو انسان میں ہیں۔ یعنی اول الذکر اشیا ہرچند کہ ایک سی حقیقت کی حامل ہیں۔ اس کے باوجود ان میں حیات و کائنات کے حوالے سے وہ شعور نہیں ہے جو کہ انسان میں موجود ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ مجھے تو محبت کی آگ نے جلا کر خاک کر ڈالا ہے۔ ہرچند کہ محبت کا جذبہ ایک ننھی سی چنگاری کے مانند ہے۔ اس کے باوجود یہ چنگاری تو انسان کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ میں اس دنیا میں باری تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے جو نیکیاں کما رہا ہوں آخرت میں ان کا صلہ پانے کی تمنا بھی مجھ کو نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں تو ایسا سوداگر ہوں جو بالعموم نفع نقصان سے بے نیاز رہتا ہے۔

خدایا! مجھے اتنا بتا دے کہ پارہ جو اپنی فطرت کے تقاضے کے تحت ہر لمحے متحرک رہتا ہے اور ٹھہراؤ کا قائل نہیں اس میں تو نے کس دل کی تڑپ اور اضطراب بھر دیا ہے۔ مراد یہ کہ عشق محبوب میں جس طرح سے دل تڑپتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت پارے کی بھی ہے۔ نہ جانے وہ کس کے فراق میں اس طرح مضطرب رہتا ہے۔

زیرِ تشریح غزل کے مقطع میں اقبال یوں گویا ہیں کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "رب ارنی" یعنی اے خدا مجھے اپنا جلوہ دکھا دے تو جواب ملا تھا "لن ترانی" موسیٰ! تم ہمارا جلوہ دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتے۔ اسی طرح "لن ترانی" کے الفاظ سن کر میں خاموش ہوں۔ اس لیے کہ مجھے تو باری تعالیٰ کے ہجر و فراق نے اس قدر مضمحل کر کے رکھ دیا ہے کہ اپنے محبوب حقیقی سے قطعی تقاضا نہیں کر سکتا کہ وہ مجھے اپنا جلوہ دکھا دے۔

زیرِ تشریح غزل کے کم و بیش تمام اشعار دیکھا جائے تو ایک مسلسل غزل کے ہیں جن میں سے کم و بیش ہر شعر میں خدائے عز و جل ایک مرکزی کردار کی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔

⑤

091

یوں تو اے بزمِ جہاں! دلکش تھے ہنگامے ترے
اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی

پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

کس قدر اے مے! تجھے رسمِ حجاب آئی پسند
پردۂ انگور سے نکلی تو میناؤں میں تھی

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آ سکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

میں نے اے اقبال! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی!

*

① سے ⑤ **معنی**: آسودگی: آرام۔ **حکمت**: فلسفہ۔ **ماہ سیماؤں**: چاند جیسی پیشانی والے۔ مراد حسین۔

مطلب: مطلع کے بغیر محض پانچ اشعار پر یہ غزل مشتمل ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اے جہان رنگ و بو ہرچند کہ تیری فضا ہنگامہ خیزی اور عیش و مسرت سے بھرپور تھی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ان ہنگاموں میں غم و اندوہ بھی کسی حد تک شامل تھے۔ یہ صورت حال بلا شک و شبہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ دنیا ناپائیدار ہے۔ مسرتوں کے ساتھ یہاں غم و اندوہ بھی موجود رہتے ہیں جس سے دنیا کی حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو شخص حکمت و دانش کے صحراؤں میں پریشان و مضطرب رہا اور اس صحرا کی خاک چھانتا رہا بالآخر اسے محبت کے دامن میں مسرت و خوشی اور عملاً آسودگی دستیاب ہو گئی۔

اس شعر میں اقبال شراب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شراب عملی سطح پر ایک پردہ نشین شے ہے کہ اولاً انگور کے خوشوں میں چھپی رہتی ہے۔ بعد میں پیمانے اور صراحیوں کے دامن میں پناہ گزیں ہو جاتی ہے۔ جب کہ بدمست شرابی اسے پینے اور مدہوش ہونے کے بعد شراب کا پردہ چاک کر دیتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ حسن کے ساتھ علم و دانش بھی اپنی اپنی انفرادیت [illegible] لیکن حسن میں وہ تاثیر موجود ہے جس پر علم و دانش غالب نہیں آ سکتے بلکہ ایک طرح سے اس [illegible] رہتے ہیں اور اسی باعث دنیا بھر کے دانشور حسن کے مقابل نادانی سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

اقبال مقطع میں کہتے ہیں کہ یورپ کے دوران قیام وہ حسن اور تہذیب تلاش کرتا رہا جو ہندوستان کے خوبصورت اور خوب سیرت لوگوں میں موجود ہے۔

092

⑥

مثال پرتوِ مے، طوفِ جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر، حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

نیا جہاں کوئی اے شمع! ڈھونڈیے کہ یہاں
ستم کشِ تپشِ ناتمام کرتے ہیں

بھلی ہے ہم نفسو! اس چمن میں خاموشی
کہ خوشنواؤں کو پابندِ دام کرتے ہیں

غرض نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیوں کر اے واعظ
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا
کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں

میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو!
جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں!

*

① سے ⑤ **معنی**: پرتوِ مے: شراب کا جلوہ۔ ستم کش: ظلم سہنا۔

مطلب: اس غزل کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ جس طرح شراب کا عکس رقص کرتا محسوس ہوتا ہے اسی طرح ہم بھی جام شراب کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ یہ عمل ہر روز صبح و شام ہمارے لیے عبادت سے کم نہیں۔ مراد یہ ہے کہ صبح ہو یا شام! وقت کوئی بھی ہو ہمارے لیے مسلسل مے نوشی عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

غزل کے دوسرے شعر میں حضرت موسیٰؑ سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ آپ نے کوہ طور پر حق تعالیٰ سے جو گفتگو کی وہ کوئی کمال کی بات نہ تھی اس لیے کہ یہ کام تو درخت اور پتھروں سے عنایت خداوندی کے طفیل ممکن ہے۔ اے شمع! بہتر یہی ہے کہ کوئی دوسرا جہان تلاش کر۔ اس لیے کہ اس جہان کا ستم تو یہی ہے کہ رونے والے کو رونے بھی نہیں دیا جاتا۔ اگلے شعر میں اقبال نے اپنے عہد کی معاشرتی صورت حال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ یہاں تو جبر کا یہ عالم ہے کہ اگر سچ بولیں تو اس کی سزا ملتی ہے اور سچ بولنے والے کو اس جرم میں پابند قفس کر دیا جاتا ہے۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ شراب کو محض سرمستی اور تفریح کے لیے پیتے ہیں وہ عملاً کم ظرف ہیں۔ اپنے اس عمل سے انہوں نے ایک حلال چیز کو حرام کر کے رکھ دیا ہے۔ تقریباً یہی مضمون میرزا غالب نے اپنے ایک شعر میں زیادہ خوبصورت انداز میں باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

⑥ سے ⑩ **معنی:** پیران خرقہ پوش: گدڑی پہنے والے پیر۔ رام: گرویدہ بنانا۔ دیر: بت خانہ۔

مطلب: اے واعظ! ہمارا اور تیرا نبھا اس لیے ممکن نہیں کہ ہم تو انسانوں سے محبت کرتے ہیں اور تو ان میں نفاق پیدا کر کے نفرت کے بیج بوتا ہے۔ اگلے شعر میں اقبال ان گدڑی پوش بزرگوں کے کردار کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی سحر انگیز باتوں سے نوجوانوں کو مطیع کر لیتے ہیں۔

اس شعر کا مضمون ان عیاش لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے جو عیش و نشاط کی خاطر اپنا مال و متاع اور گھر کا سکون بھی برباد کر دیتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں تو اس قماش کے تماش بینوں کی محفل کے تصور سے ہی ڈر جاتا ہوں۔ اس لیے کہ ایسے لوگ اپنا سب کچھ تباہ کرنے کے علاوہ معاشرے کو بھی تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

اقبال نے یہ غزل اٹلی کے سفر کے دوران کہی ہے جو اس شعر سے ظاہر ہے۔ کہتے ہیں اے جوزف مازنی جیسے محب وطن اطالوی رہنما! تیرے یہ میدان ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں۔ تیرے ساحل کے قریب سے گزرتے ہوئے میں اپنے جہاز سے تیری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

مقطع میں اقبال کہتے ہیں کہ جب نماز نہ پڑھنے والوں کو کبھی نماز پڑھنے کا خیال آتا ہے تو وہ مجھے بت خانے سے امامت کے لیے طلب کر لیتے ہیں۔

093 مارچ 1907ء

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہو گا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خارزار ہو گا

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہو گا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے، وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے، خوار ہو گا

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زر کم عیار ہو گا

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہو گا

سفینۂ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہو گا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہو گا

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہو گا

کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بہ گل ہیں
تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہو گا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

یہ رسمِ بزمِ فنا ہے اے دل! گناہ ہے جنبشِ نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہو گا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہو گا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہو گا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانہ ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ راہگزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہو گا

٭

سترہ اشعار پر مشتمل یہ ایک مسلسل غزل ہے جو اپنی ہیئت اور معنویت کے اعتبار سے نظم سے زیادہ قریب ہے۔ اس غزل کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اقبال کا فکر و فلسفہ قدرے واضح شکل میں سامنے آتا ہے۔ اس غزل میں اقبال کا انداز بھی قدرے جارحانہ ہے۔ اپنے عہد کی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے یہاں انہوں نے مستقبل کی جانب بھی کچھ اشارے کیے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

① سے ③ **معنی:** **بے حجابی:** چہرہ سے پردہ اٹھنا۔ **آوارۂ جنوں:** دیوانگی کے جوش میں آوارہ پھرنا۔ **برہنہ پائی:** ننگے پاؤں۔

مطلب: کہ آج جس عہد میں ہم لوگ سانس لے رہے ہیں اس کی سیاسی اور معاشرتی کیفیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ وہ محبوب شخصیتیں جن کا بھرم ہی پردے سے قائم تھا وہ پردہ ترک کر کے عام لوگوں میں اپنے حسن کا نظارہ کرنے پر آمادہ نظر آتی ہیں اور آنے والا وقت اس امر کی نشاندہی کرنے کو ہے کہ بالآخر ایسا ہی ہو کر رہے گا۔ اور وہ راز کھل کر سامنے آ جائے گا جو شرم و حیا کے سبب ابھی تک پردے میں تھا۔

دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ اب وہ عہد ختم ہونے کو ہے جب کہ مے نوشی بالعموم چھپ کر ہوتی تھی۔ اب تو اس امر کا امکان نظر آ رہا ہے کہ سارا معاشرہ ایک شراب خانے کی شکل اختیار کرے گا اور اس میں موجود ہر فرد بادہ خواری کا عادی ہو جائے گا۔

وہ لوگ جو عشق و مستی کے عالم میں صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھان رہے تھے اب وہ پھر سے بستیوں میں آ بسیں گے۔ ہر چند کہ وہ صحراؤں اور جنگلوں میں برہنہ پا تھے۔ یہاں بھی ان کی صورت حال وہی رہے گی۔ فرق اس قدر ہے کہ یہ بستیاں ایک نئے خارزار کے مانند ہوں گی۔

④ سے ⑤ **معنی:** **گوشِ منتظر:** انتظار میں لگے ہوئے کان۔ **شیر:** مراد ملت اسلامیہ۔

مطلب: اقبال اس شعر اور اس کے بعد کے شعر میں ایک نیا رخ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کے علاوہ آئندہ کے امکانات تو بظاہر وہی ہیں جن کا ذکر ابتدائی تین اشعار میں کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود معروضی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرنے والے لوگوں تک خاکِ مدینہ سے یہ پیام جانفزا پہنچنے لگا ہے کہ حق تعالیٰ نے تم لوگوں کی بہبود آسائش اور ارتقاء کے لیے جو وعدے کیے تھے بلاشک و شبہ ان کی پذیرائی کی جائے گی۔ اور وہ فرزندان توحید جنہوں نے اپنی جراءت اور آہنی عزم کے ذریعے روم کی عظیم الشان سلطنت کو تہ و بالا کر دیا تھا فرشتوں کی زبانی یہ پیغام دیا گیا ہے کہ وہ فرزندان توحید ایکبار پھر

اپنی منتشر صفوں کو استوار کر کے دشمن کا منہ پھیر دیں گے۔

⑥ **معنی:** **منہ پھٹ:** سچی بات بے باکی سے کرتا ہے۔

مطلب: اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میرا راست گوئی کا چرچا جب لوگوں میں ہوا تو ان کے سربراہ نے کہا کہ ایسے منہ پھٹ لوگ اکثر خراب و خستہ ہی ہوا کرتے ہیں۔ سو اس شخص کا حشر بھی کچھ اسی طرح کا ہو گا۔

⑦ سے ⑧ **معنی:** :::

مطلب: غزل کے ان دونوں اشعار میں اقبال مغربی استعماریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ دنیا رب ذوالجلال نے پیدا کی ہے جب کہ تم اسے اپنے مفادات کی منڈی سمجھ بیٹھے ہو۔ اور جس سکے کو تم کھرا سمجھ رہے ہو ذرا غور سے دیکھو کہ وہ تو کھوٹا سکہ ہے۔ یہ بھی جان لو کہ تمہاری وضع کردہ تہذیب ان ہتھیاروں سے خود ہی اپنے آپ کو تباہ کر لے گی جو تم نے دوسروں کو برباد کرنے کے لیے ایجاد کیے ہیں۔ جان لو کہ جس عمارت کی بنیاد کمزور ہو گی تو وہ عمارت بھی یقیناً ناپائیدار ہو گی۔

⑨ **معنی:** **سفینہ برگ گل:** پھول کی پتی کو کشتی بنالے۔ **مور ناتواں:** کمزور چیونٹیاں۔

مطلب: اس شعر میں اتحاد و یگانگت کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جس طرح ننھی ننھی چیونٹیاں باہمی رفاقت کے ذریعے اپنی منزل تک جا پہنچتی ہیں اسی طرح سے مسلمان اتحاد و یگانگت پیدا کر کے معمولی ساز و سامان کے ساتھ طاقتور دشمن کے خلاف نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

⑩ اس شعر میں چمن' لالہ' کلی اور دل جلے وہ استعارے ہیں جو اپنی معنویت کے لحاظ سے علی الترتیب وطن' خود غرض کردار' عوام اور بظاہر قوم پرستی کے حوالے سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جھوٹے رہنما عوام کے خیر خواہ بن کر پوری قوم کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

(11) فلسفہ وحدت الوجود کے حوالے سے کائنات اور اس کے تمام مظاہر کی بنیاد صرف رب ذوالجلال ہے۔ اس فلسفے کے ہمنوا ہونے کے ناطے اقبال کہتے ہیں کہ اہل دنیا نے تو خدا کے وجود کو بھی کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو خدا پر کون یقین کرے گا۔

(12) تخیلی سطح پر اس شعر میں اقبال قمری سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے جب قمری کو اس رمز سے آشنا کیا کہ کائنات کے تمام مظاہر جو آزاد تصور کیے جاتے ہیں۔ اس آزادی کے باوصف مقید ہیں تو جو عناصر اس مکالمے کی سن گن لے رہے تھے' بول اٹھے کہ یہ شخص یقیناً ہمارے تمام رازہائے درون پردہ سے آگاہ معلوم ہوتا ہے۔

(13) خدا کے ہزاروں ایسے لوگ عاشق ہیں جو اس سے لو لگائے جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ انہوں نے باقی دنیا سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ طرز عمل نہ عشق الٰہی کا حامل ہے نا ہی حقوق العباد کے اصول سے ہم آہنگ ہے۔ میں تو خدا تک رسائی کے لیے خدا کے اس نیک اور پارسا بندے سے عشق کا قائل ہوں جو خدا کے بندوں سے محبت کرتا ہے۔

(14) اس شعر میں کہا گیا ہے و زندگی میں تمام مصائب و مشکلات کو کوئی شکوہ کیے بغیر خندہ پیشانی سے قبول کر لینا چاہیے۔ اگر ان پر بے چینی اور اضطراب کا مظاہرہ کیا جائے تو یہ حوصلہ مندی اور بلند ہمتی کی

توہین ہے۔

(15) معنی: ظلمت شب: رات کا اندھیرا۔ درماندہ کارواں: بچھڑا ہوا قافلہ۔

مطلب: ہر چند کہ میرا قافلہ منزل سے بھٹک گیا ہے لیکن میں اس تھکے ہوئے قافلے کو رستے کی تمام مشکلات کے باوجود اپنے ہمراہ لے کر منزل کی جانب عازم سفر ہوں گا۔ تاریک شب میں روشنی کے لیے میری آہیں چنگاریاں برسائیں گی اور میری ہر سانس شعلے اگلے گی۔ مراد یہ ہے کہ قوم راہ سے بھٹک چکی ہے۔ منزل کا کچھ اتا پتہ نہیں۔ اس صورت میں اقبال کہتے ہیں کہ میں عزم و حوصلے کے ساتھ اس کی جانب منزل کی رہنمائی کروں گا۔

(16) معنی: غیراز نمود: نمود و نمائش کے سوا۔

مطلب: اگر اس دنیا میں تیری تخلیق کا مقصد زندگی کرنے اور نمود و نمائش کے سوا اور کچھ نہیں تو یہ بھی جان لے کہ جس طرح ایک شعلہ لمحے بھر کے لیے بھڑکتا ہے اور پھر بجھ کر رہ جاتا ہے اسی طرح تیری موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ مقصد یہ کہ دنیا میں حقیقی نمود و نمائش محض خدمت سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

(17) معنی: ستم کش انتظار: انتظار کے ظلم کی سختیاں۔

مطلب: غزل کے مقطع میں کہا گیا ہے کہ اقبال کا ٹھکانا کیا پوچھتے ہو۔ اس کی کیفیت پہلے کی مانند ہی ہے وہ تو کسی راہگذر پر بیٹھا اپنے محبوب کا انتظار کر رہا ہوگا۔

حصہ سوم 1908ء سے......

اس حصے میں علامہ اقبال کی وہ طویل اور مختصر نظمیں شامل ہیں جو انہوں نے 1908ء کے بعد تخلیق کیں۔ یہ نظمیں مذہبی' سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ آخر میں علامہ کا کچھ ظریفانہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کلام میں وہ کسی حد تک اکبر الٰہ آبادی سے متاثر نظر آتے ہیں۔

094 بلادِ اسلامیہ

سرزمیں دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں
خانقاہ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیِ محفل کی یاد
جل چکا حاصل' مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہان آباد بھی
اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامانِ ناز
لالۂ صحرا' جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیوں کر نہ ہمدوشِ ارم
جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبرؐ کے قدم
جس کے غنچے تھے چمن ساماں' وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما' ان کا مدفن ہے یہی

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے
جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ نمناک ہے

خطۂ قسطنطنیہ' یعنی قیصر کا دیار
مہدیِ امت کی سطوت کا نشانِ پائیدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربتِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا
اے مسلماں! ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

وہ زمیں ہے تو' مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰؐ
دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظمؐ کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے' وارث مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی' نہ فارس ہے' نہ شام
آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو' ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں' باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو' اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

زیرِ تشریح نظم "بانگِ درا" کے حصہ سوم کی اولین نظم ہے جو عملاً پانچ بند پر مشتمل ہے۔ اس امر کی

نشاندہی پہلے ہی کی جا چکی ہے کہ حصہ سوم کی تمام تخلیقات 1908ء کی ہیں اور ان میں اقبال کا وہ فکر و شعور گاہے گاہے نظر آتا ہے جس کے باعث اقبال اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے گئے۔ اس نظم میں انہوں نے دنیا بھر کے ان بڑے شہروں کی عظمت رفتہ کی نشاندہی کی ہے جو ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی عظمت و شوکت کی آماجگاہ تھے۔ ملاحظہ ہو!

پہلا بند معنی: بلاد اسلامیہ: اس نظم میں دنیا کے پانچ اسلامی شہروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ **مسجود:** سجدہ گاہ۔ **خیر الامم:** بہترین امت۔

مطلب: اس بند میں اقبال ہندوستان کے اہم ترین شہر دہلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اس شہر عظیم کے لیے سجدہ ریز ہوں کہ اس کے زوال کی کہانی دل کو شدید غم سے دوچار کیے ہوئے ہے۔ یہ وہی شہر ہے جس کے ذرے ذرے میں عظمت اسلاف کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ہر چند کہ عظمت اسلام کی مظہر یہ سرزمین آج اجڑ چکی ہے تاہم اس سے جو یادیں وابستہ ہیں وہ بھلائے نہیں بھولتیں۔ دہلی کی خاک میں عالم اسلام کے وہ اعلیٰ مرتبت فرمانروا دفن ہیں جن کی حکومت پوری دنیا کے نظام کو مربوط رکھنے کا سبب بنی۔ ان فرمانرواؤں کے عہد میں جو اس شہر کی عظمت و شوکت تھی اس کے تصور سے ہی دل تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ ہر چند کہ یہ شان و شوکت اب قصہ ماضی بن چکی پھر بھی اس کی یاد دلوں میں باقی ہے۔

دوسرا بند معنی: زیارت گاہ مسلم: مسلمان بادشاہ دفن ہیں۔ **کرامت:** بزرگی۔ **ارم:** شداد کی بنائی ہوئی جنت۔

مطلب: زیر تشریح میں اقبال بغداد کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک دہلی اپنی جملہ خصوصیات کے سبب اہل اسلام کے لیے ایک زیارت گاہ کی حیثیت رکھتی تھی اس کے باوجود ہم اسلامی تاریخ کے اہم شہر بغداد کی عظمت و کرامت کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ بغداد وہ گلشن تھا جس پر کبھی سارا عالم اسلام فخر کرتا تھا۔ عربوں کی تہذیب نے اسی شہر نامدار میں عروج و ارتقا کے مراحل طے کیے تھے۔ اس شہر کو خاک کو یوں بہشت کی ہم منصب ہونے کی سعادت حاصل ہے کہ اس پر پیغمبر آخر الزماں کے پیروکاروں اور جانشینوں کے قدم پڑتے رہے۔ یہی وہ شہر ہے جو اسلامی تدبر و حکمت کا نشان تھا اور یہیں پر وہ عظیم المرتبت تاجدار دفن ہیں جن کی ہیبت و سطوت سے سلطنت روم کے اولوالعزم فرمانروا بھی خوفزدہ رہا کرتے تھے۔

تیسرا بند معنی: قرطبہ: اندلس کا مشہور شہر۔ **فروزاں:** روشن۔ **تاک گلشن:** انگور۔

مطلب: دہلی اور بغداد کے علاوہ اندلس کا مشہور شہر قرطبہ بھی کسی زمانے میں عالم اسلام کی آنکھ کا تارا رہا ہے۔ خلافت عثمانیہ کے عہد میں یہ مشہور شہر اپنے علم و فضل اور شان و شوکت کے سبب بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس دور میں پوری تہذیب عملاً دم توڑ رہی تھی جب کہ قرطبہ ان کے لیے ایک ستارۂ نور کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن جب خلافت عثمانیہ کو زوال ہوا تو اس شہر کی تہذیب بھی دم توڑ گئی جس کے باعث پوری ملت اسلامیہ کو شدید دھچکا پہنچا لیکن اس سے فائدہ یورپی تہذیب کو ہی پہنچا۔ قرطبہ کی سرزمین دیکھا جائے تو ملت اسلامیہ کی عظمت و شوکت کا قبرستان ہے جس کے باعث یورپی تہذیب کو زندگی ملی۔ مراد یہ کہ اہل یورپ نے قرطبہ میں انتہائی ترقی یافتہ اسلامی تہذیب سے پوری طرح استفادہ کیا۔

چوتھا بند معنی: خطہ قسطنطنیہ: عثمانی سلطنت کا دارالحکومت۔ **مہدی:** ہدایت کرنے والا۔ **سطوت:** شان و شکوہ۔ **شہ لولاک:** حضرت رسول اکرم ﷺ

مطلب: اس بند میں اقبال دلی، بغداد اور قرطبہ کے بعد ایک اور عظیم الشان شہر قسطنطنیہ کا ذکر کرتے ہیں جو سینکڑوں برس کی محاذ آرائی کے بعد قیصر روم سے سلطان محمد فاتح کے عہد میں تسخیر کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسی کے فتح کرنے والے سالار کو جنت کی بشارت دی تھی۔ صحابی رسول مقبول ﷺ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مزار بھی یہیں پر واقع ہے۔ قسطنطنیہ جو قیصر خاندان کے زیر نگیں رہا وہ آخر کار سلطان محمد فاتح کی عظمت و شان کا آئینہ دار بن گیا۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ شہر بھی ہمارے لیے حجاز مقدس کی طرح محترم ہے اس لیے کہ یہ ایک مدت تک ان فرمانرواؤں کا مسکن رہا جنہیں حضور ﷺ کی جانشینی کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس خطے کی فضاء میں پھولوں کی خوشبو اور پاکیزگی رچی ہوئی ہے۔ یہاں صحابی رسول ﷺ حضرت ایوب انصاریؓ کا جو مزار واقع ہے یوں لگتا ہے اس سے آج بھی یہ آواز آ رہی ہے کہ مسلمانو! سنو! یہ عظیم المرتبت شہر ملت اسلامیہ کے قلب کی مانند ہے اس لیے کہ ہمارے عظیم المرتبت اسلاف نے اسے سینکڑوں برس کی نبرد آزمائی اور بے شمار جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔

پانچواں بند معنی: **حج اکبر:** حج دو ہیں۔ ایک حج اصغر، دوسرا حج اکبر۔ **ولادت گاہ:** پیدائش کی جگہ۔ **ماویٰ:** پناہ کی جگہ۔ **نقطہ جاذب:** کھینچنے والا نقطہ۔

مطلب: اوپر کے اشعار میں اسلامی عظمت کے جن چار شہروں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے بعد بلاد اسلامیہ کا باب، مدینہ منورہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کہ جہاں پیغمبر آخر الزماںؐ کی آخری آرام گاہ آج بھی مرجع خلائق بنی ہوئی ہے اور چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی ہر سال دنیا بھر سے آنے والے کروڑوں مسلمانوں کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے اس شہر بے مثال کی عظمت کا اندازہ اسی امر سے ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مدفن مبارک اسی مقام پر موجود ہے۔

اقبال اس بند میں مدینہ منورہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے یہ شرف حاصل ہے کہ تو ہمارے نبی ﷺ کی آخری آرام گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے لیے تیرا نظارہ تو حرم کعبہ سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اگر کائنات کو ایک انگوٹھی سے تعبیر کر لیا جائے تو اس انگوٹھی میں تیرا وجود ایک گوہر تابدار کی مانند ہے۔ اسلام کی عظمت و تابندگی نے دیکھا جائے تو اسی مقام سے جنم لیا ہے۔

اے مقدس شہر! اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس شہنشاہ معظم کو تیرے دامن میں ہی راحت ملی جس کے دامن میں بلا شک و شبہ تمام اقوام عالم نے سکون محسوس کیا۔ مراد یہی ہے کہ آنحضرتؐ نے تیری ہی سرزمین کو اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر منتخب کیا۔ آنحضرتؐ کی شخصیت اسقدر عظیم تھی کہ دنیا بھر کے شہنشاہ ان کے پیروکار بن گئے اور پھر یہی لوگ قیصر اور جمشید جیسے عظیم فرمانرواؤں کی جگہ لے سکے۔

ہر چند کہ اسلامی قومیت کا تصور کسی مخصوص خطے تک محدود نہیں پھر بھی اگر اسی حوالے سے دیکھا جائے تو ہند و ایران اور شام کی بجائے مدینہ ہی وہ مقام ہے جو مسلمانوں کا مرکز نگاہ ہے۔ چنانچہ جب تک صبحدم شبنم کی طرح تیرا وجود باقی ہے ہم مسلمان بھی اسی طرح زندہ ہیں۔

ستارہ

095

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو مآلِ حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو!
متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو؟ ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو!
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو مثالِ ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے
چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل عدم، عدم ہے، کہ آئینہ دارِ ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

٭

اس نظم میں اقبال کا بنیادی تصور تغیر و انقلاب کے علاوہ مسئلہ جبر و قدر کی نشاندہی سے متعلق بھی ہے۔ یہ نظم محض آٹھ اشعار پر مشتمل ہے جن میں علامہ نے کمال فنی چابکدستی کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے چنانچہ وہ ستارہ سے ہم کلام ہوتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

① سے ④ **معنی**: مآل: انجام۔ ہراس: خوف۔

مطلب: اے ستارے! مجھے اتنا بتا دے کہ کیا تو چاند کی روشنی سے خوفزدہ ہے یا پھر تجھے صبح ہونے کا خطرہ ہے کہ چاند کی روشنی میں تیری روشنی زائل ہو کر رہ جائے گی اسی طرح صبحدم سورج کے طلوع ہونے کے سبب بھی تجھے کم و بیش اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تجھے اس حقیقت کا پتہ چل گیا ہے کہ حسن کا انجام آخر کیا ہوتا ہے؟ مراد یہ کہ ستارہ میں بھی ایک حسن ہوتا ہے اور زوال بالاخر حسن کا مقدر ہے سو اسی پس منظر میں یہ بات یہاں کہی گئی ہے۔

یا پھر ایسا تو نہیں کہ تجھے اپنے نور کی دولت کے لٹ جانے کا خطرہ ہے یا پھر یہ خیال تجھے کھائے جا رہا ہے کہ چنگاری کے مانند لمحے بھر میں اپنی روشنی سے محروم ہو جائے گا۔ اس انداز سے تجھے خوفزدہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ قدرت نے تجھے سطح زمین سے کافی بلندی پر گھر عطا کیا ہے اور چاند جیسی روشنی بھی بخشی ہے اس کے باوجود حیرت یہ ہے کہ تجھ پر خوف طاری رہتا ہے اور تمام شب تو کانپتا رہتا ہے۔

⑤ سے ⑧ **معنی**: ولادتِ مہر: سورج کی پیدائش۔ **رازِ آفرینشِ گل**: پھول کی پیدائش کا راز۔ **محال**: ناممکن۔ **ثبات ایک تغیر**: یعنی ہمیشہ رہنے والا عمل ہے۔

مطلب: اے ستارہ تیری روشنی بجا! لیکن اس حقیقت کو فراموش نہ کر کہ یہ کائنات عجیب و غریب شے ہے۔ یہاں کی کیفیت تو یہ ہے کہ ایک شے کو عروج حاصل ہوا تو زوال دوسری شے کا مقدر بن گیا۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ سورج کے طلوع ہوتے ہی لاکھوں ستارے اس کی تیز روشنی کے سبب ناپید ہو جاتے

ہیں۔ یوں سمجھ لے کہ جسے ہم فنا کے نام سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل زندگی کا ہی ایک دوسرا رخ ہے۔ غنچہ کھل کر اپنی ہیئت کھو بیٹھتا ہے اور بالآخر ایک شگفتہ پھول بن جاتا ہے۔ بالفاظ دگر غنچے کی موت عملاً پھول کی زندگی بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس ساری صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا جائے تو یہ راز آشکار ہو کر سامنے آئے گا کہ ہم جسے موت کا نام دیتے ہیں وہ عملاً موت نہیں ہے اس کے برعکس زندگی کے اظہار کا نام ہے۔

سوائے ستارے! یہ جان لے کہ پوری کائنات میں کسی مرحلے پر بھی سکون و اطمینان کا حصول ممکن نہیں۔ ہاں اگر کسی چیز کو استقلال ہے تو اس کا نام تغیر اور تبدیلی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس کائنات کی بنیادی خصوصیت ہمہ وقت تغیر اور انقلاب ہے۔ اس نوع کی تبدیلیاں فطرت کے مظاہر کا بنیادی جزو ہیں۔

096 دو ستارے

آئے جو قراں میں دو ستارے کہنے لگا ایک دوسرے سے
یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب انجام خرام ہو تو کیا خوب
تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو
ہم دونوں کی ایک ہی چمک ہو
لیکن یہ وصال کی تمنا! پیغام فراق تھی سراپا
گردش تاروں کا ہے مقدر ہر ایک کی راہ ہے مقرر
ہے خواب ثبات آشنائی
آئین جہاں کا ہے جدائی

*

پہلا بند معنی: قراں: برج۔

مطلب: اقبال نے معمول کے مطابق اپنی بیشتر نظموں میں زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل کا ذکر کسی نہ کسی شے کے حوالے سے کیا ہے یہ نظم بھی اسی نوعیت کی حامل ہے جس میں دو ستاروں کے حوالے سے یہ امر واضح کیا ہے کہ جدائی اور فنا بالآخر ہر شے کا مقدر ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ نظم بھی سابقہ نظم سے ملتی جلتی ہے یعنی دو ستارے آسمان پر ایک برج میں یکجا ہوئے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ ہماری یہ ملاقات مستقل حیثیت اختیار کر لے اور یہ گردش ختم ہو جائے تو کتنی اچھی بات ہو۔ اگر آسمان ہم پر قدرے مہرباں ہو جائے اور ہماری روشنی یکجا ہو جائے تو ہماری قوت میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے اور ہماری افادیت بھی زیادہ ممکن ہو سکتی ہے۔

دوسرا بند معنی: وصال: ملاپ۔ آئین: قانون۔

مطلب: لیکن ہوا یوں کہ دونوں ستاروں کے مابین مستقل وصال کی خواہش لمحے بھر میں فراق اور جدائی

کا پیغام بن کر رہ گئی۔ اس لیے کہ یہ امر تو ستاروں کا مقدر بن چکا ہے کہ ہر لمحے گردش کرتے رہیں اور مسافرت ان کا اوڑھنا بچھونا ہو نیز یہ کہ اس گردش اور سفر میں ہر ستارے کا راستہ متعین ہے جس سے وہ کسی مرحلے پر بھی سرمو انحراف نہیں کر سکتا۔ کہ جدائی اور فنا ہر شے کا مقدر ہے۔

097 گورستان شاہی

آسماں بادل کا پہنے خرقہ دیرینہ ہے   کچھ مکدر سا جبین ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں   صبح صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی   بربط قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی
باطن ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لب ہستی پہ آہ سرد ہے
آہ! جولانگاہ عالمگیر یعنی وہ حصار   دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور، اب سنسان ہے   یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکان کہن کی خاک کا دل دادہ ہے
کوہ کے سر پر مثال پاسباں استادہ ہے
ابر کے روزن سے وہ بالائے بام آسماں   ناظر عالم ہے نجم سبز فام آسماں
خاکبازی وسعت دنیا کا ہے منظر اسے   داستاں ناکامی انساں کی ہے ازبر اسے
ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا   آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا
گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لیے   فاتحہ خوانی کو یہ ٹھہرا ہے دم بھر کے لیے
رنگ و آب زندگی سے گل بدامن ہے زمیں
سیکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں
خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزل حسرت فزا   دیدۂ عبرت! خراج اشک گلگوں کر ادا
ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے   آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر   جنبش مژگاں سے ہے چشم تماشا کو حذر
کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں
سوتے ہیں خاموش، آبادی کے ہنگاموں سے دور   مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک   جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل   جن کی تدبیر جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال
رعب فغفوری ہو دنیا میں، کہ شان قیصری   ٹل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی
بادشاہوں کی بھی کشت عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

شورش بزم طرب کیا! عود کی تقریر کیا — دردمندان جہاں کا نالہ شبگیر کیا
عرصہ پیکار میں ہنگامہ شمشیر کیا — خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا
اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینہ ویراں میں جان رفتہ آ سکتی نہیں

روح مشت خاک میں زحمت کش بیداد ہے — کوچہ گرد نے ہوا جس دم نفس' فریاد ہے
زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوش نوا — شاخ پر بیٹھا کوئی دم' چہچہایا' اڑ گیا
آہ! کیا آئے ریاض دہر میں ہم' کیا گئے — زندگی کی شاخ سے پھوٹے' کھلے' مرجھا گئے
موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

سلسلۂ ہستی کا ہے اک بحر ناپیدا کنار — اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار
اے ہوس! خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار — یہ شرارے کا تبسم' یہ خس آتش سوار
چاند' جو صورت گر ہستی کا اک اعجاز ہے — پہنے سیمابی قبا محو خرام ناز ہے
چرخ بے انجم کی دہشتناک وسعت میں مگر — بیکسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقت سحر
اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے' جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار — رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
اس زیاں خانے میں کوئی ملت گردوں وقار — رہ نہیں سکتی ابد تک بار دوش روزگار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں — دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار — ذوق جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار
ہے نگین دہر کی زینت ہمیشہ نام نو
مادر گیتی رہی آبستن اقوام نو!

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہ گزر — چشم کوہ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور
مصر و بابل مٹ گئے' باقی نشاں تک بھی نہیں — دفتر ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں
آ دبایا مہر ایراں کو اجل کی شام نے — عظمت یونان و روما لوٹ لی ایام نے
آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسماں سے ابر آزاری اٹھا' برسا گیا

ہے رگ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی — کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی
سینہ دریا شعاعوں کے لیے گہوارہ ہے — کس قدر پیارا لب جو مہر کا نظارہ ہے
محو زینت ہے صنوبر' جویبار آئینہ ہے — غنچۂ گل کے لیے باد بہار آئینہ ہے
نعرہ زن رہتی ہے کوئل باغ کے کاشانہ میں — چشم انساں سے نہاں' پتوں کے عزلت خانہ میں
اور بلبل' مطرب رنگیں نوائے گلستاں — جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں

عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے
خامہ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے

باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں
وادی کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں

زندگی سے یہ پرانا خاکداں معمور ہے
موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح
دست طفل خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم، یعنی غم ملت ہمیشہ تازہ ہے

دل ہمارے یاد عہد رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

اشکباری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در
گریہ پیہم سے بینا ہے ہماری چشم تر

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم

ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

وادی گل خاک صحرا کو بنا سکتا ہے یہ
خواب سے امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

❋

اقبال کی یہ طویل نظم ان دنوں کی یادگار تخلیق ہے جب بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں وہ حیدر آباد دکن کے دورے پر گئے۔ وہاں انہوں نے اور چیزوں کے علاوہ مقامی فرمانرواؤں کے مزار اور مقابر بھی دیکھے۔ انہی کے حوالے سے اس نظم کی تخلیق ہوئی جو خوبصورت امیجری کی ایک درخشاں مثال ہے۔ یہ نظم بارہ بند پر مشتمل ہے۔

پہلا بند معنی: خرقہ دیرینہ: پرانی گدڑی۔ مکدر: کدورت والا یعنی میلا۔ **حیرت فزا:** حیرت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بربط: ساز۔ **باطن ہر ذرہ:** ہر ذرہ کا دل۔

مطلب: شاہی گورستان کا منظر نامہ کچھ یوں ہے جیسے اس پر ایستادہ آسمان نے کٹے پھٹے بادلوں کا بوسیدہ لباس پہن رکھا ہو۔ انہی بادلوں کے سبب چاند کی روشنی بھی مدھم پڑی ہوئی ہے۔ اس خاموش اور پرسکوت فضاء میں بادلوں کے سبب چاند اور تاروں کی روشنی بھی پھیکی پھیکی سی لگ رہی ہے۔ صبح صادق تو ابھی شب کی آغوش میں ہی محو خواب ہے۔ یہاں جو درخت ایستادہ ہیں وہ اس قدر خامشی اور سکوت کے عالم میں ایستادہ ہیں کہ ان کی یہ خامشی دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ خامشی دیکھا جائے تو فطرت کے کسی ساز موسیقی کی دھیمی سی لے ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس دنیا کا ہر ذرہ سرتاپا باطنی درد اور کرب کا شکار ہے جب کہ یہ خامشی زندگی کے ہونٹوں پر ایک آہ سرد کی حیثیت رکھتی ہے۔

دوسرا بند معنی: جولانگاہ: تگ و دو کا مقام۔ حصار: قلعہ۔ گورستان: قبرستان۔ **سکان کہن:** پرانے مکین۔ استادہ: کھڑا ہے۔

مطلب: اس بند کے اشعار میں اقبال گورستان شاہی کے قریب ایستادہ اس عظیم الشان قلعہ کی نشاندہی کرتے ہیں جس کو فتح کرنے کے لیے 1687ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے گولکنڈہ کا

محاصرہ کیا تھا۔ اس قلعے کے گرد و پیش کی زمین میدان جنگ بن گئی تھی۔ صدیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے یہ قلعہ جو کبھی زندگی کی چہل پہل کا مظہر ہو گا آج اس پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔ قلعہ کے چاروں اطراف پھیلی ہوئی ویرانی فی الواقع یہاں کی گزری ہوئی زندگی کے قبرستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ قلعہ نہ صرف یہ کہ اپنے قدیم باسیوں کی خاک کا عاشق ہے بلکہ پہاڑ کے اوپر قبرستان کے محافظوں کی مانند ایستادہ ہے۔

تیسرا بند معنی: **نجم:** ستارہ۔ **خاکبازی:** مٹی سے کھیلنا۔ **ازبر:** حفظ، زبانی یاد۔

مطلب: ایک ستارہ جو آسمان کی بلند فضا میں چمک رہا ہے یوں لگتا ہے جیسے جھک جھک کر بادلوں کے سوراخوں میں سے جھانک رہا ہے دنیا کی وسعت کا نظارہ اس کے لیے ایک کھیل کی مانند ہے کہ اس کو تو انسانی ناکامیوں کی تمام داستانیں پوری طرح یاد ہیں۔ ہر چند کہ یہ ستارہ اپنی منزل کی جانب محو سفر ہے اس کے باوجود وہ آسمان کی بلندیوں سے ان انقلابات کا نظارہ بھی کر رہا ہے جو زمین پر برپا ہو رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ستارے کا مقدر سفر ہے۔ چنانچہ اس کا کسی ایک مقام پر قیام ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ ایک لمحے کے لیے جو یہاں رک گیا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس قبرستان شاہی پر فاتحہ خوانی کر رہا ہے۔ یوں بھی یہ سرزمین زندگی کی چمک دمک کی مظہر ہونے کے علاوہ ایسے قبرستان کی حیثیت رکھتی ہے جس میں سینکڑوں تہذیبیں دفن ہیں۔

چوتھا بند معنی: **حسرت فزا:** حسرت بھرا۔

مطلب: کرب و غم میں اضافہ کرنے والی یہ سرزمین ایسے پر شکوہ حکمرانوں کی آرامگاہ ہے جس کا نظارہ ہی عبرتناک اور خون رلا دینے والا ہے مگر اسے خراج یوں ہی پیش کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ یہ سرزمین لاکھ گورستان سہی! تاہم اس کا مرتبہ آسمان کے ہم پلہ ہے۔ یہ نہ بھول کہ یہ قبرستان اس قوم کا سرمایہ ہے جس کا مقدر بگڑ گیا ہے پھر بھی ان مقبروں کا شکوہ اس قدر حیرتناک ہے کہ ان پر نظر نہیں ٹھہرتی اور دیکھنے والا آنکھ جھپکانے کی جراءت بھی نہیں کر سکتا۔

اقبال کہتے ہیں کہ گورستان شاہی کی یہ فضا ایک سرکردہ قوم کے ماضی کی ناکامی کی ایسی تصویر ہے جس سے ظاہر ہونے والے کرب کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کرب کو فی الواقع احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

پانچواں بند معنی: **جبیں گستر:** سجدہ کرنے والا۔ **غنیم موت:** دشمن۔ **یورش:** حملہ۔ **فغفوری:** بادشاہی۔

مطلب: وہ حکمران جن کو ان کی تشنہ تکمیل آرزوئیں اور خواہشات ہمیشہ مضطرب اور بے چین رکھا کرتی تھیں آج وہ آبادی سے کوسوں دور اس ویرانے میں خاموشی سے ابدی نیند سو رہے ہیں۔ جن کے چہرے سورج کی طرح روشن تھے اب وہ قبر کے اندھیروں سے دوچار ہیں۔ یہی وہ جلیل القدر فرمانروا تھے جن کے دروازوں پر آسمان بھی سجدہ ریز ہوتا نظر آتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کے انداز حکومت سے زوال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیا ان شہنشاہوں کی عظمت کا یہی نتیجہ نکلنا تھا کہ تمامتر شکوہ کے باوجود آج زمین ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

چنانچہ اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ خواہ چین جیسی عظیم الشان سلطنت کے فرمانرواؤں کا رعب و دبدبہ ہو یا روم کے پر ہیبت شہنشاہوں کی شان و شوکت ہو۔ موت ایک ایسی دشمن ہے جس کا وار کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ چنانچہ یہ طے ہے کہ عام شخص ہو یا کوئی بادشاہ! اول و آخر قبر ہی اس کا آخری مسکن ہے اور کیسا ہی عظیم و پر ہیبت شخص ہو اس کی ابدی منزل قبر ہی ہے۔

چھٹا بند معنی: عود: بربط کی قسم کا ایک ساز۔ **نالہ شبگیر:** رات کے وقت کی آہ و زاری۔

مطلب: چنانچہ یہ طے ہے کہ اس گورستان میں سونے والے بہادر اور اولوالعزم شہنشاہوں کو نہ تو عیش و عشرت کے ہنگامے ہی جگا سکتے ہیں نہ ساز و موسیقی کی صدائیں ہی بیدار کر سکتی ہیں۔ نہ ان مصیبت زدگان کی آہیں اور متحرک کر سکتی ہیں ان بہادروں کو میدان جنگ میں تلوار زنی کے ہنگامے اور وہاں بلند ہونے والے تکبیر کے پر جوش نعرے بھی جگا نہیں سکتے۔ سچ تو یہ ہے ان ہمیشہ کے لیے خوابیدہ لوگوں کو اب نہ تو کوئی آواز ہی اٹھا سکتی ہے نہ ہی انہیں دوبارہ زندگی مل سکتی ہے۔

ساتواں بند معنی: زحمت کش بیداد: ظلم کا دکھ اٹھانے والی۔

مطلب: قبر کا عذاب تو ایسا ہے جسے جسم ہی نہیں بلکہ روح بھی برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ جب بانسری میں سانس داخل ہوتا ہے تو یہی فریاد یا نغمے میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی طرح حیات انسانی بھی ایک خوش الحان پرندے کی مانند ہے۔ پرندہ کسی شاخ پر بیٹھا' نغمے الاپے اور پھر اڑ گیا۔ ہم انسان! افسوس کہ اس دنیا میں محض ایک پھول کی مانند آئے۔ شاخ سے نکلے' پھول بنے اور پھر مرجھا کر رہ گئے۔ سو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فقیر ہو یا امیر! کسی چھوٹے بڑے سے رعایت نہیں کرتی اس لیے کہ اس کی نظروں میں تو سب ہی برابر ہیں۔

آٹھواں بند معنی: خس آتش سوار: وہ تنکا جو آگ پر سوار ہو۔ **سیمابی قبا:** پارے کے رنگ کا لباس۔ **محو خرام ناز:** اپنی چال میں مست ہے۔

مطلب: زیر تشریح بند میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ حیات انسانی ایک ایسے سمندر کی طرح ہے جس کا دوسرا کنارہ نہیں ہوتا لیکن سمندر کی طرح اس میں بھی بے شمار لہریں اور مدوجزر ہوتے ہیں جنہیں انسانی مقابر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں زیادہ عرصے تک زندہ رہنے کی تمنا رکھنے والا ہمیشہ خون کے آنسو روتا ہے کہ یہ زندگی بلاشک و شبہ ناقابل اعتبار ہے۔ ناپائیداری کے لحاظ سے اس زندگی کو محض چند لمحوں تک چمکنے والی چنگاری اور آگ کی لپیٹ میں آجانے والے تنکے کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اور یہ آسمان پر جو چاند روشن ہے اسے زندگی کے حوالے سے رب ذوالجلال کا اعجاز قرار دیا جانا چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ پارے جیسا سفید رنگ اور متحرک لباس پہنے آسمان کی وسعتوں میں اپنے سفر پر ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ لیکن اس لمحے جب ستارے روپوش ہو جاتے ہیں تو آسمان کی دہشتناک فضا میں چاند کی بے مائیگی کا اندازہ کچھ اس طرح سے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسا بادل نظر آتا ہے جس سے بارش کا آخری قطرہ بھی برس چکا ہو اور جو اپنی عمر طبعی کے مرحلے سے گزر چکا ہو۔

نواں بند معنی: زیاں خانے: نقصان کا گھر یعنی دنیا۔ گردوں وقار: آسمان جیسے رتبہ والا۔ بے اعتنائی: بے پروائی۔ ذوق جدت: نئی چیزیں پیدا کرنے کا شوق۔ **آبستن:** حاملہ ہونا۔

طائر دل کے لیے غم شہپر پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل غم انکشاف راز ہے

غم نہیں غم، روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرود بربط ہستی سے ہم آغوش ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ "یا رب!" نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں

جس کا جام دل شکست غم سے ہے نا آشنا
جو سدا مست شراب عیش و عشرت ہی رہا

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوک خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے

کلفت غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اے کہ نظم دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقل انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق

عشق کے خورشید سے شام اجل شرمندہ ہے
عشق سوز زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

رخصت محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوش الفت بھی دل عاشق سے کر جاتا سفر

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم نا آشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئنہ روشن ہے اس کا صورت رخسار حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر، ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہر روان زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوع انساں بن گئی

پستی عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامن دل بن گیا ہو رزمگاہ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خضر ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آواز ضمیر

وادی ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

*

اس نظم کا پس منظر یہ بتایا جاتا ہے کہ اقبال نے اسے قیام پاکستان سے قبل پنجاب کی مشہور شخصیت

مطلب: جملہ عناصر جن کا ذکر نظم کے پہلے اشعار میں کیا گیا ہے انہی کی طرح اقوام عالم کا وجود بھی کسی اعتبار کا حامل نہیں ہے۔ ان کا عروج ماضی کے حوالے سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ ہر قوم کا مقدر زوال سے عبارت رہا ہے۔ بالفاظ دگر اس کائنات میں کوئی قوم کتنی ہی عظیم الشان اور بلند مرتبت ہو وہ بھی ابد تک قائم و دائم نہیں رہ سکتی اس کی تقدیر میں بالاخر فنا ہونا ہی شامل ہے۔ اب تو یہ کائنات قوموں کے عروج و زوال کے مناظر کی اس قدر عادی ہو چکی ہے کہ اس کو کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں اور اس منظر کو ہمیشہ بے اعتنائی سے دیکھتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی شے ایک ہی شکل میں اور ایک ہی انداز سے برقرار نہیں رہتی۔ زمانہ اتنا جدت پسند ہو چکا ہے کہ ہر روایت میں نت نئی تبدیلی کا خواہاں ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا میں نئی نئی قوتیں جنم لیتی رہتی ہیں اور عہد کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔

دسواں بند معنی: کوہ نور: مشہور ہیرا۔ ابر آذاری: بہار کا بادل۔

مطلب: یہ کائنات ایک ایسی شاہراہ کے مانند ہے جہاں سے مختلف فرمانرواؤں اور عام انسانوں کے ہزارہا قافلے گزرتے رہے ہیں اور تاریخی حیثیت کا حامل یہ کوہ نور ہیرا نہ جانے کتنے شہنشاہوں کے تاج کی زینت بن چکا ہے۔ آج مصر اور بابل کی عظیم اور انتہائی قدیم تہذیبیں ہمیشہ کے لیے اس طرح مٹ کر رہ گئیں کہ ان کا نشان تک باقی نہیں ہے۔ نا ہی ان کا کوئی نام لیوا موجود ہے۔ ایران جیسے عظیم المرتبت شہنشاہ فنا کے گھاٹ اتر گئے ان کی حکومتیں بھی تباہ و برباد ہو گئیں یہی نہیں بلکہ وقت نے یونان اور روم جیسی اقوام کی عظمت و ہیبت کو بھی خاک میں ملا کر رکھ دیا۔

انہی تہذیبوں کی طرح مسلمانوں کی تہذیب بھی بالاخر اس طرح حادثات زمانہ کی شکار ہو کر رہ گئی جیسے کہ موسم بہار میں بادل پورے جوش و خروش کے ساتھ آتا ہے، برستا ہے اور پھر ناپید ہو جاتا ہے۔ یہی حال ملت اسلامیہ کی تہذیب کا ہے۔

گیارھواں بند معنی: مطرب: گانے والا۔ گلستاں زادوں: مراد درخت اور پودے۔ خاکداں: مٹی کا گھر یعنی دنیا۔ نشاط آباد: عیش و شادمانی کی بستی۔

مطلب: اس پورے بند میں اقبال کی امیجری اور منظر نگاری انتہائی عروج پر ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ پھولوں پر صبح کے وقت شبنم کے قطرے اس انداز سے پڑے ہوئے ہیں کہ موتی کی لڑی کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ شبنم کے کسی قطرے میں سورج کی کرن الجھ کر رہ گئی ہے۔ سورج کی شعاعوں کے لیے سطح دریا ایک گہوارے کی مانند لگ رہی ہے اور اسی دریا کے کنارے پر طلوع آفتاب کا منظر بڑا پیارا لگ رہا ہے۔

صنوبر کا درخت اس طرح سے اپنی آرائش میں مصروف ہے کہ ندی کا شفاف پانی اس کے لیے آئینہ بنا ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح غنچے کے لیے بہار کی زندگی بخش ہوائیں آئینے کا کام دے رہی ہیں۔ باغ میں اپنے گھونسلے کے قریب کوکل نغمہ سرائی کر رہی ہے تاہم وہ پتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی انسان کی آنکھ سے اوجھل ہے۔ اسی طرح بلبل بھی جو گلستان کی فضاء کو اپنے خوبصورت نغموں سے رنگین بنائے ہوئے ہے جس کے سبب باغ میں آمد بہار کا احساس ہوتا ہے۔

یہ سارا منظر نامہ یوں لگتا ہے جیسے جذبہ عشق کی تصویر سے ہم آہنگ ہے۔ عملی سطح پر اس کو خامہ قدرت کے شوق تحریر سے عبارت قرار دیا جا سکتا ہے۔ رنگارنگ درخت باغ میں پر سکوت حالت میں ایستادہ ہیں اور پہاڑ کی وادیوں میں گڈریوں کے نو عمر بچے کھیل کود اور نعرہ زنی میں مصروف ہیں۔ عملی سطح پر یہ اتنی قدیم دنیا قرنہا قرن گذر جانے کے باوجود زندگی کی رونقوں سے مامور ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو فنا کے گھاٹ کبھی کے اتر چکے ہیں ان کی موت میں بھی زندگی کی تڑپ چھپی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

موسم خزاں کے دوران شگفتہ پھولوں کی پتیاں اس طرح سے اڑاڑ کر زمین پر گرتی ہیں جیسے سوئے ہوئے بچے کے ہاتھ سے کھلونے گر جائیں۔ ہرچند کہ اس دنیا میں بے اندازہ عیش و نشاط موجود ہے۔ اس کے باوجود ملت کی بربادی کا ایک ایسا غم ہے کہ جو ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔

بارھواں بند **معنی:** دیدۂ گریاں: دیدہ گریاں کے موتی یعنی آنسو۔

مطلب: چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دل اپنے ماضی کی یادوں سے خالی نہیں ہو سکتے نا ہی یہ امت اپنے عظیم المرتبت بادشاہوں کو فراموش کر سکتی ہے۔ یہ برباد شدہ بام و در فی الواقع ہماری اشکباری کے لیے بہانے بنے ہوئے ہیں ان کی مسلسل یاد سے ہی ہم ابھی تک اپنی سابقہ دانش و حکمت سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اس کائنات کو بھی اپنے اس طرز علم سے درخشندگی عطا کر رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہم ایک گزرے ہوئے طوفان کے آخری بادل ہیں یعنی اپنے سلف کی عظمتوں کی آخری یادگار ہیں۔ ابھی تو ہمارے دامن میں بے شمار گوہر پوشیدہ ہیں اور ان خاموش سینوں میں بہت سی بجلیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اب بھی ہم دشت و صحرا کو وادی گل میں تبدیل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور سوئے ہوئے کسانوں کو بیدار کر سکتے ہیں۔ ہرچند کہ ہماری شان و شوکت اور حکمرانی کا دور ختم ہو چکا ہے اس کے باوجود ادب، فنون اور تہذیبی ارتقا کا ظہور باقی ہے۔

نمود صبح

098

ہو رہی ہے زیر دامان افق سے آشکار
صبح یعنی دختر دوشیزۂ لیل و نہار

پا چکا فرصت درود فصل انجم سے سپہر
کشت خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

آسماں نے آمد خورشید کی پا کر خبر
محمل پرواز شب باندھا سر دوش غبار

شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقان گردوں نے جو تاروں کے شرار

ہے رواں نجم سحر، جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابد شب زندہ دار

کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغ آب دار

مطلع خورشید میں مضمر ہے یوں مضمون صبح
جیسے خلوت گاہ مینا میں شراب خوشگوار

ہے تہ دامان باد اختلاط انگیز صبح
شورش ناقوس، آواز اذاں سے ہمکنار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائر نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانون سحر کا تار تار

معنی: **دختر دوشیزہ:** کنواری بیٹی۔ **درود فصل انجم:** ستاروں کی فصل کاٹنا۔ **کشت خاور:** مشرق کا کھیت۔ **گردوں:** آسمان۔ **شب زندہ دار:** رات بھر جاگنے والا۔ **اخلاط انگیز:** میل جول پیدا کرنے والی۔ **ترنم ریز:** گانے والا' الاپنے والا۔ **قانون:** ایک قسم کا ساز۔

مطلب: زیر تشریح نظم میں اقبال نے غروب شب اور دن کے طلوع ہونے کے حوالے سے صبح کے وقت کا ذکر کیا ہے۔ پہلے شعر میں صبح کو رات اور دن کی کنواری بیٹی سے تعبیر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ رات ختم ہو رہی ہے اور افق کے دامن سے صبح نمودار ہو رہی ہے۔ آسمان پر جو درخشاں ستارے تھے وہ تمام شب اپنی ذمہ داری نبھا کر ڈوب چکے ہیں۔ اور مشرق کی جانب سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔ آسمان کو جب آمد آفتاب کی خبر ملی تو اس نے تو شب کو رخصت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس عمل سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ستاروں کی روشنی کو اب سورج کی تابندگی میں منتقل کر دیا ہے۔

صبح کا ستارہ اس لمحے اپنا سفر طے کر کے اس طرح منزل کی جانب روانہ ہو رہا ہے جیسے کوئی عبادت گزار ساری رات محو عبادت رہ کر سب سے آخر میں عبادت گاہ سے روانہ ہوا ہو۔ مراد یہ ہے کہ باقی ستارے تو پہلے ہی ڈوب گئے ہیں جب کہ صبح کا ستارہ سب سے آخر میں اپنا سفر ختم کر سکا ہے۔ اس لمحے افق سے جس طرح سورج کی کرنیں آہستہ آہستہ منعکس ہو رہی ہیں۔ ان کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ میان سے کوئی چمکدار تلوار باہر نکال رہا ہے۔ سورج کے طلوع ہونے کے عمل میں صبح کا وجود یوں ظاہر ہو رہا ہے جیسے کہ بوتل سے شراب برآمد ہو رہی ہو۔ **صبحدم** جو خوشگوار ہوا چل رہی ہے اس میں اذان کی آواز اور مندروں کی گھنٹیوں کے نغمے یکجا ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئل کے نغموں سے تمام دوسرے پرندے بھی بیدار ہو گئے ہیں۔ غرض یہ کہ صبح اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہو گئی ہے۔

099 تضمین بر شعر انیسی شاملو

ہمیشہ صورت باد سحر آوارہ رہتا ہوں
محبت میں ہے منزل سے بھی خوشتر جادہ پیمائی

دل بیتاب جا پہنچا دیار پیر سنجر میں
میسر ہے جہاں درمان درد ناشکیبائی

ابھی نا آشنائے لب تھا حرف آرزو میرا
زباں ہونے کو تھی منت پذیر تاب گویائی

یہ مرقد سے صدا آئی حرم کے رہنے والوں کو
شکایت تجھ سے ہے اے تارک آئین آبائی

ترا اے قیس! کیونکر ہو گیا سوز دروں ٹھنڈا؟
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی انداز لیلائی

نہ تخم لا الہ تیری زمین شور سے پھوٹا
زمانے بھر میں رسوا ہے تری فطرت کی نازائی

تجھے معلوم ہے غافل کہ تیری زندگی کیا ہے؟
کنشتی ساز' معمور نواہائے کلیسائی

ہوئی ہے تربیت آغوش بیت اللہ میں تیری
دل شوریدہ ہے لیکن صنم خانے کا سودائی

"وفا آموختی ازما' بکار دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی"

❁

① سے ⑨ **معنی:** **دیار پیر سنجر:** خواجہ معین الدین کی سرزمین اجمیر شریف۔ **درد ناشکیبائی:** بے صبری کا دکھ۔ **منت پذیر تاب گویائی:** تقریر کی طاقت کا احسان اٹھانا۔ **تخم:** بیج۔ **کنشتی ساز:** بت خانہ کا ساز۔

نواہائے کلیسائی: گرجے کے نغمے۔
مطلب: "انیسی شاملو" ایک ترک شاعر جس کا تعلق ایران سے تھا اقبال نے یہ اشعار اس کے ایک شعر کی تضمین کے طور پر کہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میری کیفیت یہ ہے کہ جس طرح صبح کی ہوا سرگرداں رہتی ہے اسی طرح میں بھی ہمیشہ آوارہ پھرتا رہتا ہوں اس لئے کہ میرے نزدیک محبت کی انتہا تک پہنچنے سے کہیں بہتر سرگراں رہنا ہے چنانچہ اسی عالم میں پھرتا پھراتا حضرت معین الدین چشتی اجمیری کے مزار پر پہنچ گیا۔ جہاں بے چینی اور اضطراب کا علاج میسر ہوتا ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے ابھی دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے تھے نا ہی میں حرف مدعا زبان پر لایا تھا کہ قبر سے آواز آئی! کہ حرم کعبہ کو مسلمانوں سے یہ شکایت ہے کہ تم لوگ اپنے مذہبی عقائد کو ترک کر کے ان سے قطعی طور پر بے نیاز ہو گئے ہو۔
تم لوگ تو عشق حقیقی میں مجنوں کے مانند تھے کہ اس کے لیے لیلیٰ کا تصور ہی سب کچھ تھا چنانچہ دینی عقائد تو برقرار ہیں البتہ تم لوگ ہی ان کو نظرانداز کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ تمہارے دل تو بنجر زمین کے مانند ہیں جہاں توحید کا بیج تو بویا گیا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا یہی وجہ ہے کہ تمہاری فطرت میں جو بانجھ پن موجود ہے اس کے سبب تم لوگ زمانے بھر میں رسوا ہو کر رہ گئے۔ تمہیں تو اس حقیقت کا علم بھی نہیں کہ تمہاری اصل زندگی کیا ہے۔ لگتا ہے کہ تمہارے ذہنوں میں اسلام کی بجائے دوسرے مذاہب کے عقائد بار آور ہو رہے ہیں۔ ہر چند کہ تمہاری تربیت خدا کے گھر میں ہوئی ہے اس کے باوجود تمہارے دل بت خانوں کے شیدائی ہیں۔
تو نے وفا کا سبق تو ہم سے حاصل کیا لیکن اس وفا کو اغیار کے کام میں لایا۔ موتی ہم سے حاصل کیا قربان دوسروں پر کر دیا۔

فلسفہ غم 100

(میاں فضل حسین صاحب بیرسٹرایٹ لاء لاہور کے نام)

گو سراپا کیف عشرت ہے شراب زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحاب زندگی
موج غم پر رقص کرتا ہے حباب زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزو کتاب زندگی
ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں
آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمہ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
دیدۂ بینا میں داغ غم چراغ سینہ ہے
روح کو سامان زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثات غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گرد ملال
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

اور اپنے ہم جماعت سر فضل حسین کے والد کی وفات پر ایک مرثیے کے طور پر کہی تھی لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ہر مرنے والے کا مرثیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ طویل نظم بتیس اشعار پر چھ بند کی شکل میں "بانگ درا" کی اہم نظموں میں سے ایک ہے۔ فرماتے ہیں:

پہلا بند معنی: **سحاب:** بادل۔ **الم:** رنج و غم۔ قرآن مجید کے پہلے پارہ کا نام۔ **خزاں نادیدہ:** جس نے خزاں نہ دیکھی ہو۔

مطلب: ہر چند کہ حیات انسانی سرتاپا کیف و عشرت کے علاوہ مسرت و شادمانی کی متقاضی ہے اس کے باوجود اس میں غم واندوہ اور آنسو بھی موجود ہیں۔ اگر غم واندوہ کو ایک موج تصور کر لیا جائے اور زندگی کو حباب تو جان لوپانی کا یہ قطرہ موج غم پر رقص کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر زندگی کو ایک کتاب سے تعبیر کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ غم اس کتاب کا ایک اہم باب ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ کسی پھول میں ایک پتی بھی کم ہو جائے تو اسے مکمل پھول نہیں سمجھا جا سکتا۔ مزید برآں کسی بلبل کو خزاں سے واسطہ نہیں پڑا تو وہ بلبل کہلانے کی مستحق نہیں۔

دوسرا بند

عملی سطح پر انسانی دل کی داستاں خواہشات اور تمناؤں کے خون سے رنگی ہوئی ہے یعنی انسانی خواہشات کی تکمیل ممکنات سے نہیں اسی طرح انسانی زندگی میں خوشی، غم کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اہل نظر کے لیے غموں کے داغ ان کے سینوں پر چراغوں کے مانند ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب دل سے آہ نکلتی ہے تو وہ روح کی تزئین کا سبب بن جاتی ہے۔ ایک طرح سے حادثات غم کے بغیر فطرت انسانی کو کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی نہیں بلکہ غم وملال کی گرد دل کے آئینے پر غازہ کی مانند ہوتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ عالم شباب جو ہمیشہ کیف و سرمستی کے سبب ایک طرح محو خواب رہتا ہے اسے بیدار کرنے میں بھی غم کا بڑا عمل دخل ہے کہ یہ ساز اسی مضراب سے نغمے پیدا کرتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں اگر دل کو ایک پرندہ تصور کر لیا جائے تو یہ غم کی کیفیت ہی ہے جو اس کی پرواز کے لیے پروں کا درجہ رکھتی ہے اور اگر انسان کے دل کو ایک راز سمجھ لیا جائے تو اس راز کا انکشاف غم کے باعث ہی ہوتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ غم کی کیفیت روح انسانی کے لیے ایک خاموش نغمے کی مانند ہے ایسا نغمہ جو سازوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے جو انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

تیسرا بند معنی: **انکشاف راز:** بھید کا کھلنا۔

مطلب: جو شخص بوقت شام نالہ و فریاد نہیں کرتا اور شب کی تنہائی میں وفور درد کے سبب آنسو نہیں بہاتا جس کا دل غم کے سبب ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوا اور ساری عمر عیش و عشرت میں مصروف رہا۔ باغوں کے پھول توڑتے وقت جس کے ہاتھ ان کے کانٹوں سے محفوظ رہے اور جس کا عشق فرقت اور جدائی سے ہم کنار نہیں ہوا ہر چند کہ اس کے روز و شب غموں سے بے نیاز سہی اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس کی نظروں سے زندگی کی تمام حقیقتیں پوشیدہ رہتی ہیں۔ چنانچہ اے دوست! بے شک تجھے نظام کائنات سے پوری طرح آگاہی حاصل ہے اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ تیرے لیے غم واندوہ سے عہدہ برآ ہونا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوگا۔

چوتھا بند معنی: **یارب**: خدا کا نام لینا یعنی فریاد کرنا۔ **اشک کے کوکب**: آنسوؤں کے تارے۔ **نظم دہر کا ادراک**: زمانے کے کاروبار سے آگاہی۔

مطلب: اس بند میں اقبال ایک دوسرے رخ سے اپنے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابدی سطح پر عشق انسانی بے شک ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ انسانی عقل و دانش تو فنا ہونے والی اشیاء میں سے ہیں۔ صرف جذبہ عشق ہی وہ جذبہ ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ یہی عشق ہے جو موت کی شکست کا باعث ہے لیکن یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ محبوب کی جدائی کا مقصد موت کے مترادف ہوتا اور محبت کا جوش و جذبہ بھی محبت کرنے والے کے دل میں باقی نہیں رہتا تو اس پس منظر میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جانا چاہیے کہ اگر محبوب کی موت واقع ہو جائے تو اس کے سبب عشق تو فنا نہیں ہو جاتا بلکہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس لمحے عشق روح میں غم کی شکل میں محفوظ ہو جاتا ہے ختم نہیں ہوتا۔ اس طرح ماننا پڑے گا کہ جب تک عشق باقی ہے محبوب بھی باقی ہے گویا فنا ہونے کے باوجود محبوب زندہ رہتا ہے۔

پانچواں بند معنی: **نسخہ دیرینہ**: پرانی کتاب۔ **عدم نا آشنا**: جو عدم سے آشنا نہ ہو۔

مطلب: اس بند میں اقبال جو منظر نامہ پیش کرتے ہیں اس کے مطابق ایک ندی ہے جو پہاڑ کی چوٹی سے نغمے گاتی ہوئی رواں دواں ہے۔ یہی ندی بلند و بالا فضا میں محو پرواز پرندوں کو گانے کے لیے اکساتی ہے۔ اس ندی کا شفاف پانی ایک حور کے چہرے کی مانند مصفا ہے۔ وادی کی چٹانوں پر جس لمحے یہ پانی آئینے کی صورت میں گرتا ہے تو چور چور ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں پانی کے قطرے موتیوں کی مانند پیارے پیارے لگ رہے ہیں اور کبھی وہ ستاروں کی طرح نظر آتے ہیں۔

یہ ندی کی موجیں جو پارے کی مانند تھیں ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو گئیں۔ جن سے ایسی بوندیں نمایاں ہو رہی ہیں جیسے کہ وہ کسی اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہوں۔ تاہم حقیقت یہ کہ ان قطروں کا انتشار عملی سطح پر باہمی ربط کا درس ہے اس لیے دو قدم آگے بڑھنے کے بعد یہ قطرے مربوط ہو کر ایک بار پھر موجوں میں ڈھل جاتے ہیں اور انسانی ہجوم کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں کہ ان کی حقیقت ہی اصل میں یہی ہے۔ دراصل اس کائنات میں ہماری جدائی آئندہ باہمی ارتباط کی آئینہ دار ہے لیکن اس عارضی جدائی پر آنسو اس لیے بہاتے ہیں کہ ہم اسے مستقل سمجھ بیٹھے ہیں۔ گویا انسان جب فنا ہو کر ہم سے بچھڑتا ہے تو عملی سطح پر یہ عارضی جدائی ہوتی ہے۔ اسی جدائی کے غم میں آنسو بہائے جاتے ہیں۔

چھٹا بند معنی: **محصور**: گھری ہوئی۔ **رزم گاہ خیر و شر**: نیکی اور بدی کا میدان جنگ۔ **گوشہ گیر**: تنہائی کے کونے میں بیٹھنے والا۔

مطلب: اس پوری نظم میں اقبال "حیات بعد الممات" کے فلسفے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی باعث وہ آخری بند کے اشعار میں واضح طور پر اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بنظر عمیق دیکھا جائے تو جو لوگ موت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں درحقیقت وہ فنا نہیں ہوتے اور روحانی سطح پر ہم سے جدا نہیں ہوتے۔ جس گھڑی انسانی عقل و دانش دنیاوی آلام و مصائب میں گھر جائے یا پھر جوانی تاریک رات میں چھپ جائے اور انسان بے بس ہو جائے قلب انسانی نیکی و بدی اور حق و باطل کی جنگ کا میدان بن کر رہ

جائے اور راہ کی تاریکیوں کے سبب منزل کی جانب سفر کرنا بھی دشوار ہو جائے۔ انسان اپنی جراءت و ہمت اور حوصلے کے حوالے آرزوؤں اور تمناؤں سے کنارہ کش ہو جائے یہی نہیں بے بسی کا یہ عالم ہو کہ انسانی فکر اور ضمیر اپنی کارکردگی میں معطل ہو کر رہ جائیں اس کے علاوہ زندگی میں کوئی ہم خیال اور ہم سفر بھی باقی نہ رہے حتیٰ کہ تاریک شب میں رہنمائی کے لیے جگنو کی ننھی روشنی تک موجود نہ ہو تو مرنے والوں کی پیشانیاں تاریکی میں اس طرح سے روشن ہو جاتی ہیں جس طرح کہ اندھیری رات میں تارے چمکتے ہیں اور ان کی روشنی مسافر کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔

101 پھول کا تحفہ عطا ہونے پر

وہ مست ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے
کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے
الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے!
کلی سے رشک گل آفتاب مجھ کو کرے
تجھے وہ شاخ سے توڑیں زہے نصیب ترے
تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے
اٹھا کے صدمہ فرقت وصال تک پہنچا
تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا
مرا کنول کہ تصدق ہیں جس پہ اہل نظر
مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر
کبھی یہ پھول ہم آغوش مدعا نہ ہوا
کسی کے دامن رنگیں سے آشنا نہ ہوا
شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے

*

① سے ② اس نظم کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے یہ نظم اپنی اس محبوبہ کے لیے لکھی تھی جس نے انہیں تحفہ کے طور پر پھول بھیجے تھے۔ یہ امر ہمیشہ سے صیغہ راز میں ہی رہا کہ ان کی یہ محبوبہ کون تھی؟ چنانچہ نظم کے پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ وہ اپنے ناز و انداز میں مست رہنے والی محبوبہ جب بھی پھول توڑنے کے لیے باغ میں جا نکلتی ہے تو اس کے لیے وہاں موجود ہر کلی کے لبوں سے دعائیں نکلتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ اس امر کی تمنا کرتے ہوئے رب ذوالجلال سے دعا کرتی ہے کہ یہ دوسری کلیوں کو چھوڑ کر میرا انتخاب ہی کرے۔ اس صورت میں میرا وجود پھول تو الگ رہے سورج کے لیے بھی باعث رشک بن جاؤں۔

③ سے ④ اس شعر میں اقبال کلی سے براہ راست مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ تیری خوش قسمتی ہے کہ میرا محبوب تجھے شاخ سے توڑ لیتا ہے۔ اس کے اس عمل پر باغ میں جو کلیاں تیری رقیب تھیں وہ یقیناً حسد کے مارے تڑپ کر رہ گئی ہوں گی۔ ہرچند کہ تجھے شاخ سے جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا لیکن میرے محبوب کے ہاتھوں کے لمس سے تیری عظمت انتہائی کمال تک پہنچ گئی۔

⑤ سے ⑦ **معنی**: تصدق: قربان۔ ہم آغوش: بغل گیر۔ فسردہ: غمگین۔

مطلب: اے کلی! اس حقیقت کو جان لے کہ میری محبوب بھی کنول کے پھول کی مانند ہے جس کو دیکھتے ہی ہر شخص اس کا والہ و شیدا بن جاتا ہے اور میری جوانی پر یقیناً اس پر فخر کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کبھی

اس کی خواہش کی تکمیل نہیں ہو سکی نا ہی وہ کسی کے دامن رنگین سے اب تک ہم آغوش ہو سکا ہے۔
اس کنول کے پھول کو کبھی بہار یعنی خوشی راس نہ آسکے گی۔ وہ تو ہمیشہ کسی گلچیں کا منتظر رہتا ہے۔

ترانہ ملی

102

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
اے گلستان اندلس! وہ دن ہیں یاد تجھکو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا
اے موج دجلہ! تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
اے ارض پاک! تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خوں تری رگوں میں ابتک رواں ہمارا
سالار کارواں ہے میر حجازؐ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا
اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

*

① سے ③ اقبال کہتے ہیں کہ چین، عرب اور ہندوستان یہ سب ہمارے ملک ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور سارا جہان ہمارے وطن کے مانند ہے۔ اس لیے کہ مسلمان اپنے عقیدے کے اعتبار سے کسی مخصوص خطہ زمین کو خود سے وابستہ نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال سارے جہان کو اپنا وطن شمار کرتے ہیں۔ ہمارے سینوں میں خدا کی وحدانیت کا تصور ایک امانت کی طرح محفوظ ہے اور اس وحدانیت کو کوئی ختم نہیں کر سکتا اس لیے ہمارا نام ونشان بھی کوئی نہیں مٹا سکتا۔ جن دنوں دنیا بھر میں کفر والحاد پھیلا ہوا تھا اور ہر سمت بت خانے ہی بت خانے تھے اس وقت خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیمؑ نے خدائے وحدت کی عبادت کے لیے اولین عمارت تعمیر کی جسے خانہ کعبہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمان خانہ کعبہ کے محافظ ہیں اور یہ ہماری حفاظت کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے سبب ملت اسلامیہ میں نظم وضبط اور وحدت کا تصور بر قرار ہے۔ یہ نہ ہوتا تو ہم ریزہ ریزہ ہو کر رہ جاتے۔

④ سے ⑥ **معنی: خنجر ہلال کا:** یعنی اسلامی جھنڈا جس کا نشان چاند تارا ہے۔

مطلب: یہ حقیقت ہے کہ ہم تلواروں کے سائے میں پل کر عنفوان شباب تک پہنچے اور اس امر سے کسے انکار ہوگا کہ ملت اسلامیہ کا سبز پرچم ہلال اور ستارے سے سجا ہوا ہے چونکہ ہلال بڑی حد تک خنجر سے مشابہ ہوتا ہے اس لیے اسے اقبال نے اسی سے تشبیہ دی ہے اور اسے اپنے قومی نشان سے تعبیر کیا ہے۔ ہر چند کہ مسلمان عساکر کا بنیادی مرکز عرب تھا اس کے باوجود ہم اپنی قوت اور ہمت کے طفیل مغرلی

ممالک پر یلغار کرتے رہے۔ یہاں ہماری اذانیں گونجتی رہیں۔ یوں یہ امر واقعہ ہے کہ ان علاقوں میں بھی ہمارے عساکر کی یلغار کے سامنے کوئی لشکر بھی نہ ٹھہر سکا اور ہم جو تھے وہ یورپی ممالک میں فتوحات حاصل کرتے رہے۔

⑦ سے ⑧ **معنی: گلستان اندلس**: ہسپانیہ کا ایک شہر۔ **دجلہ**: عراق کا مشہور دریا۔ **ارض پاک**: عرب، حجاز۔

مطلب: اس شعر میں اقبال آسمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے فلک کج رفتار یہ جان لے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو باطل سے خوف زدہ ہو کر رہ جائیں۔ اس ضمن میں تو اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ تو ایک بار نہیں سو بار ہمارا امتحان کر چکا ہے۔ اس کے ثبوت میں اندلس اور دجلہ کو ہماری جراءت و حوصلے کی داستانیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ یہاں کبھی مسلمان سلاطین کا اقتدار پورے عروج پر تھا۔ اور گرد و پیش کی وادیاں ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی زد میں ہوتے تھے۔

⑨ سے ⑩①①⑨ **معنی**: جادہ پیا: چلنے کے لیے تیار۔

مطلب: اے سرزمین حجاز! کیا تو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ ہم نے تیری عزت و حرمت کے لیے ہمیشہ اپنی جانیں قربان کی ہیں اور آج بھی تیری رگوں میں ہمارا خون رواں دواں ہے۔ اے سرزمین حجاز! تو جانتی ہے کہ تیرا والی و آقا ہمارے قافلے کا سالار اول ہے یعنی حضور سرور کائنات ﷺ کی تعلیمات کی روشنی سے ہم رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ یہی نام عملاً اسم اعظم کی طرح ہے جو ہمارے بے چین اور مضطرب دلوں کو سکون و اطمینان سے ہم کنار کرتا ہے۔

نظم کے اس مقطع میں اقبال کہتے ہیں کہ میں نے جو یہ ملی ترانہ تخلیق کیا ہے وہ ایک ایسی گھنٹی کی مانند ہے جو دوران سفر ہمیشہ رہنمائی کا سبب بنتی ہے۔ اس الارم کے ساتھ یوں سمجھ لیجیے کہ ہمارا قافلہ ایک بار پھر سے بڑی مستعدی اور نظم و نسق کے ساتھ اپنی منزل کی جانب سرگرم سفر ہو رہا ہے۔

دیکھا جائے تو زیر تشریح ملی ترانہ کے کم و بیش تمام اشعار شاعر کے اس جذبے کے مظہر ہیں جو ملت اسلامیہ کو سرکردہ حیثیت کی حامل بنانے کے لیے اس کے دل میں موجزن تھا۔

وطنیت

103

(یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے)

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے غارت گر کاشانۂ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

٭

پہلا بند معنی: پیراہن: لباس۔

مطلب: یہ نظم اس اعتبار سے خاصی اہم ہے کہ اس میں اقبال نے وطنیت کے حوالے سے واضح طور پر اپنا سیاسی نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ یہ نظم عملاً چار بند پر مشتمل ہے۔ فرماتے ہیں۔

یہ دور جس میں ہم زندہ ہیں وہ اپنی نئی روایات کے ساتھ بر سر عمل ہے یعنی پرانی اقدار مٹ رہی ہیں اور نئی قدریں جنم لے رہی ہیں۔ تہذیب کے اجارہ دار رہنماؤں نے ایسی روش کو فروغ دیا ہے جو ظلم اور التفات دونوں کیفیتوں سے ہم آہنگ ہے چنانچہ دوسری تہذیبوں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اپنی تہذیب کو چھوڑ کر ایک نیا کعبہ بنا لیا ہے یعنی ملت اسلامیہ نے اپنے تہذیب و کلچر کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اپنا لیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید تہذیب کا مشہور بت تراش آزر اب نئے بت تراشنے میں مگن ہے۔ چنانچہ اس نے اب تک جو بت تراشے ان میں سب سے بڑا اور بلند و بالا بت "وطن" کا ہے۔ اس بت کو جو لباس پہنایا ہے وہ مذہب اور عقیدے کے لیے کفن کی حیثیت رکھتا ہے یعنی وطن کی پرستش مذہب اور عقائد کے منافی ہے۔

دوسرا بند معنی: تہذیب نوی: نئی تہذیب۔ نظارۂ دیرینہ: پرانا نظارہ۔

مطلب: نئی تہذیب سے وطنیت کا تصور عبارت ہے اور یہ ایسا تصور ہے جو آنحضرتؐ کے دین اور ان کی تعلیمات کی نفی کرتا ہے لیکن اے دین محمدیؐ کے پیروکار! توحید ایسی قوت ہے جس نے تجھے ہر مرحلے پر تقویت پہنچائی ہے۔ تیرا وطن کوئی مخصوص خطہ ارض نہیں بلکہ عملی سطح پر اسلام ہی تیرا وطن عزیز۔ نا ہی تیری نسبت کسی اور شخصیت سے ہے بلکہ تو تو حضرت محمد مصطفیؐ کا پیروکار ہے چنانچہ تجھ پر لازم ہے کہ چودہ سال کی قدیم شان و شوکت اور جراءت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وطنیت کے تصور کو تباہ کر دے۔

تیسرا بند معنی: قید مقامی: زمین کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں قید۔

مطلب: اقبال اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے ملت اسلامیہ کے پیروکاروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے فرزند توحید! اس حقیقت کو جان لے کہ اگر کوئی ایک مخصوص خطہ ارض کا اسیر اور قیدی ہو کر رہ

جائے تو اس کا منطقی نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اگر تو اس کائنات کو ایک سمندر کی مانند جان لے تو یہاں تیری بود و باش ایک مچھلی کی طرح ہونی چاہیے کہ مچھلی پانی کی حدود میں کسی ایک مقام پر نہیں ٹھہرتی۔ یہ تیری ذمے داری ہے کہ نبوتؐ کی صداقت کی گواہی دے یعنی فرمانِ محمدیؐ کے مطابق وطن کے تصور کی نفی کر! یوں سیاسیات کے حوالے سے بے شک وطن کا تصور مختلف ہے لیکن ارشادِ نبویؐ کے حوالے سے وطن ایک بے معنی شے ہے۔

چوتھا بند معنی: رقابت: دشمنی۔

مطلب: دنیا بھر کی قوموں کے مابین رقابت کا جذبہ وطنیت کے سبب ہی پیدا ہوا ہے۔ اسی کے سبب تجارت کا مقصد بھی دوسرے ممالک کو تسخیر کرنا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا برائی ہوگی کہ سیاست میں صداقت اور سچائی کا جذبہ اگر ناپید ہے تو اس کا باعث بھی وطنیت کا تصور ٹھہرتا ہے۔ جو لوگ اور قومیں کمزور ہوتی ہیں ان کو تباہ و برباد کرنے میں بھی اس تصور کا بڑا حصہ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کے سبب مخلوقِ خداوندی مختلف قوموں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ اسلامی تصورِ قومیت کی جڑ کاٹنے کا باعث بھی یہی ہے۔

104 ایک حاجی مدینے کے راستے میں

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں' اور منزل ہے دور
اس بیاباں' یعنی بحرِ خشک کا ساحل ہے دور

ہم سفر میرے شکارِ دشنۂ رہزن ہوئے
بچ گئے جو' ہو کے بیدل سوئے بیت اللہ پھرے

اس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی
موت کے زہراب میں پائی ہے اس نے زندگی

خنجرِ رہزن اسے گویا ہلالِ عید تھا
"ہائے یثرب" دل میں' لب پر نعرۂ توحید تھا

خوف کہتا ہے کہ "یثرب کی طرف تنہا نہ چل"
شوق کہتا ہے کہ "تو مسلم ہے' بیباکانہ چل"

بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا؟
عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا؟

خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشتِ پیمائے حجاز
ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز

گو سلامت محملِ شامی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے

آہ! یہ عقلِ زیاں اندیش کیا چالاک ہے
اور تاثر آدمی کا کس قدر بیباک ہے

*

① سے ④ **معنی:** دشنہ: خنجر۔ زہراب: زہر بھرا پیالہ۔

مطلب: علامہ نے یہ نظم ایک حاجی کے بیان کی روشنی میں کہی ہے جو حج بیت اللہ کے بعد زیارت کے لیے اپنے قافلے کے ہمراہ مکے سے مدینے جا رہا تھا۔ راستے میں رہزنوں نے نہ صرف یہ کہ اہلِ قافلہ کو لوٹ لیا بلکہ جن لوگوں نے مزاحمت کی ان کو قتل بھی کر دیا۔ چنانچہ اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ رہزنوں نے صحرا میں قافلے کو لوٹ لیا ہے اور ابھی ہم منزل سے کوسوں دور ہیں۔ حاجی کہتا ہے کہ میرے کئی ہم سفر رہزنوں کی تلواروں کا نشانہ بن گئے اور ان کے خوف کے سبب جو لوگ بچ گئے تھے وہ واپس بیت اللہ کی

جانب روانہ ہو گئے۔ لیکن قافلے میں سے ایک بخاری نوجوان نے رہزنوں کے خلاف بڑی جراءت و ہمت کے ساتھ نبرد آزمائی کی اور بالآخر شہادت کا رتبہ حاصل کر لیا۔ ظاہر ہے کہ شہادت موت نہیں بلکہ ابدی زندگی سے عبارت ہے۔ ایک رہزن کا خنجر اس بخاری نوجوان کے لیے ہلال عید کے مانند تھا۔ اس لمحے بھی اس کے لبوں پر مدینہ اور توحید کا نعرہ تھا۔

⑤ سے ⑨ **معنی** : **مدفون یثرب** : وہ پاک ذات جو مدینہ میں دفن ہے۔ مراد ہے حضرت رسول اکرم ﷺ۔ **محمل شامی**: غلاف کعبہ لانے والا وہ قافلہ جو شام سے آتا تھا۔ **جانکاہی**: محنت۔

مطلب: حاجی کہتا ہے کہ ان رہزنوں کا خوف مجھے مدینے کی جانب تنہا جانے سے روکتا ہے لیکن شوق زیارت کا تقاضا ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے اپنی منزل کی جانب بڑی جراءت اور بیباکی سے اپنا سفر جاری رکھوں۔ اگر مدینے میں روضہ رسول مقبولؐ کی زیارت کے بغیر ہی واپس مکہ چلا گیا تو ان لوگوں کو کیسے منہ دکھا سکوں گا جو عاشق رسولؐ ہیں۔ یوں بھی دشت حجاز میں سفر کرنے والوں کو جان کا خوف نہیں ہوتا۔ مدینے میں حضورؐ کی ہجرت میں بھی یہی راز پوشیدہ ہے۔ اگرچہ شامی محمل کے ساتھ یہ سفر تحفظ کا احساس دلاتا ہے لیکن عشق کی لذت تو خطروں میں ہی چھپی ہوتی ہے۔ افسوس کہ عقل انسانی ہمیشہ خسارے کے انداز میں سوچتی ہے۔ جب کہ انسان کا جذبہ عشق نڈر اور بیباک ہوتا ہے۔

105 قطعہ

کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

یہ زائران حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

غضب ہیں یہ "مرشدان خود بیں" خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

سنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

*

معنی: **شوریدہ**: دیوانہ۔ **بنائے ملت**: ملت کی بنیاد۔ **مرشدان خود بیں**: صرف اپنی عزت اور منافع پر نظر رکھنے والے۔

مطلب: زیر تشریح قطعہ یوں تو محض چار اشعار پر مشتمل ہے تاہم ان اشعار میں اقبال نے ایک ایسا نکتہ بیان کیا ہے جس کو ان کی فکر کے حوالے سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

کل ایک شوریدہ سر یعنی دیوانہ انسان مزار رسول مقبولؐ پر کھڑا ہوا آہ و زاری کرتے ہوئے فریاد کر رہا تھا کہ حضورؐ دیکھیے! یہ جو ہندوستان اور مصر کے مسلمان ہیں ان کا کردار اس قدر منفی ہے جو مسلم قومیت کی تباہی و بربادی کا باعث بن کر رہ گیا ہے۔ یہ مغربی تہذیب و تمدن پر ایمان رکھنے والے لوگ ہمارے رہنما بننے کی کتنی بھی کوشش کریں وہ ہمارے رہبر اس لیے نہیں بن سکتے کہ آپ کی تعلیمات سے بے بہرہ ہیں۔

یہ لوگ تو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر خود ساختہ رہنما بنے بیٹھے ہیں۔ خداوند تعالیٰ قوم کو ان کے کردار

یہ لوگ تو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر خود ساختہ رہنما بنے بیٹھے ہیں۔ خداوند تعالیٰ قوم کو ان کے کردار
سے بچائے کہ یہ لوگ مسلمانوں کو صحیح راہ سے بھٹکا کر محض اپنے وقار کو بلند کرنے میں سرگرداں ہیں۔
یہی لوگ تو آج ملت اسلامیہ کے زوال کا سبب بنے ہوئے ہیں۔
آخری شعر میں اقبال اپنے نظریات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب تو زمانہ بدل
گیا ہے۔ تہذیب بدل گئی ہے اور تم ہو کہ اپنی شاعری کے حوالے سے پرانی باتیں دہرا رہے ہو۔ آج کے
دور میں آخر کون ان باتوں کو سنے گا؟

شکوہ

اکتیس بند پر مشتمل "شکوہ" اقبال کی ان معرکتہ الارا طویل نظموں سے بے حد اہم نظم ہے جسے اس
صدی کی انتہائی مقبول تخلیق سے تعبیر کیا جائے گا تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نظم
میں اقبال مکالمہ تو رب ذوالجلال سے کرتے ہیں لیکن ان کا لہجہ معمول سے بھی زیادہ تند و تیز ہے۔"
شکوہ" ہی وہ نظم ہے جس کے حوالے سے اقبال پر کفر کے فتوے بھی عائد کیے گئے اور بیسویں صدی کے
آغاز میں اس کی اشاعت پر بھی خاصی لے دے ہوئی۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے دفاع میں "جواب شکوہ"
جیسی نظم بھی لکھنا پڑی۔ جس کا ذکر اگلے صفحات میں آئے گا۔ زیر تشریح نظم "شکوہ" فکری سطح پر ہی نہیں
فنی اور تکنیکی بنیاد پر بھی ایک بلند پایہ نظم ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اُمت ترے محبوب کی دیوانی تھی؟

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
اہلِ چیں چین میں، ایران میں ساسانی بھی

اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے

تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے؟

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی!

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اَڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اُکھڑ جاتے تھے

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے، ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقشِ توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تُو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے
شہر قیصر کا جو تھا اُس کو کیا سر کس نے

توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے
کاٹ کر رکھ دیے کفّار کے لشکر کس نے

کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی　　اور تیرے لیے زحمت کشِ پیکار ہوئی
کس کی شمشیر جہاں گیر، جہاں دار ہوئی　　کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھُوَ اللہُ اَحَد کہتے تھے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز　　قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے　　مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے　　اور معلوم ہے تجھ کو، کبھی ناکام پھرے!

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تُو بھی تو دلدار نہیں!

اُمتیں اور بھی ہیں، ان میں گنہ گار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں، مستِ مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں
سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بُت صنم خانوں میں کہتے ہیں، مسلمان گئے
ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

شکایت نہیں ہیں اُن کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب

تُو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

طعنِ اغیار ہے، رُسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا

ہم تو رخصت ہوئے، اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے!

تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلا لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

دردِ لیلیٰ بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی، حسن کا جادو بھی وہی
امتِ احمدِ مرسل بھی وہی، تو بھی وہی
پھر یہ آزردگیِ غیرِ سبب کیا معنی
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا؟
بت گری پیشہ کیا، بت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟
رسمِ سلمانؓ و اویسِ قرنیؓ کو چھوڑا؟
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی

مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے!

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے
اک اشارے میں ہزاروں کے لیے دل تو نے

آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے
پھونک دی گرمیِ رخسار سے محفل تو نے

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں، تجھے یاد نہیں؟

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا

حوصلے وہ نہ رہے، ہم نہ رہے، دل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جُو بیٹھے
سُنتے ہیں جامِ بکف نغمۂ کُوکُو بیٹھے
دُور ہنگامۂ گلزار سے یکسُو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ 'ھُو' بیٹھے
اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خُود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قومِ آوارہ عناں تاب ہے پھر سُوئے حجاز
لے اُڑا بُلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بُوئے نیاز
تُو ذرا چھیڑ تو دے، تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طُور مضطر ہے اُسی آگ میں جلنے کے لیے

مُشکلیں اُمّتِ مرحُوم کی آساں کر دے
مُورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبّت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دَیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جُوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمّازِ چمن!

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن
اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتّیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں

وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی!

لطف مرنے میں ہے باقی، نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں

کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں، وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں

یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خُم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری!

پہلا بند **معنی**: **زیاں کار**: اپنا نقصان کرنے والا۔ **سود فراموش**: اپنے نفع سے غافل۔ **فکر فردا**: کل کی فکر۔ **غم دوش**: ماضی کا غم۔ **نالے**: رونا۔ **ہمہ تن گوش**: پوری طرح متوجہ۔ **ہمنوا**: دوست۔ **جراءت آموز**: دلیری سکھانے والی۔ **تاب سخن**: قوت گفتار۔ **خاکم بدہن**: میرے منہ میں خاک۔

مطلب: نظم کا آغاز خاصے تند و تیز لہجے میں کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ زندگی میں نقصان اٹھاؤں اور فوائد حاصل نہ کروں۔ یہ بھی بے معنی بات ہے کہ عصر موجود کی فکر میں تو گھلتا رہوں اور مستقبل کی طرف دھیان نہ دوں۔ کیا یہ مضحکہ خیز امر نہیں ہے کہ بلبلوں کی نالہ و فریاد تک ہی خود کو محدود رکھوں اور اس کی بجائے کسی دوسری جانب ہی خود کو متوجہ رکھوں۔ رب ذوالجلال نے تو مجھے ایسی قوت گویائی عطا کی ہے جو بڑی جراءت اور حاصلے کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "خاکم بدہن" میں اب اپنے پالنے والے سے ہی شکوہ و شکایت کر رہا ہوں۔

دوسرا بند **معنی**: **شیوۂ تسلیم**: اطاعت کی عادت۔ **ارباب وفا**: اہل وفا، وفادار لوگ۔ **خوگر حمد**: خدا کی تعریف کرنے کے عادی۔

مطلب: یہ امر حقیقت پر مبنی ہے کہ ہم پیغمبر اسلامؐ کے پیروکار رضائے الٰہی کے مطابق زندگی گزارنے کے عمل میں خاصی شہرت رکھتے ہیں پھر بھی حالات نے اس قدر مجبور کر دیا ہے کہ اپنے درد کا قصہ بیان کرنا اب ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ بے شک ہماری ہستی ایک ساز خاموش کی مانند ہے کہ دل ہے کہ فریاد سے معمور ہے۔ چنانچہ اس صورت میں نالہ و فریاد لبوں تک آ جائے تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے بلکہ یہ تو ایک طرح سے ہماری مجبوری ہے۔

چنانچہ اے رب ذوالجلال! ہم جو ہمیشہ تیری حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں۔ اب انہی وفادار لوگوں سے تھوڑا سا شکوہ بھی سن لے کہ ہم جو ہمیشہ سے تیری حمد و توصیف کے عادی رہے ہیں اب ان سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے۔ کہ یہ ایک دردمند دل سے نکلی ہوئی ایسی آواز ہے جو حقیقت حال سے تعبیر کی جائی

تیسرا بند **معنی**: **ازل**: وہ زمانہ جس کی ابتداء نہیں۔ **بوئے گل**: پھول کی خوشبو۔ **جمعیت خاطر**: اطمینان قلب۔ اے خدا! بے شک تیری ذات قدیم تو ازل سے ہی موجود ہے اس کے باوجود تیری ذات ایک ایسے پھول کی مانند تھی، ہوا نہ ہونے کے باعث جس کی خوشبو چمن میں پھیلنے کے امکانات نہ تھے۔ اے مہربان و کریم انصاف کا تقاضا تو اس سوچ میں مضمر ہے کہ اگر ہوا موجود نہ ہو تو پھول کی خوشبو باغ میں کسی طور بھی نہیں پھیل سکتی۔ یہ ملت اسلامیہ ہی تھی جس نے تیرا پیغام عام کیا۔ ہم اگر تیرا پیغام لے کر دنیا بھر میں مارے مارے پھرتے تھے تو یہ پریشانی اور سرگردانی ہمارے لیے وجہ تسلی تھی۔ ورنہ تیرے پیغمبرؐ کی یہ امت دیوانی تو نہ تھی کہ دربدر پھرے۔

چوتھا بند **معنی**: **معبود**: جس کی عبادت کی جائے۔ **خوگر**: عادی۔

مطلب: ملت اسلامیہ سے قبل تو اے خدا! تیری دنیا کی عجیب و غریب کیفیت تھی۔ کہیں تو پتھروں کو اور کہیں لوگوں نے درختوں کو اپنا معبود بنایا ہوا تھا اور یہ لوگ انہی کی پرستش کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ان اشیا کو اپنا خالق سمجھنے کا عادی ہو چکا تھا جس کے وجود کو خود محسوس کر سکے۔ اس صورت میں تجھے کون مانتا کہ جو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔

یہ حقیقت بھی تیرے علم میں ہے کہ ان دنوں کوئی شخص بھی تیرا نام لینے اور تیری عبادت کرنے کا قائل نہ تھا۔ یہ صرف اہل اسلام کی قوت ایمان اور قوت بازو ہی تھیں جن کے سبب کائنات کے گوشے گوشے میں تیرا نام عام ہو گیا اور ہر طرف تیری عبادت ہونے لگی۔

پانچواں بند معنی: سلجوق: سلجوقی خاندان۔ **معمورے:** آبادی۔ **نصرانی:** عیسائی۔

مطلب: اس بند میں اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے قبل اس دنیا میں ترکوں کا قبیلہ سلجوق بھی تھا' اور توران کے طول و عرض میں تورانی بھی موجود تھے۔ چین جیسے وسیع و عریض ملک میں چینی باشندے بھی مقیم تھے اور ایران ساسانیوں کی شوکت و جلال کا مظہر تھا۔ پھر یہاں یونانی بھی رہتے تھے۔ اسی دنیا میں یہودی اور نصرانی بھی رہتے تھے۔ اس کے باوجود تیرے نام کے تحفظ کی خاطر یہ تو بتا تلوار کس نے اٹھائی اور تصور توحید سے بغاوت کرنے والوں کے خلاف مسلمانوں کے علاوہ کون نبرد آزما ہوا۔

چھٹا بند معنی: معرکہ آراؤں: جنگجو۔ **کلیساؤں:** گرجا۔ **جہانداروں:** بادشاہ۔

مطلب: اے معبود حقیقی ہم مسلمان ہی تھے جو ساری دنیا میں تیرے مخالفین کے مقابل نبرد آزما رہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے کبھی ہم دشمن کے خلاف صحراؤں میں اور کبھی دریاؤں اور سمندروں میں جا کر صف آرا ہوئے۔ کبھی یورپی ممالک کو فتح کر کے وہاں کے کلیساؤں میں جا کر اذانیں دیں اور نغمہ توحید سنایا۔ اور کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں پہنچ کر آوازۂ حق بلند کیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو بڑے بڑے شان و شوکت والے سلاطین کی عظمت مرعوب نہ کر سکتی تھی اس لیے ہم تو تلواروں کی چھاؤں میں کلمہ پڑھنے کی جراءت اور حوصلہ رکھتے تھے۔

ساتواں بند معنی: تیغ زنی: تلوار چلانا۔ **سر بکف:** جان ہتھیلی پر رکھنا۔ **بت شکنی:** بت توڑنا۔

مطلب: اے خدائے ذوالجلال! ہم مسلمان تو اپنے حریفوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے جیا کرتے تھے اور تیرے نام کی عظمت کے لیے زندگی قربان کر دیتے تھے۔ جہاں تک ہماری تیغ زنی کا تعلق تھا وہ محض

اپنی حکومتوں کے تحفظ کی خاطر نہیں تھا۔ نا ہی ہم دولت کے لیے دنیا بھر میں اپنا سر ہتھیلیوں پر لے کر پھرتے تھے۔ اگر ہماری قوم مال و دولت پر مرتی تو بت شکنی کیوں کرتی۔

آٹھواں بند **معنی: سرکش:** باغی۔

مطلب: ہم مسلمان تو وہ حوصلہ مند لوگ تھے جب میدان جنگ میں پہنچ گئے تو فتح حاصل کیے بغیر واپس نہ پلٹے۔ انسان تو انسان ہم تو وہاں شیروں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیا کرتے تھے۔ اگر تیرے خلاف کوئی بغاوت پر آمادہ ہوتا تو ہم اس کے خلاف ڈٹ جاتے اور پھر تلوار تو الگ رہی ہم لوگ تو توپ کے مقابل بھی سینہ سپر ہو جاتے۔ اے مالک حقیقی! یہ بتا کہ ہمارے علاوہ توحید کا علم بلند اور کس نے کیا ہم تو تیرا یہ پیغام زیر خنجر بھی سنایا۔ آخری مصرع میں علامہ کا اشارہ نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؓ کی جانب ہے جنہوں نے

میدان کربلا میں حق کی فتح کے لیے اپنا سر کٹوا دیا۔

نواں بند **معنی: شہر قیصر:** روم کی سلطنت۔ **یزداں:** نیکی کا خدا۔

مطلب: اے خدا اتنا بتا دے کہ یہودیوں کی مشہور بستی خیبر میں القدس کا دروازہ کس نے تن تنہا اکھاڑ پھینکا۔ ایک روایت کے مطابق یہ دروازہ اتنا وسیع و عریض اور مضبوط تھا کہ اسے کم و بیش سو افراد مل کر بند کیا کرتے اور کھولا کرتے تھے۔ تاریخ اسلام کا یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ شیر خدا حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے جنگ خیبر کے دوران تنہا یہ دروازہ اکھاڑ پھینکا تھا۔ جس کے بعد لشکر اسلام نے باسانی اس انتہائی مضبوط قلعے کو تسخیر کر لیا۔ قیصر روم کے عظیم شہر قسطنطنیہ کو کس نے فتح کیا۔ وہ کون تھے جنہوں نے ایسے نافرمان لوگوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ جو مخلوق ہونے کے باوجود خالق بن بیٹھے تھے اور یہ بھی بتا دے کہ

کفاروں کے لشکروں کو کن لوگوں نے تباہی سے دوچار کیا۔ جس دور میں ایران میں آگ کی پرستش کی جاتی تھی اور وہاں کے لوگ اسی واسطے سے آتش پرست کہلاتے تھے ان کے آتشکدوں کو ہمیشہ کے لیے بجھا دینے والے کون لوگ تھے۔ چنانچہ اس عمل کے بعد ذکر توحید کو از سر نو کس نے زندہ کیا؟

دسواں بند معنی: زحمت کش پیکار: جنگ و جدل کی تکلیف۔ **صنم:** بت۔

مطلب: اے خدا! یہ بتا کہ ملت اسلامیہ کے علاوہ اور کون سی قوم تھی جس نے تجھ سے محبت کی اور تیری خاطر ہمیشہ میدان کارزار میں سرگرم عمل رہی۔ وہ کس قوم کی تلوار تھی جس نے ساری دنیا کو تسخیر کیا اور اس پر حکومت کی۔ کس کے نعرۂ تکبیر سے دنیا بیدار ہوئی اور نیک و بد کی تمیز سیکھی۔ وہ کون سی قوم تھی جس کے خوف سے بت بھی سہمے ہوئے رہتے تھے اور ان کو سامنے پا کر سجدے میں گر جاتے اور تیری وحدانیت کا اقرار کر لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوم مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھی۔

گیارہواں بند معنی: زمیں بوس: زمین کو بوسہ دینا مراد سجدہ کرنا۔ **بندہ:** غلام۔ **غنی:** دولت مند۔

مطلب: اے معبود حقیقی! تو اس امر سے یقیناً آگاہ ہے کہ میدان جنگ میں زبردست نبرد آزمائی کے دوران تیری عبادت یعنی نماز کا وقت آ گیا تو مسلمان عساکر نے دشمن کی تلواروں کی پروا کیے بغیر خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے اپنی صفیں سیدھی کر لیں اور سجدہ ریز ہو گئے۔ اس دوران ان عساکر میں بندۂ و آقا کی تمیز مٹ گئی اور دوران نماز آقا و غلام، امیر اور غریب سب کا فرق ختم ہو گیا اور سب برابر ہو گئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تیری سرکار میں پہنچ کر یہ سب لوگ ایک ہو گئے۔

بارہواں بند معنی: محفل کون و مکاں: مراد دنیا۔ **بحر ظلمات:** بحر اوقیانوس۔

مطلب: تجھے معلوم ہے کہ ایک عرصے تک مسلمان تیرا پیغام لے کر ہمہ وقت ساری دنیا میں پھرتے رہے اور ہر فرد کو دعوت توحید دیتے رہے۔ تیرا پیغام لے کر تو وہ پہاڑوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے اور اس امر کا تو تجھے علم ہی ہے کہ اس عمل میں کبھی ناکام ہوئے نہ وہاں سے ناکام لوٹ کر آئے۔

اے آقا! تجھے علم ہے کہ صحرا تو الگ رہے ہم نے تو دریا بھی نہیں چھوڑے اور بحرِ اوقیانوس تک میں اپنے گھوڑے دوڑا دیئے۔

تیرہواں بند **معنی:** **باطل:** کفر۔ **جبینوں:** ماتھا۔

مطلب: ہم مسلمانوں نے اپنی جدوجہد اور قربانیوں سے باطل کو مٹا کر سچائی کا بول بالا کر دیا۔ اور انسان کو دوسرے انسان کی غلامی سے نجات دلائی۔ تیرے کعبے سے بتوں کو نکال کر اپنی پیشانیوں سے آباد کیا۔ تیرا قرآن اپنے سینوں میں محفوظ کر کے رکھا۔ اس کے باوجود تجھے یہ گلا ہے کہ ہم تیرے وفادار بندے نہیں ہیں۔ مگر یہ جان لے کہ ہم وفادار نہیں تو تو نے ہماری کونسی دل دہی کی ہے؟ یعنی ہم مسلمانوں نے تو تیرے لیے ہر ممکن قربانی دی جب کہ تیرا سلوک نمایاں ہے۔

چودہواں بند **معنی:** **کاشانوں:** قیام گاہ۔

مطلب: اے خدا! بے شک اس دنیا میں ملت اسلامیہ کے علاوہ اور بھی کئی قومیں آباد ہیں۔ ان میں نیک لوگ بھی موجود ہیں اور گنہگار بھی! ایسے لوگ بھی ہیں جو انتہائی عجز و انکساری کے ساتھ زندگی گذارتے ہیں اور ایسے افراد بھی موجود ہیں جو انتہائی مغرور و متکبر واقع ہوئے ہیں۔ ان میں کاہل بھی ہیں ہوشیار بھی اور غفلت شعار بھی موجود ہیں۔ اور صدہا ایسے لوگ ہیں جو تیرا نام لینا پسند نہیں کرتے اور تجھ سے کد رکھتے ہیں لیکن صورت یہ ہے کہ ہمارے دشمنوں پر تو تیری رحمت کا نزول ہوتا ہے لیکن ہم

مسلانوں پر تو عذاب ہی نازل ہوتا رہتا ہے۔

پندرھواں بند معنی: منزل دہر: دنیا کی منزل۔ حدی خواں: ساربان۔ خندہ زن: تمسخر کرنے والا۔

مطلب: چنانچہ اب تو کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ہمارے دشمن علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کا تو خاتمہ ہو گیا ان کو بڑی مسرت ہے کہ جو لوگ کعبہ کے نگہبان تھے وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ وہ لوگ جو قافلے میں اونٹوں کے ساتھ نغمے گاتے سفر کرتے تھے' چلے گئے۔ صرف یہی لوگ نہیں بلکہ اپنے ہمراہ قرآن کو بھی بغلوں میں دبائے روانہ ہو گئے۔ مراد یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی زوال پذیری پر دوسرے حریف بغلیں بجا رہے ہیں کہ یہ قوم تو قرآن کو بھی بغلوں میں دبا کر لے گئی۔ تو جانتا ہے کہ کفار ہماری تضحیک پر آمادہ ہیں لیکن تجھے شاید اپنی توحید کا کچھ بھی پاس نہیں ہے۔

سولھواں بند معنی: معمور: بھرے ہوئے۔ شعور: تمیز۔ مدارات: تواضع۔

مطلب: یہ کوئی شکایت نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ تو نے ان لوگوں کو مال و دولت سے نوازا ہے اور ان کے خزانے بھر دیئے ہیں جنہیں کسی محفل میں بات کرنے کا شعور بھی نہیں ہے۔ افسوس محض اس بات کا ہے کہ کافروں کو تو اس دنیا میں ہی تو نے محلات اور لونڈیاں عطا کی ہیں جب کہ ہم مسلمانوں کو محض وعدۂ حور پر ہی ٹرخا دیا ہے۔ اور وہ حوریں بھی بہشت میں داخل ہونے پر مشروط ہیں۔ آخر ہم سے کیا خطا ہو گئی جو پہلے کی طرح ہم تیرے لطف و کرم سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔

مطلب: یہ کوئی شکایت نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ تو نے ان لوگوں کو مال و دولت سے نوازا ہے اور ان کے خزانے بھر دیے ہیں جنہیں کسی محفل میں بات کرنے کا شعور بھی نہیں ہے۔ افسوس محض اس بات کا ہے کہ کافروں کو تو اس دنیا میں ہی تو نے محلات اور لونڈیاں عطا کی ہیں جب کہ ہم مسلمانوں کو محض وعدۂ حور پر ہی ٹرخا دیا ہے۔ اور وہ حوریں بھی بہشت میں داخل ہونے پر مشروط ہیں۔ آخر ہم سے کیا خطا ہو گئی جو پہلے کی طرح ہم تیرے لطف و کرم سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔

سترہواں بند معنی: **نایاب:** غائب، مفقود۔ **موج سراب:** فریب نظر۔ **طعن اغیار:** غیروں کے طعنے۔ **خواری:** ذلت۔

مطلب: آخر مسلمانوں نے کون سا جرم کیا ہے کہ وہ دنیاوی دولت سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جب کہ تیرے اختیار میں تو اتنا کچھ ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب ہو سکتا ہے۔ تو اتنی قدرت رکھتا ہے کہ چاہے تو دشت و صحرا میں بھی سمندر کی مانند بلبلے رقصاں ہوں اور صحرا میں سفر کرنے والے مسافر کے سامنے تو چاہے تو سراب کی بجائے اتنا سیلاب آ جائے کہ مسافر کو ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ ہم تو اغیار کے طعنوں سے بھی ہم کنار ہیں اور رسوائی و ناداری سے بھی دوچار ہیں۔ اتنا تو بتا دے کہ تجھ پر مرمٹنے کا صلہ کیا خوار و برباد ہونے میں ہی ملتا ہے۔

اٹھارہواں بند معنی: **اغیار:** جمع غیر کی۔

مطلب: ایک زمانہ تھا جب دنیا پر مسلمانوں کا تسلط تھا جب کہ یوں لگتا ہے کہ اب وہ غیر مسلموں کو پسند کرنے لگی ہے۔ ہمارے لیے تو بس ایک خیالی دنیا ہی رہ گئی ہے ہم تو اس منظر سے ہٹ گئے۔ اب دوسروں نے دنیا پر اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ اس صورت میں یہ گلہ نہ کرنا کہ دنیا سے توحید مٹ چکی ہے۔ ہم تو صرف اس لئے جی رہے ہیں کہ تیرا نام باقی رہے پر اتنا بتا دے کہ ساقی کے بغیر جام کی حقیقت کیا ہے؟۔

انیسواں بند معنی: **وعدۂ فردا:** کل کا وعدہ۔ **رخ زیبا:** خوبصورت چہرہ۔

مطلب: اے مالک دوسرا! اب تو صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ تو نے جو محفل آراستہ کی تھی اس کا خاتمہ بھی ہو گیا اور تیرے چاہنے والے بھی رخصت ہو گئے۔ تیرے عشاق اس محفل میں شب بھی آہیں بھرتے تھے اور صبح کے وقت نالہ و فریاد کرتے تھے لیکن ان کے خاتمے پر اب یہ سب کچھ بھی ختم ہو کر رہ گیا۔ ان چاہنے والوں نے تجھے اپنا محبوب بنایا اور اس کا صلہ بھی حاصل کر لیا ان کا دور اس قدر مختصر رہا جیسے کوئی محفل میں آ کے بیٹھا ہی ہو تو اس کو وہاں سے نکال دیا جائے۔ جو چاہنے والے تیرے جلووں کی تمنا لے کر آئے تھے انہیں تو تو نے وعدۂ فردا پر ٹال دیا۔ اب ان کی واپسی مشکل ہے خواہ انہیں کسی طور پر بھی تلاش کیا جائے۔

بیسواں بند معنی: **قیس:** مجنوں کا اصلی نام۔ **نجد:** عرب کا ریگستانی علاقہ۔ **دشت و جبل:** جنگل و پہاڑ۔ **غضب:** غصہ۔

مطلب: اس بند میں اقبال کہتے ہیں کہ لیلی کا درد بھی وہی ہے اور مجنوں کا پہلو بھی وہی ہے۔ صحرائے نجد میں آج بھی ماضی کی طرح ہرن چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔ چاہنے والے کا دل بھی پہلے جیسا ہے اور

حسن کا جادو بھی وہی ہے۔ جب کہ پیغمبر آخر الزماںؐ کی امت بھی وہی ہے اور اے خدا تو بھی ہی ہے کہ جو تھا۔ اس کے باوجود مسلمانوں سے یہ ناراضگی کیسی ہے اور اپنے چاہنے والوں سے برا سلوک کیوں ہو رہا ہے۔

اکیسواں بند معنی: بت گری: بتوں کو پوجنا۔ **اویس قرنی:** ایک بزرگ جو حضرت محمد ﷺ سے بہت محبت کرتے تھے۔

مطلب: بس اتنا بتا دے کہ تیری عبادت چھوڑ دی یا حضورؐ کی محبت سے روگردانی کی ہے۔ کیا ہم نے اسلاف کی بت شکنی کی روایت ترک کر کے بت تراشی شروع کر دی۔ کیا ہم نے عشق اور عشق کی آشفتہ سری سے کنارہ کر لی۔ کیا ہم نے حضرت سلمان فارسیؓ اور اویس قرنیؒ کی روایات کو ترک کر دیا۔ اگر ایسا نہیں تو ہم سے برگشتگی کی کچھ تو وجہ ہونی چاہئے۔ جب کہ ہمارے سینوں میں آج بھی تکبیر کی آگ محفوظ ہے اور ہماری زندگی عملی سطح پر حضرت بلال حبشیؓ کی مانند ہے۔

بائیسواں بند معنی: جادہ پیمائی: راستہ طے کرنا۔ **قبلہ نما:** کعبہ کی سمت۔ **آئینِ وفا:** وفا کا دستور۔ **شناسائی:** دوستی۔ **ہرجائی:** بے وفا۔

مطلب: ہر چند کہ ہم تیری چاہت میں پہلا والا انداز نہیں رکھتے نا ہی ہم میں تیری خاطر تسلیم و رضا کی وہ خو ہے جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ یہ بھی درست کہ ہمارے دل قبلہ نما کی طرح مضطرب ہیں اور یہ کہ ہم پہلے جیسے وفادار بھی نہیں۔ نا ہی ہم میں وفا کے آئین کی پابندی کا جذبہ پہلے کی طرح موجود ہے۔ اس کے باوجود خود تیرا طرزِ عمل یہ ہے کہ کبھی ہم سے کبھی دوسروں پر عنایت و مہربانی کرتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ بات ہر چند کہ کی نہیں! پھر بھی کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ تو بھی تو ہرجائی ہو گیا ہے۔

تئیسواں بند معنی: سرفاراں: ایک پہاڑی کا نام۔ **آتش اندوز:** جلنے کا مادہ۔ **شرر آباد:** شعلوں سے آباد۔ **سوختہ ساماں:** اپنا سب کچھ فنا کر دینے والا' عاشق۔

مطلب: تو نے فاران کی چوٹی پر دینِ محمدیؐ کی تکمیل کی۔ تو اتنا قادر ہے کہ ایک اشارے پر ہزارہا لوگ تیرے گرویدہ ہو گئے۔ انسانی دلوں کو تو نے اپنے عشق سے مسخر کر لیا۔ اپنے جلووں سے ساری محفل میں حرارت پیدا کر دی۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ آج ہمارے سینوں میں عشقِ حقیقی کی چنگاری موجود نہیں جب کہ شاید تجھے یاد ہو کہ ہم نے تو تیری خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

چوبیسواں بند معنی: وادیِ نجد: عرب کا ریگستانی علاقہ۔ **شورِ سلاسل:** زنجیروں کا شور۔ **خوش آں روز:** وہ دن کتنا مبارک ہو گا۔ **بے حجابانہ:** بے تکلف' بے جھجک۔

مطلب: اب تو صورتِ احوال یہ ہے کہ نجد کے صحرا میں زنجیروں کا وہ شور نہیں رہا نا ہی مجنوں لیلیٰ کے نظارے کا دیوانہ نظر آتا ہے۔ یعنی مسلمانوں میں نہ عشقِ حقیقی کا جذبہ باقی رہا نا ہی جدوجہد کا حوصلہ۔ نا ہی وہ جراءت کردار رہی اور نہ وہ دل رہا جو عشقِ حقیقی کی حرارت سے مزین ہو۔ شاید ہمارا گھر اتنا برباد ہو چکا ہے کہ تو اب وہاں رونق افروز ہونا پسند نہیں کرتا۔

وہ دن کس قدر مبارک ہو گا کہ تو ہماری محفل میں پورے جلووں کے ساتھ رونق افروز ہو گا اور ہم تجھے حجاب سے باہر دیکھ سکیں گے۔

پچیسواں بند معنی: **بادہ کش:** شرابی۔ **لب جو:** ندی کے کنارے۔ **جام بکف:** ہاتھ میں جام لیے۔ **نعرہ زن ہو:** نعرہ مستانہ۔ **فرمان جگر سوزی:** جگر کو جلانے کا حکم۔

مطلب: جو لوگ اے خدا! تیری تعلیمات کی نفی کرتے ہیں اور تیرے دین کو تباہ و برباد کرنے پر تلے بیٹھے ہوئے ہیں ان کو تو نے عیش و مسرت کے تمام سامان فراہم کیے ہوئے ہیں۔ وہ تو رقص و نغمہ کی محفلیں سجائے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں وہ اس قدر بد مست اور مدہوش ہیں کہ باقی دنیا کن ہنگاموں سے دوچار ہے۔ وہ اس حقیقت سے قطعی بے نیاز ہو کر محو ناؤ نوش ہیں جب کہ تیرے چاہنے والے مسلمان تو خود کو تیری نعمتوں سے محروم سمجھنے لگے ہیں اور تیری عنایات کے اشاروں کے منتظر ہیں۔ سوائے خدا! اپنے چاہنے والوں میں پھر سے عمل کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دے تاکہ وہ پھر فعال ہو کر اس دنیا میں سرخرو ہو سکیں۔

چھبیسواں بند معنی: **قوم آوارہ:** بھٹکی ہوئی قوم۔ **عناں تاب:** گھوڑے کی لگام موڑنا۔

مطلب: ملت اسلامیہ ہر چند کہ آج منتشر اور بھٹکی ہوئی ہے تاہم اب اس نے ایک بار پھر اپنا رخ حجاز کی جانب کر لیا ہے تاکہ تیرے حبیبؐ سے رہنمائی حاصل کر اور پھر سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ بے شک وہ ایک ایسے پرندے کی مانند ہے جو اپنے بال و پر سے محروم ہو چکا ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس میں ابھی تک پرواز کرنے کا جذبہ ضرور موجود ہے۔ اس وقت عالم یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کا ایک ایک فرد بے چین و مضطرب ہے اور تیری رضا کا خواہاں ہے۔ اب صرف اس امر کی دیر ہے کہ تو ان کی جانب اپنی توجہ کا رخ پھیر دے۔ اس لیے کہ ہر شخص اب اس کے لیے بے چین ہے۔ تیری توجہ کے ساتھ ہی ہر معاملہ درست ہو جائے گا۔

ستائیسواں بند معنی: **امت مرحوم:** زوال پذیر مسلمان۔ **مور بے مایہ:** حقیر چیونٹی۔ **جنس نایاب:** کم یاب چیز۔ **دیر نشینوں:** مندر میں بیٹھنے والا۔

مطلب: اے رب کریم! تو نے اپنی جس امت کو ہمیشہ لطف و عنایات سے نوازا ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ اب وہ کتنی مشکلات میں مبتلا ہے۔ لہٰذا اس کی مشکلیں آسان کر دے اور وہ قوم جو اس وقت انتشار و بے بضاعتی سے ہم آہنگ ہے اسے ایک بار پھر وہی شان و شوکت عطا کر جس کی وہ ہمیشہ سے مستحق رہی ہے۔ خدایا! ملت مسلم کے ہر فرد کے دل سے محبت کا جذبہ جس طرح مفقود ہوا ہے انہیں پھر سے اس جذبے سے نواز دے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم جو ہندوستان میں بسنے والے محض نام کے مسلمان ہیں اور عملاً غیر مسلموں کی سی خصوصیات کے حامل بن کر رہ گئے ہیں تو ہمیں اپنے دین کی تعلیمات کو اپنانے کی تلقین عطا فرما۔ اب تو ہمارے دل سے آرزوؤں اور تمناؤں کا لہو بہہ نکلا ہے اور نشتروں بھرے سینے میں نالے بیتاب ہو رہے ہیں۔

اٹھائیسواں بند معنی: **غماز چمن:** چغلی کھانے والا۔ **عہد گل:** بہار کا موسم۔ **زمزمہ پرواز چمن:** چمن میں چہچہانے والے پرندے۔

مطلب: حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہماری منتشر حالت کے داخلی راز خود اپنوں کے ہاتھوں غیروں تک پہنچ گئے ہیں۔ اس سے زیادہ قیامت کیا ہو گی کہ ہم خود ہی اپنی جڑیں کھودنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ ملت مسلمہ میں تعمیر و ترقی کے ساتھ مسرتوں کا سامان بھی ختم ہو کر رہ گیا جو لوگ حقیقی طور پر رہنمائی کیا

کرتے تھے وہ بھی قوم سے بدظن ہو کر دل چھوڑ بیٹھے۔ اب تو صرف میں ہی تمہارہ گیا ہوں جو ہر نوع کی ملی بے حسی کے دوران بھی خاموشی اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میرے سینے میں تو نالہ و فریاد کا طوفان بھرا ہے۔

انتیسواں بند معنی: **قمریاں**: فاختہ۔ **صنوبر**: درخت کا نام۔ **روشیں**: راستے۔ **پیرہن برگ**: پتوں کا لباس۔

مطلب: یہ ضرور ہے کہ جو لوگ ملت کی بہتری کے خواہاں تھے وہ مایوسی کا شکار ہو کر پیچھے جا بیٹھے۔ ملت انتشار کا شکار ہو گئی ہماری قدیم روایات بھی ختم ہو گئیں۔ یوں **سمجھیے** کہ اب محض نام کے مسلمان ہی رہ گئے ہیں لیکن میں (اقبال) اس ساری تباہی سے مایوس نہیں۔ خدا کرے کوئی میری بات بھی سننے کا چارہ کرے۔

تیسواں بند معنی: **جوہر**: چمک، دمک (مراد صلاحیتیں)۔

مطلب: اب تو نہ مرنے میں مزا رہا نہ جینے میں کوئی لطف باقی رہا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہے کہ اپنے ہی جگر کا خون پیتا رہتا ہوں۔ اس صورت حال کے باوجود میرے سینے میں بے شمار ولولے تڑپ رہے ہیں اور یہی سینہ ہزارہا جلوؤں کا مسکن بنا ہوا ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ میری قوم کا کوئی فرد بھی چشم بینا نہیں رکھتا جو اس کیفیت کا اندازہ کر سکے۔ یہ ممکن بھی کیسے ہو کہ کسی میں بھی مصائب کا سامنا کرنے کی قوت نہیں۔

اکتیسواں بند معنی: **نوا**: آواز۔ **بانگ درا**: قافلے کی گھنٹی کی آواز۔ **بادۂ دیرینہ**: پرانی شراب۔ **لے**: سر یعنی مضامین و مطالب۔

مطلب: اقبال اس آخری بند میں بڑی دلسوزی کے عالم میں کہتے ہیں کہ کاش میری فریاد سے ہی ملت کے لوگ اپنی پستی کا احساس کریں۔ اور میرے یہ نغمے ان کی بیداری کا سبب بن جائیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے روایتی عہد وفا کا بھی پاس کریں اور اپنی دیرینہ تعلیمات کو بروئے کار لانے کے لیے آمادہ ہو سکیں۔

یہ درست ہے کہ میرا تعلق عرب سے نہیں بلکہ ایک طرح سے عجم کے ساتھ ہے اس کے باوجود میرا مرکز نگاہ حجاز ہی تو ہے اسی طرح زبان ہندوستان کی صحیح اس میں نغمگی اور کیف تو مدینے ہی کا ہے۔

چاند

107

اے چاند! حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے
طوفِ حریمِ خاکی تیری قدیم خو ہے
یہ داغ سا جو تیرے سینے میں ہے نمایاں
عاشق ہے تو کسی کا؟ یہ داغ آرزو ہے؟
میں مضطرب زمیں پر، بیتاب تو فلک پر
تجھکو بھی جستجو ہے، مجھکو بھی جستجو ہے
انساں ہے شمع جس کی، محفل وہی ہے تیری
میں جس طرف رواں ہوں، منزل وہی ہے تیری

تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خامشی میں
پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں
استادہ سرو میں ہے سبزہ میں سو رہا ہے
بلبل میں نغمہ زن ہے، خاموش ہے کلی میں
آ میں تجھے دکھاؤں رخسارِ روشن اس کا
نہروں کے آئینے میں، شبنم کی آرسی میں
صحرا و دشت و در میں، کہسار میں وہی ہے
انساں کے دل میں تیرے رخسار میں وہی ہے

*

یہاں اس امر کی نشاندہی ضروری ہے کہ زیر تشریح نظم ان پندرہ نظموں میں سے پہلی نظم ہے جو "بانگ درا" میں "شکوہ اور جواب شکوہ" کے درمیان درج کی گئی ہیں۔ موخر الذکر دونوں طویل نظموں کے مابین چونکہ ایک ربط اور تسلسل ہے نیز اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی چونکہ ان میں بڑی حد تک یکسانیت ہے لہٰذا یہاں دونوں کو یکجا کر دیا گیا ہے اور مذکورہ بالا پندرہ نظمیں اب جواب شکوہ کے بعد شامل کی جا رہی ہیں جب کہ "چاند" ان میں کی پہلی نظم ہے۔

"جواب شکوہ" کی تشریح کرتے ہوئے نظم کے آغاز میں پہلے بھی اس صورت حال کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ بہرحال "چاند" اقبال کی آٹھ اشعار پر مشتمل نظم ہے۔ جس میں علامہ نے اپنے مخصوص انداز میں چاند سے مکالمہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

① سے ④ **معنی**: فطرت کی آبرو: کائنات کی عزت۔ حریم خاکی: مراد ہے دنیا۔ قدیم خو: پرانی عادت۔

مطلب: اے چاند! اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے تیرا حسن اوج کمال پر ہے اور یہ حسن عملاً ایسا بلند مرتبہ ہے جس پر فطرت فخر و ناز کر سکتی ہے جب کہ زمین کے گرد چکر کاٹنا تیری پرانی عادت ہے۔ تیرے سینے پر جو داغ نظر آتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تیرے سینے کا یہ داغ کسی کی چاہت اور آرزو کا مظہر ہے اور یہ بھی کہ میری طرح تو بھی کسی کے عشق میں مبتلا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ میں زمین کا باسی ہونے کے ناطے یہاں مضطرب اور بے چین ہوں اور تو چونکہ آسمان پر رہتا ہے اس لیے تو وہاں پر بے چین اور مضطرب ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ تجھے بھی کسی کی تلاش ہے اور میں بھی کسی کو پا لینے کا آرزو مند ہوں۔ لگتا ہے کہ انسان جس محفل کے لیے شمع کی حیثیت رکھتا ہے وہی تیری محفل ہے اور میں جس جانب عازم سفر ہوں وہی تیری بھی منزل ہے۔

⑤ سے ⑧ **معنی**: استادہ سرو: سرو کی صورت میں کھڑا ہے۔

مطلب: اے چاند! یوں لگتا ہے کہ تو جس کو تاروں کے سکوت میں تلاش کر رہا ہے۔ وہ غالباً یہاں کرۂ ارض پر زندگی کے شور اور ہنگاموں میں چھپی ہوئی ہے اس امر کی توجیہہ کچھ یوں ہے کہ وہ چیز کہیں سرو کے درخت میں استادہ ہے اور کہیں یہ سرسبز و شاداب سبزے میں موجود ہے۔

پھر یوں بھی ہے کہ کہیں اس شے کا وجود بلبل میں نغمے کی شکل میں جلوہ گر ہے جب کہ کلی کے بطن میں سکوت بن کر چھپا ہوا ہے۔ بلاشبہ یہ حسن ہی ہے۔ سو اے چاند! میرے پاس آ کہ میں تجھے اس حسن کے جلووں سے روشناس کراؤں۔ دیکھ تو سہی! یہ جلوہ ندیوں کے شفاف پانی میں بھی موجود ہے اور شبنم کے قطروں میں بھی نمایاں ہے۔

چنانچہ یہی نہیں بلکہ اس حسن کا جلوہ تو صحراؤں اور کہساروں میں بھی پوری طرح سے موجود ہے۔ انسان کے دل میں بھی ہے اور تیرے چہرہ میں بھی یہی جلوہ نظر آتا ہے۔ اس نظم میں بنیادی تصور حسن ہے جسے اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں چاند کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

رات اور شاعر 108-1

رات

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں
خاموش صورت گل، مانند بو پریشاں
تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو
مچھلی ہے کوئی میرے دریائے نور کی تو
یا تو مری جبیں کا تارا گرا ہوا ہے
رفعت کو چھوڑ کر جو پستی میں جا بسا ہے
خاموش ہو گیا ہے تار رباب ہستی
ہے میرے آئنے میں تصویر خواب ہستی
دریا کی تہ میں چشم گرداب سو گئی ہے
ساحل سے لگ کے موج بیتاب سو گئی ہے
بستی زمیں کی کیسی ہنگامہ آفریں ہے
یوں سو گئی ہے جیسے آباد ہی نہیں ہے
شاعر کا دل ہے لیکن نا آشنا سکوں سے
آزاد رہ گیا تو کیونکر مرے فسوں سے

شاعر 108-2

میں ترے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں
چھپ کے انسانوں سے مانند سحر روتا ہوں
دن کی شورش میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں
عزلت شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں
مجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو؟
تپش شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو؟
برق ایمن مرے سینہ پہ پڑی روتی ہے!
دیکھنے والی ہے جو آنکھ، کہاں سوتی ہے؟
صفت شمع لحد مردہ ہے محفل میری
آہ! اے رات بڑی دور ہے منزل میری

عہد حاضر کی ہوا راس نہیں ہے اس کو اپنے نقصان کا احساس نہیں ہے اس کو

ضبط پیغام محبت سے جو گھبراتا ہوں
تیرے تابندہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں

*

رات

یہ نظم دو بنیادی کرداروں کے گرد گھومتی ہے جن میں کا ایک کردار تو "رات" ہے اور دوسرا "شاعر"! اس اعتبار سے یہ نظم ہر دو کرداروں کے مابین مکالمے پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں رات دوسرے کردار "شاعر" سے بعض استفسارات کرتی ہے۔ دوسرے حصے میں "شاعر" اس کا جواب دیتا ہے۔ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں یہ تخیلی گفتگو نظم کی ہے۔

① سے ③ **معنی**: مانند بو: خوشبو کی طرح۔ جبیں: پیشانی۔

مطلب: ان اشعار میں "رات" یوں "شاعر" سے مکالمہ کرتی ہے۔ کہ اے شاعر! کیا وجہ ہے کہ تو میری چاندنی میں کیوں مضطرب اور پریشان پھر رہا ہے۔ تیری کیفیت تو ایک پھول کے مانند ہے جو خود تو ساکت رہتا ہے لیکن اس کی خوشبو آوارہ و پریشان رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تو آسمان پر جو ستارے موتی کی طرح چمک رہے ہیں۔ ان کا جوہری یا پرکھنے والا ہے بالفاظ دگر میری روشنی کو نور کا دریا تصور کر لیا جائے تو تیری حیثیت ایک مچھلی کے مانند ہے۔ یا پھر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ میری پیشانی کے جھومر سے جو ایک ستارا گر گیا تھا وہ ستارہ تو ہی ہے جو بلندی کو چھوڑ کر اب پستی میں مقیم ہے۔

④ سے ⑦ اے شاعر! میرے وجود سے زندگی کا ایک ساز ساکت ہو کر رہ گیا ہے اور میں وہ آئینہ ہوں جس میں خوابیدہ دنیا کے تمام مناظر واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان مظاہر کا تو کیا ذکر بھنور تک دریا کی تہہ میں محو خواب ہو کر رہ گیا ہے اور جو بیتاب مضطرب موج تھی وہ بھی شاید ساحل سے ہم آغوش ہو کر سو گئی ہے۔ ہرچند کہ زمین پر جو بستیاں آباد ہیں وہ ہمیشہ ہنگاموں سے پر رہتی ہیں لیکن اس لمحے یوں لگتا ہے جیسے ہر جان سناٹا ہے اور وہاں کوئی جاندار شے موجود نہیں ہے۔ اس ساری صورتحال میں اے شاعر! میں دیکھ رہی ہوں کہ تو سکون آشنا نہیں بلکہ پریشان حال ہے۔ مجھے اس امر پر شدید حیرت ہے کہ تو میرے سحر سے کس طرح آزاد رہ گیا۔

شاعر

① سے ③ **معنی**: دن کی شورش: دن کا شور و غل۔ **عزلت شب**: رات کی تنہائی۔ **تپش شوق**: عشق کی جلن۔

مطلب: نظم کے اس حصے میں شاعر یوں گویا ہوتا ہے کہ اے رات! تیرے استفسارات کے جواب میں

یہی کہہ سکتا ہوں کہ تیری چاندنی میں میرے آنسو ایسے موتی کے مانند ہیں جو یہاں بو رہا ہوں اور صبح کی طرح انسانوں سے چھپ کر تنہائی میں سرگرم فغاں رہتا ہوں۔ میرے آنسو جو دن کے ہنگامے میں آنکھوں سے نکلتے ہوئے شرماتے ہیں وہ تیری تاریکی اور تنہائی میں آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں۔ میرے دل میں جو آہیں اور فریاد پوشیدہ ہے وہ آخر کس کو سناؤں۔ مزید برآں سینے میں جو عشق کی حرارت موجود ہے اس کا اظہار کس کس کے سامنے کروں جب کہ میری حالت پر یہاں توجہ دینے والا کوئی بھی نہیں ہے۔

④ سے ⑦ **معنی**: برق ایمن: طور کی بجلی۔

مطلب: صورت یہ ہے کہ میرے سینے میں تو وہ بجلی بھی بے عمل ہو کر رہ گئی ہے اور اشک افشانی کر رہی ہے کوہ طور پر جلوہ دکھانے والی بجلی جس کے مماثل ہے۔ نہ جانے وہ آنکھیں اب کہاں ہیں جو کسی بھی منظر کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ میری محفل تو اب اس شمع کے مانند ہے جو اجاڑ ویرانے میں کسی مزار پر روشن ہے۔ اے رات! تجھے اس حقیقت کا یقیناً علم نہیں ہے کہ میری منزل ابھی بہت دور ہے۔ اور جو مسافت ہے وہ کڑی ہے۔ اس کو طے کرنا بے حد و حساب مشکل کام ہے۔

تو کیا جانے کہ میری قوم کے لیے عہد حاضر کا ماحول قطعی سازگار نہیں ہے پھر اس کا کیا کیا جائے کہ اسے تو خود بھی اپنی اس زبوں حالی کا احساس تک نہیں ہے۔

اے رات! حقیقت یہ ہے کہ جب یہ صورت حال اور اس کا تصور میرے ضبط سے باہر ہو جاتا ہے تو مضطرب ہو کر اپنی داستان غم تیرے اجلے ستاروں کو سنانے آ جاتا ہوں۔

109 بزم انجم

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروس شب کے وہ موتی پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامہ جہاں سے
کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں "تارے"
محو فلک فروزی تھی انجمن فلک کی
عرش بریں سے آئی آواز اک ملک کی

اے شب کے پاسبانو! اے آسماں کے تارو
تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمھاری
چھیڑو سرود ایسا، جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کی تاب جبیں تمھاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں
شاید سنیں صدائیں اہل زمیں تمھاری
رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

"حسن ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکس گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

*

یہ نظم علامہ اقبال کی منظر نگاری اور امیجری کا انتہائی خوبصورت نمونہ ہے۔ انہوں نے ان اشعار میں جو تمثیل بنائی ہیں وہ بھی بڑی حد تک انفرادیت کی حامل ہیں۔ پوری نظم تین بند پر مشتمل ہے جن میں پندرہ اشعار ہیں جن میں شام کا منظر بیان کیا گیا ہے۔

پہلا بند معنی: سیہ قبا: سیاہ لباس۔ **طشت:** تھال۔ **فلک فروزی:** آسمان کو روشن کرنا۔ **ملک:** فرشتہ۔

مطلب: سورج نے غروب ہوتے ہوئے جب دن کو الوداع کہی تو روانگی سے قبل شام کے سرمئی رنگ کو نہ صرف یہ کہ اپنے عکس سے لالے کے پھول کی مانند زردی مائل کر دیا بلکہ آسمان پر شفق یوں نمودار ہوئی جیسے کہ ساری فضا سونے کے زیورات پہنے ہوئے ہے۔ اور دن میں جو چاندی کے زیورات تھے وہ اتار دیے ہیں۔ مراد یہ کہ دن کا سارا منظر تو سورج کی روشنی سے سفیدی مائل تھا جب کہ شام کے لمحات میں اس کا عکس سونے کی مانند زردی مائل ہو گیا۔

اس لمحے بڑی خامشی کے ساتھ فضا پر اندھیرا پھیل گیا اور اس اندھیرے آسمان پر ستارے اس طرح سے جگمگا رہے تھے جیسے موتی چمک رہے ہوں۔ انسان جن کو ستاروں کے نام سے تعبیر کرتا ہے وہ ہم سے کتنی دور یعنی آسمان پر رہتے ہیں۔ اس لمحے آسمان کی ساری محفل اپنی سجاوٹ اور تزئین میں مصروف تھی کہ آسمان سے ایک فرشتے کی آواز بلند ہوئی۔

دوسرا بند معنی:-

مطلب: فرشتے نے ستاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بے شک تم رات کے محافظ ہو اور تمہاری چمکنے والی قوم آسمان پر بود و باش رکھتی ہے۔ ایسا نغمہ اور ساز چھیڑو کہ جس کو سن کر سونے والے بیدار ہو اٹھیں۔ دراصل راہ چلنے والے قافلوں کے لیے تمہاری روشنی رہنمائی کا کام دیتی ہے۔ یہ قافلے والے تمہیں اپنے مقدر کا آئینہ تصور کرتے ہیں۔ اور اس امر کا امکان بھی ہے کہ زمین پر رہنے والے لوگ بھی تمہاری صدائیں سن سکیں۔

فرشتے کی یہ صدا سن کر ستاروں کی فضا سے خاموشی ختم ہو گئی اور آسمان کی وسعت میں یہ آواز اس سرے سے لے کر اس سرے تک پھیل گئی۔

تیسرا بند معنی: جذبِ باہمی: ایک دوسرے کو کھینچنا۔ یعنی نظام شمسی۔

مطلب: ستارے جواب میں یوں گویا ہوئے کہ ہماری خوبصورتی سے حسن ازل کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح جیسے شبنم کے شفاف قطروں میں پھولوں کا عکس نمایاں ہو جاتا ہے۔ سن لو! کہ قوموں کی زندگیوں میں وہ وقت بہت کٹھن اور دشوار ہوتا ہے جب انہیں قدیم روایات کو تج کر نئی روایات اور نئے اصول قبول

کرنا پڑیں- زندگی دراصل اس قدر تیز رفتار واقع ہوئی ہے کہ اس کے چل چلاؤ میں بہت سی قومیں چلی گئی ہیں- اگرچہ ہماری نگاہوں سے ہزارہا ستارے ہماری نظر سے اوجھل ہیں اس کے باوجود ان کا تعلق تو ہماری برادری ہی سے ہے- بے شک ہماری عمر مختصر تھی لیکن جو نتائج ہم اخذ کر سکے وہ اہل زمین نہیں سمجھے کہ باہمی ربط وضبط اور اتفاق سے سارے نظام قائم ہیں- یہی نکتہ تاروں کی زندگی میں پوشیدہ ہے-

110 سیر فلک

تھا تخیل جو ہم سفر میرا آسماں پر ہوا گزر میرا
اڑتا جاتا تھا' اور نہ تھا کوئی جاننے والا چرخ پر میرا
تارے حیرت سے دیکھتے تھے مجھے راز سربستہ تھا سفر میرا
حلقہ صبح و شام سے نکلا
اس پرانے نظام سے نکلا

کیا سناؤں تمھیں ارم کیا ہے خاتم آرزوئے دیدہ و گوش
شاخ طوبے پہ نغمہ ریز طیور بے حجابانہ حور جلوہ فروش
ساقیان جمیل جام بدست پینے والوں میں شور نوشا نوش
دور جنت سے آنکھ نے دیکھا ایک تاریک خانہ سرد و خموش
طالع قیس و گیسوئے لیلیٰ اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش
خنک ایسا کہ جس سے شرما کر کرۂ زمہریر ہو روپوش
میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی حیرت انگیز تھا جواب سروش
یہ مقام خنک جہنم ہے نار سے نور سے تہی آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اس کے جن سے لرزاں ہیں مرد عبرت کوش
اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

✽

معنی: تخیل: خیال- **راز سربستہ**: چھپا ہوا بھید- **ارم**: بہشت- **خاتم**: ختم کرنے والا- **نوشا نوش**: پینا پلانا- **کرۂ زمہریر**: زمین کے اردگرد اس حلقہ سے آگے زیادہ سردی ہوتی ہے- **سروش**: فرشتہ- **تہی آغوش**: خالی جھولی- **مستعار**: مانگے ہوئے- **عبرت کوش**: نصیحت حاصل کرنے والا-

مطلب: یہ نظم دو بند پر مشتمل ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اقبال نے اس نظم میں قرآن پاک کی سورۃ توبہ کی چونتیسویں آیت کی منظوم تفسیر پیش کی ہے- اس آیت میں ارشاد ہوا ہے جن لوگوں نے سونا چاندی جمع کیا اور اس کو اللہ کی راہ میں صرف کرنے سے گریز کیا- قیامت کے روز ان کی پیشانی' پشت اور پہلو کو اسی گرم کیے ہوئے سونے چاندی سے داغا جائے گا- علامہ اقبال نے اسی حوالے سے اور دوسرے زاویے سے یہی بات کہی ہے- ان کا کہنا ہے کہ دوزخ بجائے خود گرم نہیں ہے بلکہ جب بداعمال

اور گناہگار لوگ وہاں بھیجے جاتے ہیں تو ان کی بداعمالیاں ہی شعلے بن کر انہیں جلاتی ہیں۔ چنانچہ نظم میں اقبال کہتے ہیں۔

میں اپنے تخیل کے ساتھ آسمان کی سیر کر رہا تھا اور اس کی وسعتوں میں اڑتا پھر رہا تھا۔ عجب بات یہ ہے کہ وہاں مجھے جاننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ اس لمحے وہاں چمکتے ہوئے ستارے مجھے حیرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اس لیے کہ میرے سفر کا حال تو ایک راز کی مانند تھا جس کی حقیقت سے کسی کو آگاہی حاصل نہ تھی۔ میں اس سفر میں زمان و مکان اور صبح و شام کے دائرے سے نکل گیا۔ یہی نہیں بلکہ کائنات کے اس پرانے نظام کو بھی بہت پیچھے چھوڑ گیا۔

اے لوگو! تمہیں کیا بتاؤں کو اس سفر کے دوران میں نے جنت کا نظارہ کیا۔ جنت کیسی ہے؟ اس کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس کو کانوں کی قوت سماعت اور آنکھوں کی بصارت کی تشنگی دور ہو جاتی ہیں اور جملہ عناصر کی آرزوؤں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جنت میں تمام انسانی خواہشات کی تکمیل کا سامان موجود ہے۔

جنت میں جو مناظر نگاہوں کے سامنے سے گزرے ان کے مطابق میں نے دیکھا کہ شاخ طوبیٰ پر بیٹھے ہوئے پرندے نغمہ سرا ہیں اور حمد باری تعالیٰ میں مصروف ہیں۔ حوریں کسی حجاب اور پردے کے بغیر اپنے جلوے دکھا رہی ہیں۔ انتہائی خوبصورت ساقی حاضرین کو شراب پلانے میں مصروف ہیں اور پینے والوں میں ہر چہار جانب ہاؤ ہو کا ہنگامہ برپا ہو رہا ہے۔

اسی لمحے میں نے جنت سے دور کچھ فاصلے پر ایک جگہ دیکھی جس میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ جگہ بے حد پر سکوت اور سرد واقع ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس مقام کی تاریکی قیس کے مقدر اور لیلیٰ کے گیسوؤں کی طرح تھی۔ یہ مقام اس قدر سرد تھا کہ جس کے مقابل زمین کے گرد انتہائی سرد حلقہ بھی نہ تھا۔

میں نے ایک فرشتے سے اس سرد ترین مقام کے بارے میں استفسار کیا تو اس کا جواب بے حد حیران کن تھا۔ فرشتے نے کہا کہ یہی سرد مقام جہنم ہے جو ہر نوع کی جو ہر طرح کی حرارت اور روشنی سے خالی ہے۔ اس کے وہ شعلے جن سے عبرت نہ حاصل کرنے والے لوگ خوفزدہ ہیں عملاً مانگے کے ہوتے ہیں جن میں عملاً کوئی حدت نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو گنہگار یہاں سزا کے طور پر لائے جاتے ہی وہ اپنے حصے کی آگ اور شعلے بھی ہمراہ لاتے ہیں۔

نصیحت

111

میں نے اقبال سے ازراہ نصیحت یہ کہا
عامل روزہ ہے تو، اور نہ پابند نماز

تو بھی ہے شیوۂ ارباب ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکر حجاز

جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
تیرا انداز تملق بھی سراپا اعجاز

ختم تقریر تری مدحت سرکار پہ ہے
فکر روشن ہے ترا موجد آئین نیاز

در حکام بھی ہے تجھکو مقام محمود
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلف ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمت دیں میں ہوس جاہ کا راز
نظر آ جاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن
اثر وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز
دست پرورد ترے ملک کے اخبار بھی ہیں
چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
تیری مینائے سخن میں ہے شراب شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں بھی
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریک تگ و تاز
غم صیاد نہیں، اور پر و بال بھی ہیں
پھر سبب کیا ہے نہیں تجھکو دماغ پرواز
"عاقبت منزل ما وادی خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز"

*

یہ نظم عملاً سیاسی اور مذہبی رہنماؤں پر طنز کی حیثیت رکھتی ہے کہ علامہ اقبال نے آج کی مانند اپنے عہد میں بھی ان لوگوں کا کردار منافقت اور مصلحت کیشی پر مبنی پایا لیکن براہ راست ان پر طنز کرنے کی بجائے یہاں اقبال نے اپنی ذات کو ہی ہدف بنایا ہے۔ نظم کا آخری شعر حافظ شیرازی کا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اسی شعر کی تضمین ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

معنی : **ارباب ریا** : ریاکار لوگ۔ **تملق**: خوشامد۔ **موجد** : ایجاد کرنے والا۔ **مقام محمود**: پسندیدہ مقام۔ **طرہ**: ان میں باتوں سے بڑھ کر۔ **تشہیر کا ساز**: شہرت۔

مطلب: میں نے اقبال کو نصیحت کرتے ہوئے ایک روز یہ کہا کہ نہ تو تو روزہ رکھتا ہے۔ نا ہی نماز کا پابند ہے۔ تو بھی لگتا ہے کہ منافقت اور ریاکاری میں بعض دوسرے لوگوں کی طرح انتہائی کامل اور پختہ کار ہے۔ ہرچند کہ لبوں پر تو تیرے مدینے کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل میں یہ خواہش پوشیدہ رہتی ہے۔ کہ لندن یاترا کی جائے۔

اے اقبال! تیرے جھوٹ میں بھی مصلحت کی آمیزش ہوتی ہے یعنی ذاتی فائدے کے لیے تو جھوٹ بولنے سے نہیں چوکتا اور تیری خوشامد کا انداز بھی ایسا ہی جیسے معجزے دکھا رہا ہو۔ اور ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ تیری تقریر کا خاتمہ بھی سرکار یعنی حکمران طبقے کی خوشامد اور تعریف و توصیف پر ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تیرے تازہ اور روشن خیالات عاجزی اور انکساری کے نئے نئے طریقوں کی ایجاد میں لگے رہتے ہیں۔

حکام کا دروازہ اے اقبال! تیرے لیے گویا مقام محمود ہے۔ اور تیرے سیاسی داؤ پیچ ایاز کی زلف کے مانند ہی ہوتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگوں کی طرح تو بھی دنیاوی جاہ و جلال کے حصول کی خواہش کو دین کی خدمت کرنے کے پردے میں چھپا سکتا ہے۔ کم از کم عید کی نماز کے موقعہ پر تو مسجد میں بھی اس طرح نظر آجاتا ہے کہ واعظ کی تقریر سے تیرا دل بھی پگھلتا محسوس ہوتا ہے۔ یعنی یوں لگتا ہے جیسے واعظ کی تقریر نے تیرے دل پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہے۔ اور تو اس سے بے حد مرعوب ہوا ہے۔

اور تو اور! یہ جو ملک کے اخبارات ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی تیرے بے حد ممنون احسان ہیں کہ جن پر تیری تشہیر فرض ہے بلکہ یہ اخبار تو جائز و ناجائز طور پر تیری قصیدہ گوئی میں ہر لمحے مصروف رہتے

ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تو شاعر بھی ہے اور تخلیق کار بھی! تو اپنی شاعری کے حوالے سے حافظ شیرازی کے مماثل ہے۔

اے اقبال! ایک لیڈر میں آج جتنے بھی اوصاف ہونے چاہئیں وہ تجھ میں بھی موجود ہیں لہذا تیرے لیے لازم ہے کہ تو بھی قومی سیاست کی اس دوڑ میں شریک ہو جا۔ مراد یہ کہ ان خصوصیات کے باوصف تو بھی قومی لیڈر بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔ بقول حافظ شیرازی۔

آخر کار سب کو مرنا ہے اور مردہ لوگوں کی وادی میں پہنچنا ہے لہذا اس گنبد افلاک کے نیچے کچھ تو ہنگامہ کرنا چاہیے۔

رام

112

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند

یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوش محبت میں فرد تھا

*

رام چندر جی اہل ہنود کی تاریخ میں ایک دیو مالائی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اہل ہنود کی مقدس کتاب "رامائن" میں ان کے حالات زندگی درج ہیں۔ وہ صوبجات متحدہ کے ایک راجہ دسرتھ کے بیٹے تھے جن کو سوتیلی ماں کے کہنے پر چودہ سال کا بن باس ملا۔ بن باس سے واپسی پر وطن پہنچ کر انہوں نے اپنی گدی سنبھالی۔ دسہرے کا تہوار اسی حوالے سے منایا جاتا ہے۔ اقبال نے زیر تشریح نظم اسی سلسلے میں لکھی۔

معنی: **فکر فلک رس:** آسمان پر پہنچنے والا خیال۔ **ملک سرشت:** فرشتہ خصلت۔ **روشن تراز:** زیادہ روشن۔ **فرد:** بے مثال۔

مطلب: ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بعض حق پرست لوگوں نے جنم لیا۔ اسی لیے مغرب کے فلسفی اس خطہ ارض کی عظمت کے قائل ہیں۔ یہ بھی اہل ہند کے بلند تصورات کا اثر ہے کہ یہاں کا مقام آسمان کی طرح بلند ہے۔ اس مصرعے میں کوہ ہمالیہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ تو صوفیوں اور رشیوں کا ملک ہے۔ جہاں ہزارہا فرشتہ خصلت لوگوں نے جنم لیا اور یہی وہ لوگ ہیں کہ آج بھی جن کے دم سے ہندوستان کا نام روشن ہے۔

دیکھا جائے تو رام چندر جی کے نام اور کردار پر اہل ہند بجا طور پر فخر و ناز کرتے ہیں۔ اور جو صاحبان بصیرت ہیں اگر ان کو ہندوستان کا امام تصور کرتے ہیں تو اس میں کوئی بات باعث حیرت نہیں۔ کہ وہ تو

ایسے مس چراغ ہدایت تھے جنہوں نے اسی ملک سے تاریکی کو مٹا دیا اور یہاں علم و دانش کی روشنی پھیلائی۔ یعنی یہاں کی شام رام چندر جی کی ہدایت کے طفیل صبح کی روشنی سے بھی زیادہ تابندہ اور درخشاں ہے۔

دیکھا جائے تو یہ فرزند ہند تلوار کا دھنی بھی تھا اور بہادر بھی تھا۔ یہی نہیں بن باس کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو وہ پاکیزگی اور محبت میں انفرادی حیثیت کا حامل تھا۔

113 موٹر

موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش — کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی
مانند برق تیز، مثال ہوا خموش — ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرام ناز
ہے جادۂ حیات میں ہر تیزپا خموش — میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
نکہت کا کارواں ہے مثال صبا خموش — ہے پا شکستہ شیوۂ فریاد سے جرس
لیکن مزاج جام خرام آشنا خموش — مینا مدام شورش قلقل سے پابگل
شاعر کے فکر کو پر پرواز خامشی
سرمایہ دار گرمی آواز خامشی

*

معنی: ہنگامہ: شور۔ **جادۂ حیات**: زندگی کا راستہ۔ **تیزپا**: تیز چلنے والا۔ **مینا**: صراحی۔ **قلقل**: بھری ہوئی صراحی کی آواز۔ **سرمایہ دار گرمی آواز**: آواز کی گرمی کا سرمایہ۔

مطلب: اقبال نے بالعموم اپنی تخلیقات میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج اخذ کیے ہیں۔ زیر تشریح نظم بھی اسی نوع کی تخلیقات میں سے ایک ہے۔ نواب ذوالفقار علی خاں جو اقبال کے احباب میں سے تھے انہوں نے ایک ایسی کار خریدی جو شور کم کرتی تھی۔ یہ نظم اسی حوالے سے لکھی گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

کل دوران گفتگو جگندر نے کتنے کام کی بات کہی کہ دوسری کاروں کی نسبت ذوالفقار علی خاں کی کار بالعموم خاموش رہتی ہے۔ اس کی چال ایسی ہے جس کا ہنگاموں اور شور شرابے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کار، بجلی کی طرح تیز اور ہوا کے مانند خاموش رہتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جگندر کی زبان سے یہ بات سن کر میں نے کہا کہ یہ معاملہ کار پر ہی موقوف نہیں بلکہ زندگی میں ہر وہ شے خاموش رہتی ہے جو تیز رفتار ہو۔ قافلے کی گھنٹی فریاد کے لہجے میں بے شک بہت شور مچاتی ہے جب کہ خوشبو کا قافلہ تیز رفتار ہوا کی طرح ساکن رہتا ہے۔ صراحی شراب انڈیلے جانے کی پابند ہے اس لیے شور پیدا کرتی ہے جب کہ پیمانہ تیزی سے گردش کرتا ہے اس لیے وہ بھی خاموش رہتا ہے۔

حد تو یہ ہے کہ شاعر کے تخیل کی اڑان کو بھی خاموشی پر پرواز عطا کرتی ہے اور خاموشی کے سبب ہی شاعر کے کلام میں جوش اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

114 انسان

منظر چمنستاں کے زیبا ہوں کہ نازیبا — محروم عمل نرگس مجبور تماشا ہے
رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو — فطرت ہی صنوبر کی محروم تمنا ہے
تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں — انسان کی ہر قوت' سرگرم تقاضا ہے
اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم — یہ ذرہ نہیں' شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستی دانا ہے' بینا ہے' توانا ہے

*

معنی: چمنستاں: باغ۔ زیبا: اچھا۔ نازیبا: برا۔ ہیئت: شکل' وضع قطع۔

مطلب: اس نظم میں دیکھا جائے تو علامہ اقبال نے انسان کا مظاہر فطرت سے تقابل کیا کہ ان کے کردار میں کیا فرق ہے۔ حسب معمول انہوں نے اس تقابلی جائزے سے بھی ایک نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مظاہر فطرت کتنے بھی قوی اور خوبصورت ہوں حقیقت یہ ہے کہ انسان یہ اشرف المخلوقات ہے۔ وہ جراءت و حوصلہ کرے تو آن واحد میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

باغوں کے مناظر خوبصوت ہوں کہ بدصورت! یہاں بہار آئی ہو کہ خزاں نے اپنا تسلط جمایا ہوا ہو۔ نرگس کا پھول اپنی بے عملی کے سبب ان مناظر کو دیکھنے اور برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ وہ حسب خواہش ان مناظر کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اسی طرح صنوبر جیسے بلند و بالا اور خوبصورت درخت چونکہ تمناؤں اور خواہشات سے محروم ہے لہذا یہ اپنے مقام پر ساکت و صامت کھڑا رہتا ہے۔ وہ حرکت کرنے کے لطف سے محروم ہے۔

دیکھا جائے تو دنیا کی ہر شے اطاعت کرنے اور دوسروں کے تابع رہنے پر مجبور ہے۔ ایک انسان ہی ہے جو ہمہ وقت جدوجہد اور محنت و کاوش میں مصروف عمل رہتا ہے۔ اگر اسے ذرہ قرار دیا جائے تو ایسا ذرہ ہے جو ہر دم وسعت کی ہوس رکھتا ہے۔ دراصل یہ ذرہ نہیں بلکہ ایک صحرا ہے جو سمٹ کر رہ گیا ہو۔ اور اب وسعت اختیار کرنا چاہتا ہو۔

دراصل انسان اتنا قوی' دانش مند اور بصیرت رکھنے والا ہے کہ اگر چاہے تو اس باغ یعنی دنیا کی ہیئت کو تبدیل کر سکتا ہے۔

115 خطاب بہ جوانان اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے؟ — وہ کیا گردوں تھا' تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں — کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سر دارا
تمدن آفریں' خلاق آئین جہاں داری — وہ صحرائے عرب' یعنی شتربانوں کا گہوارا

سماں **الفقر فخری** کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار' وہ کردار' تو **ثابت**' وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی' کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

"غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا"

*

① سے ③ **معنی**: تدبر: غور و فکر۔ **تمدن آفریں**: تہذیب پیدا کرنے والا۔ **خلاق آئین جہاں داری**: حکومت کے اصول وضع اور ایجاد کرنے والا۔

مطلب: یہ نظم اقبال نے بطور خاص مسلمان نوجوانوں کے لیے لکھی اور غالباً یہ کسی ایسے اجتماع میں ہی پڑھی گئی جس کا تعلق نوجوانوں سے تھا۔ چنانچہ وہ نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ اے نوجوان مسلم! کبھی تو نے اتنا بھی سوچا ہے کہ تیرا ماضی کس قدر شاندار تھا وہ ماضی جو ایک آسمان کے مانند تھا جس کا تو ایک ٹوٹا ہوا ستارا ہے۔ تجھے اس قوم نے اپنی آغوش محبت میں پالا ہے۔ جس نے ایران کے مشہور ساسانی تاجدار دارا کے تاج و تخت کو روند ڈالا تھا۔ کیا تجھے علم ہے کہ تو کتنی عظمتوں والی قوم سے تعلق رکھتا ہے؟ اگر تجھے اس کا علم نہیں تو میں بتائے دیتا ہوں یعنی یہ وہ قوم تھی جو صحرائے عرب میں اونٹنی چرانے والوں کے گہواروں میں پلی۔ اس کے باوجود اس قوم نے دنیا بھر کے لوگوں کو تہذیب و تمدن اور رہنے سہنے کا ڈھنگ سکھایا۔ اس کے علاوہ حکمرانی کے قاعدے بھی بتائے۔

④ سے ⑥ **معنی**: **الفقر فخری**: فقر میرا فخر ہے۔ **چہ حاجت روئے زیبا را**: خوبصورت چہرہ کو کیا ضرورت ہے۔ **منعم**: امیر' دولت مند۔

مطلب: اتنی کروفر اور شان و شوکت کے باوجود اس قوم کے لوگوں نے دولت مندی اور حکمرانی کے دور میں بھی درویشی اور فقیری کو اپنا طرۂ امتیاز بنائے رکھا۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک دلکش اور خوبصورت چہرے کی زیبائش کے لیے ظاہری ساز و سامان ضروری نہ تھا۔ وہ اللہ کے خاص بندے درویش اور فقیری کے عالم میں بھی اس قدر غیرت مند تھے کہ امراء کو اس امر کی جراءت و ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ ان فقراء کو کچھ خیرات کے نام پر کسی قسم کا عطیہ دے سکیں۔ غرض تجھے میں کیا بتاؤں کہ وہ صحرا میں رہنے والے لوگ فی الواقع دنیا کے فاتح اور حکمرانوں کے علاوہ ساری دنیا کے محافظ اور اس کو سجانے والے تھے۔

⑦ سے ⑧ **معنی**: **ثابت**: ایک جگہ ٹھہرا ہوا۔

مطلب: اگر میں چاہوں تو الفاظ میں ان کا نقشہ کھینچ کر رکھ دوں۔ اور اپنی شاعری کے ذریعے ان کا سراپا

بیان کروں۔ تاہم مشکل تو یہ ہے کہ تو اس عہد کا تصور کرنے سے قاصر ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر تیرا اور تیرے اسلاف کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ باسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے اس لیے کہ تو محض باتیں بناتا اور بے عمل ہے جب کہ وہ صاحب کردار، فعال اور متحرک تھے۔ تو جامد و ساکت اور دوسروں کی نقالی کرنے والوں میں سے ہے جب کہ تیرے اجداد عملاً اجتہاد فکر کے عادی لوگ تھے۔ اور اپنی بات پر ہمیشہ ڈٹے رہنے والے تھے۔

⑨ (12) **معنی**: روز سیاہ پیر کنعاں: حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہ بختی۔ نور دیدہ اش: اس کی آنکھوں کا نور یعنی حضرت یوسف علیہ السلام۔

مطلب: دیکھا جائے تو ہم نے اس ورثے کو گنوا دیا جو اسلاف نے ہمارے لیے چھوڑا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ہم انتہائی عروج پانے کے باوجود اب پستی کے آخری مرحلے میں ہیں۔ حکومت اور سلطنت کا تو کوئی غم نہیں کہ وہ ایک عارضی چیز اور آنے جانے والی شے ہے آج ایک کے پاس ہے کل دوسرے کے پاس۔ ہمیشہ سے یہی روایت چلی آ رہی ہے۔ مگر اپنے اجداد کی چھوڑی ہوئی وہ نادر اور بیش بہا کتابیں جو اب اہل یورپ کے قبضے میں ہیں اور ان سے وہ استفادہ کر رہے ہیں وہاں ان کو دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ آخری شعر غنی کاشمیری کا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ پیارے تو حضرت یعقوبؑ کو تھے مگر زلیخا کو مل گئے اور حضرت یعقوبؑ ان سے محروم ہو گئے۔

116

غرۂ شوال
یا
ہلال عید

غرۂ شوال! اے نور نگاہ روزہ دار — آ کہ تھے تیرے لیے مسلم سراپا انتظار
تیری پیشانی پہ تحریر پیام عید ہے — شام تیری کیا ہے، صبح عیش کی تمہید ہے
سرگزشت ملت بیضا کا تو آئینہ ہے — اے مہ نو! ہم کو تجھ سے الفت دیرینہ ہے
جس علم کے سائے میں تیغ آزما ہوتے تھے ہم — دشمنوں کے خون سے رنگین قبا ہوتے تھے ہم
تیری قسمت میں ہم آغوشی اسی رایت کی ہے — حسن روز افزوں سے تیرے آبرو ملت کی ہے
آشنا پرور ہے قوم اپنی، وفا آئیں ترا — ہے محبت خیز یہ پیراہن سیمیں ترا

اوج گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

قافلے دیکھ، اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ — رہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر — اے تہی ساغر! ہماری آج ناداری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ' ان کی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکستِ رشتہ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو
امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
ہاں تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو
اور جو بے آبرو تھے' ان کی خودداری بھی دیکھ
جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا
اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ
سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ
چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ' اوروں کی عیاری بھی دیکھ
صورتِ آئینہ سب کچھ' دیکھ اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

220

*

اٹھارہ اشعار پر مشتمل یہ نظم عنوان سے ہی اپنے موضوع کی نشاندہی کرتی ہے تاہم اس موضوع کو بھی علامہ اقبال نے جس انداز سے اپنے افکار میں ڈھال کر تخلیقی عمل سے گزارا ہے وہ ان کی فکری اپج اور فنی چابکدستی کا ثبوت ہے۔ عید کے چاند کے حوالے سے اردو شاعری میں نظموں کا ایک بیش قیمت ذخیرہ نظر آئے گا لیکن زیر تشریح نظم اس موضوع پر بلاشبہ ایک ایسی کوشش ہے جس سے اقبال ہی عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔

اس نظم میں بھی اقبال کی روایتی امیجری اور تمثیلیں پورے اہتمام کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ ملت اسلامیہ کے عروج و زوال کے جن مناظر نے تمام عمر علامہ کو مضطرب اور بے چین رکھا ان کا اظہار اس نظم میں بھی ہے۔ اس امر کی پروا نہ کرتے ہوئے کہ ہلال عید بالخصوص ماہ رمضان کی آزمائشوں کے بعد خوشی اور مسرت کا پیغام لاتا ہے اقبال نے ان اشعار میں بھی ان حقائق کو سامنے رکھا ہے جو مسلمانوں کے زوال کا سبب بنے اور آج بھی ملت اسلامیہ ان سے دوچار ہے۔ عملاً یہ نظم مسرت افزاء نہیں بلکہ ایک مرثیہ ہے ملاحظہ ہو۔

① سے ② **معنی:** غرہ شوال: شوال کے مہینے کا چاند۔ تمہید: آغاز۔

مطلب: اس نظم میں علامہ اقبال "ہلال عید" کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اے ہلال عید!" یہ امر واقعہ ہے کہ تو روزہ رکھنے والوں کی آنکھ کا تارا ہے۔ اے چاند! جلد نمودار ہو جا کہ روزہ رکھنے والے مسلمان تیرے لیے سراپا انتظار بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ تیرے طلوع ہوتے ہی اس امر کا یقین ہو جائے گا کہ اب عید آ گئی ہے اور تمام مسلمان اس روز سعید پر گلے ملیں گے اور مسرت و خوشی کا اظہار کریں گے اس لیے کہ تو بے شک شام کے وقت طلوع ہوتا ہے پھر بھی آنحضرت کے پیروکاروں کے لیے تیرا وجود مسرت کی صبح کا آغاز ہے۔

③ سے ④ **معنی:** ملت بیضا: اسلامی ملت۔ مہ نو: نیا چاند۔

مطلب: اے ہلال عید دیکھا جائے تو تیری حیثیت ملت مسلمہ کی داستان کے لیے آئینے کی حیثیت رکھتی

ہے۔ جو ہماری عروج و زوال کی آئینہ دار ہے۔ اے نئے چاند! تیرے ساتھ ہماری محبت انتہائی قدیم ہے۔ تجھے یہ بات تو یاد ہو گی کہ ہم مسلمان غنیم کے خلاف جس پرچم کے تلے تیغ آزما ہوتے تھے اس پر ستارے کے علاوہ تو بھی موجود ہوتا تھا۔ ان معرکوں میں ہمارے قبا کے دامن' بالعموم دشمنوں کے خون سے آلودہ ہوتا تھا۔

⑤ سے ⑦ **معنی**: رایت: جھنڈا۔

مطلب: اے چاند! تو اسی پرچم سے ہم آغوش ہے جس نے فتح کے ہزاروں جھنڈے گاڑے تھے تجھ میں جو خوبصورتی ہے اس سے ملت کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوا ہے۔ جس طرح تو وفا شعار ہے اور اس دستور کو بڑی تندہی سے نبھاتا ہے اسی طرح ہماری قوم بھی اپنے شناساؤں سے ہمیشہ محبت و شفقت سے پیش آتی ہے۔ ویسے بھی تیرے سراپا سے ہی محبت ٹپکتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تو نے جو لبادہ زیب تن کیا ہوا ہے وہ چاندی کا بنا ہوا ہے۔ اے چاند! تو آسمان کی بلندی پر جگمگا رہا ہے وہاں سے اس دنیا کا نظارہ بھی کر لے۔ اس بلندی سے ہم مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی بھی دیکھ لے۔

⑧ سے ⑩ **معنی**: رہرو درماندہ: بچھڑا ہوا مسافر۔

مطلب: اے چاند! ان اقوام کے تیز رفتار قافلوں کا جائزہ بھی لے جو بڑے اہتمام و اعتماد کے ساتھ کامیابی و کامرانی کے ساتھ منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ ان کے مقابل ہمارے قومی کارواں کی ست رفتاری بھی دیکھ لے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم منزل کے تصور ہی سے بیزار ہیں۔

کبھی وہ دور بھی تھا جب تیرے طلوع ہونے پر ہم عالم مسرت و شادمانی میں موتی لٹایا کرتے تھے جب کہ آج ہم اپنی ناداری اور تہی دستی کے ہاتھوں اس عمل سے معذور ہیں ہرچند کہ تیری ہیئت بھی ایک خالی پیالے کے مانند ہے۔ یہاں خالی پیالے کی تشبیہ نے مصرعے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ادھر ہم مسلمان تو مختلف فرقوں میں اس طرح سے بٹے ہوئے ہیں کہ اس نفاق و افتراق کے باعث ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے ہیں۔ اے چاند! تو تو ان بکھیڑوں سے بے شک آزاد ہے جب کہ ہم باہمی اتحاد و اتفاق سے محروم ہو کر محض باہمی تصادم کی لعنت میں اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔

(11 سے 12) **معنی**: رشتہ تسبیح: تسبیح کا دھاگہ۔ **زناری**: وہ دھاگہ جو ہندو لوگ اپنی گردن اور کمر میں مذہبی نشان کے طور پر باندھتے ہیں۔

مطلب: اے آسمان کی رفعت سے نظارہ کرنے والے! ہمارے ذہنی افلاس اور باہمی نفاق کا یہ عالم ہے کہ مساجد میں واعظان کرام نے تسبیح کے اس رشتے کو منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔ جس سے ملت مسلمہ کا تعلق استوار تھا۔ اس کے مقابلے پر بتکدوں میں پوجا پاٹ کرنے والے برہمن ہیں جو اپنی قوم کو اتحاد و اتفاق اور باہمی محبت و شفقت کا سبق دیتے نہیں تھکتے۔

اس شعر میں اقبال نے ایک جانب تو ملا اور واعظ کے کردار کا ذکر کیا ہے اور دوسری طرف برہمنوں کی قوم پرستی کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اقبال نے بے شمار مقامات کی طرح یہاں بھی ملت مسلمہ کے مختلف فرقوں کے مابین نفاق کی ذمے داری اول و آخر ملا اور واعظ پر ڈالی ہے جو چھوٹے چھوٹے سے اختلافات کو ہوا دے کر اپنی ہی قوم کو آپس میں لڑاتے ہیں اور نفرتوں کی خلیج میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

اے چاند! یہ عبرت انگیز منظر بھی دیکھ لے کہ کافروں نے کس طرح مسلمانوں کے اصول اور طور طریقے اپنا لیے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مسلمان خود کس طرح اسلام اور اپنے ہم مذہب مسلمانوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

(13) **معنی**: آئینہ دواری: آئینے کی طرح کمزور دیواریں ہیں۔ **تملق**: خوشامد۔

مطلب: مسلمانوں پر جس طرح مصائب کی یلغار ہے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی بجائے وہ توشیشے کی دیوار ثابت ہو رہے ہیں کہ ذرا ٹھیس لگی اور ٹوٹ گئی۔ اے چاند دیکھ! کہ وہ مسلمان جو کبھی صاحب عزت ووقار ہوا کرتے تھے۔ اب اپنے حریفوں کے سامنے خوشامد اور چاپلوسی پر اتر آئے ہیں ان کے بالمقابل وہ لوگ جو کبھی حقیر اور پست ہوا کرتے تھے اب وہی صاحب عزت ووقار ہیں۔

اے چاند! ہم نے جن گونگی اور بے زبان قوموں کو بولنا سکھایا آج وہ ہماری حریف کی حیثیت سے پورے جوش و خروش کے ساتھ گفتگو کرنے لگی ہیں اور ہم ان کے روبرو انگشت بدنداں کھڑے رہتے ہیں۔ مغربی ممالک کے محلات میں آج عیش و عشرت کی محفلیں سجی ہوئی ہیں اور ایران جیسی پرشکوہ مملکت جو حکمت ودانش کا سرچشمہ تھی وہاں اپنی بربادی پر ماتم بپا ہے۔

نظام خلافت جو دنیا بھر کے مسلمانوں کی وحدت کی علامت ہے اسے خود ہی ترکوں نے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اور یہ سب کچھ غیر مسلموں کی عیاری کے سبب ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کس قدر سادا اور نادان ہیں۔ لیکن اے چاند! تو بھی یہ سب کچھ آئینے کی مانند خاموشی کے ساتھ دیکھتا رہ۔ اور آج کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے ماضی میں کھو جا۔

شمع اور شاعر

(فروری 1912ء)

شاعر

117-1

دوش می گفتم بہ شمع منزل ویران خویش ۔۔۔ گیسوئے تو از پر پروانہ دارد شانہ
در جہاں مثل چراغ لالہ صحرا ستم ۔۔۔ نے نصیب محفلے نے قسمت کاشانہ
مدتے مانند تو من ہم نفس می سوختم ۔۔۔ در طواف شعلہ ام بالے نہ زد پروانہ
می طپد صد جلوہ در جان امل فرسود من ۔۔۔ بر نمی خیزد ازیں محفل دل دیوانہ

از کجا ایں آتش عالم فروز اندوختی
کرمک بے مایہ را سوز کلیم آموختی

شمع

117-2

مجھ کو جو موج نفس دیتی ہے پیغام اجل ۔۔۔ لب اسی موج نفس سے ہے نوا پیرا ترا

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز　تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا
گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفان اشک　شبنم افشاں تو کہ بزم گل میں ہو چرچا ترا
گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح　ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا
یوں تو روشن ہے مگر سوز دروں رکھتا نہیں　شعلہ ہے مثل چراغ لالۂ صحرا ترا
سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے　انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا
اور ہے تیرا شعار، آئین ملت اور ہے　زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا
کعبہ پہلو میں ہے، اور سودائی بتخانہ ہے　کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا
قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں　تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلا ترا
اے در تابندہ! اے پروردۂ آغوش موج　لذت طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا

تھا جنھیں ذوق تماشا، وہ تو رخصت ہو گئے　لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے　ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی　پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا
آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ　صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا　اب کوئی سودائی سوز تمام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں، تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے، آواز درا ہو یا نہ ہو

شمع محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا　تیرے پروانے بھی، اس لذت سے بیگانے رہے
رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو　پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے؟
شوق بے پروا گیا، فکر فلک پیما گیا　تیری محفل میں نہ دیوانے، نہ فرزانے رہے
وہ جگر سوزی نہیں، وہ شعلہ آشامی نہیں　فائدہ پھر کیا جو گرد شمع پروانے رہے
خیر تو ساقی سہی، لیکن پلائے گا کسے　اب نہ وہ میکش رہے باقی، نہ میخانے رہے
رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے　کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے
آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں　رقص میں لیلا رہی، لیلا کے دیوانے رہے

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی　شہر ان کے مٹ گئے، آبادیاں بن ہو گئیں
سطوت توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی　وہ نمازیں ہند میں نذر برہمن ہو گئیں
دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سے ہے　موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں
خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی　وہ نگاہیں نا امید نور ایمن ہو گئیں

اڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابند نشیمن ہو گئیں
وسعت گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامان خرمن ہو گئیں
دیدۂ خونبار ہو منت کش گلزار کیوں
اشک پیہم سے نگاہیں گل بداماں ہو گئیں
شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
نقد خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی
پھر دکاں تیری ہے لبریز صدائے ناؤ نوش
ٹوٹنے کو ہے طلسم ماہ سیمایان ہند
پھر سلیمی کی نظر دیتی ہے پیغام خروش
پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز
دل کے ہنگامے مۓ مغرب نے کر ڈالے خموش
نغمہ پیرا ہو، کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید کے مینا بدوش
در غم دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے، گر توانی دار گوش
کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفل ملت کو پیغام سروش
آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوز جوہر گفتار سے

رہزن ہمت ہوا ذوق تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تو، گلشن میں مثل جو ہوا
اپنی اصلیت پہ قائم تھا، تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروان بو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر، بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ
یعنی اپنی مے کو رسوا صورت مینا نہ کر
خیمہ زن ہو وادی سینا میں مانند کلیم
شعلۂ تحقیق کو غارت گر کاشانہ کر
شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجام ستم
صرف تعمیر سحر خاکستر پروانہ کر
تو اگر خوددار ہے منت کش ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا، پیدا نیا ویرانہ کر
خاک میں تجھکو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثال دانہ کر
ہاں! اسی شاخ کہن پر پھر بنا لے آشیاں
اہل گلشن کو شہید نغمۂ مستانہ کر
اس چمن میں پیرو بلبل ہو یا تلمیذ گل
یا سراپا نالہ بن جا، یا نوا پیدا نہ کر
کیوں چمن میں بے صدا مثل رم شبنم ہے تو؟
لب کشا ہو جا سرود بربط عالم ہے تو؟

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا　　دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے　　راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشہ طوفاں سے کیا　　ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آ کر کوچہ چاک گریباں میں کبھی　　قیس تو، لیلا بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی! کہ تو محتاج ساقی ہو گیا　　مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو　　خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو　　قطرہ ہے، لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو　　دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا　　جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے، پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ　　تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاید ہے جس پر کوہ فاراں کا سکوت　　اے تغافل پیشہ! تجھکو یاد وہ پیماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا　　ورنہ گلشن میں علاج تنگئ داماں بھی ہے
دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں　　کسوت مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے
پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے　　اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنم آفریں باد بہار　　نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک　　بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز　　اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
دیکھ لو گے سطوت رفتار دریا کا مآل　　موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود　　پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالہ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور　　خون گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں　　محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

*

شاعر مشرق کی یہ طویل نظم گیارہ بند پر مشتمل ہے۔ جن کے چھیاسی اشعار ہیں۔ شمع اور شاعر کے مابین ایک مکالمہ پیش کیا ہے۔ اس مکالمے میں اقبال نے اپنے افکار کے حوالے سے بہت سی اہم باتیں کہی ہیں۔ پہلا بند فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں شاعر کا شمع سے مکالمہ ہے۔ باقی کے دس بند میں

شمع از خود شاعر کے استفسارات کا جواب دیتی ہے۔ فرماتے ہیں:

شاعر

پہلا بند معنی: منزلِ ویران خویش: اپنے ویران گھر کی شمع۔ **وارد شانہ:** کنگھی مہیا ہے۔ **من ہم نفسی می سوختم:** میں اپنے نفس کی آگ میں جل رہا ہوں۔ **می طپد:** تڑپ رہے ہیں۔ **بر نمی خیزد:** نہیں اٹھتا۔ **آتش عالم فروز اندوختی:** دنیا کو روشن کرنے والی آگ۔ **کرمک:** کیڑہ۔

مطلب: کل میں نے اپنے ویران اور اجاڑ گھر میں جلنے والی شمع سے استفسار کیا کہ پروانے جو ہمہ وقت تیرا طواف کرتے رہتے ہیں بجا طور پر تجھ پر فریفتہ ہیں۔ جب کہ میری شخصیت تو اس گل لالہ کی مانند ہے جو جلتا تو رہتا ہے تاہم اس کے گرد طواف کوئی نہیں کرتا۔ جس کے مقدر میں نہ تو کوئی محفل ہے نا ہی کوئی ڈھنگ کا گھر ہے۔ حیرت ہے کہ میرا کوئی شیدائی نہیں ہے جب کہ آرزوؤں اور خواہشوں میں صرف ہونے والی میری جان اس عالم رنگ و بو میں ہزاروں جلوے پیدا کر رہی ہے۔

اے شمع آخر تو نے پوری دنیا کو منور کرنے والی یہ روشنی کہاں سے حاصل کر لی۔ جس کے سبب ایک بے حقیقت پروانے کو حضرت موسیٰؑ جیسا سوز مل گیا۔

شمع

دوسرا بند معنی: موج نفس: ہوا کی موج۔ **سوز:** حرارت۔ **سودا:** خبط۔ **بزم گل:** پھولوں کی محفل۔ **گل بدامن:** دامن میں پھول۔ **فردا:** آنے والا کل۔ **سوز دروں:** اندر کی حرارت۔ **چراغ لالہ صحرا:** صحرا کے لالہ کا چراغ۔ **بے صہبا:** بغیر شراب کے۔ **شعار:** طریقہ۔ **زشت روئی:** بدصورتی۔ **شوریدہ:** دیوانہ۔ **محمل:** لیلیٰ کے بیٹھنے کی جگہ۔ **در تابندہ:** چمک دار موتی۔ **نوا پیرا:** گیت گا رہا ہے۔ **برہم:** اجڑ گیا ہے۔

مطلب: شمع اس مرحلے پر شاعر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے کہ ہر چند تیری اور میری کیفیت ایک جیسی ہے تاہم فرق یہ ہے کہ جو موج نفس تیرے لیے نغمہ پیرائی کا سبب بنتی ہے وہی میرے لیے موت کا پیغام بن جاتی ہے۔ میں تو محض اس لیے جلتی ہوں کہ میری فطرت میں مقدر نے جلنا لکھ دیا ہے جب کہ تو اپنی تخلیقات میں اس لیے سوز پیدا کرتا ہے کہ تیرے اشعار کو سننے والے تیرے دیوانے بن کر رہ جائیں۔ میں تو اس لیے آنسو ٹپکاتی ہوں کہ میرے دل میں آنسوؤں کا ایک طوفان برپا رہتا ہے جب کہ تو اس لیے روتا ہے کہ سننے والوں میں تیری ہمدردی پیدا ہو اور وہ تجھ سے محبت کا اظہار کر سکیں۔ میں راتوں کو جل جل کر آنے والی صبح کے لیے لاانتہا قربانیاں دیتی ہے۔ جب کہ تیرا مستقبل تیرے حال سے قطعاً واقف نہیں۔ مراد یہ ہے کہ تو مستقبل کی بہتری کے لیے جدوجہد نہیں کرتا۔ بے شک تو بھی میری مانند جلتا رہتا ہے لیکن تیرے دل میں وہ حقیقی سوز نہیں جو میری فطرت میں مضمر ہے۔ لیکن تیرا شعلہ تو لالہ صحرا کے رنگ روپ کی طرح ہے۔ تو خود کو قوم کی مشکلات سے نبرد آزمائی کا دعویدار کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے لیکن ذرا سوچ کہ تیرے لیے یہ لقب کہاں تک موزوں ہے جب کہ نہ تیرے پاس عمل کی قوت ہے نہ

ایسے وسائل کہ قومی معاملات کو کامیابی سے ہم کنار کر سکے۔ تیری قوم تو بے وسیلہ ہے اور تو بھی بے عمل اور خالی ہاتھ ہے۔

اے شاعر! حقیقت یہ ہے کہ تیرے غلط طرز عمل اور اس کے ساتھ بے عملی نے پوری قوم کو بدنام کر دیا ہے۔ اس لیے بھی کہ تیرا طرز عمل ملت کے اصولوں کے قطعاً منافی ہے۔ بظاہر تو حرم کعبہ کا پرستار ہے جب کہ عملاً تیری فطرت بتکدے سے ہم آہنگ ہے۔ تیری قوم میں اب قیس جیسے عاشق اور دیوانوں کا پیدا ہونا یوں ممکن نہیں رہا کہ نہ تیرے پاس تو وہ جوہر آبدار بھی موجود نہیں رہا جو کبھی سرمایہ افتخار ہوتا تھا۔ تو بے شک ایک ایسے آبدار موتی کی مانند ہے جو تند و تیز موج کی آغوش میں پلا لیکن اس کا کیا جائے کہ جس دریا میں تو نے پرورش پائی ہے وہ طوفان سے آشنا ہے۔ مراد یہ کہ تو اور تیری قوم بے حسی اور بے عملی کے سبب ناکارہ ہو چکی ہے۔ تیری قوم میں دیکھا جائے تو وہ توانائی نہیں رہی جو انقلابوں کو جنم دیتی تھی۔

اب اس نغمہ ریزی کا کیا فائدہ جب تیرا گلستاں برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ تیرے اشعار تو سچ پوچھیے بے وقت کی راگنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو ملت کی بیداری میں قطعی مددگار ثابت نہیں ہو سکتے۔

تیسرا بند معنی: **ذوق تماشا:** دیکھنے کا سلیقہ۔ **شعلہ آشام:** شعلہ پینے والا (یعنی شراب پی)۔ **آتش بجام:** پیالے میں آگ۔ **گلشن کی جمعیت:** باغ کا شیرازہ۔ **بالائے بام:** چھت کے اوپر۔ **سوز تمام:** تمام حرارت۔ **آواز درا:** کارواں کی گھنٹی کی آواز۔

مطلب: اے شاعر! ملت مسلمہ کے وہ باشعور افراد جو ساری صورت حال کو سمجھنے کا ادراک رکھتے تھے وہ تو اب اس دار فانی سے بے نیل و مرام رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد تو حالات کی بہتری کی نوید لے کر آیا ہے تو اس کا کیا فائدہ۔ اگلے دو اشعار کا مفہوم بھی قریب قریب وہی ہے جو اس بند کے پہلے شعر کا تھا۔ چنانچہ ان اشعار میں الفاظ' تراکیب اور استعارے بدل کر کہا گیا ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں جو لوگ انتہائی حقیقت پسند تھے ان کے رخصت ہونے کے بعد اگر تو اپنے اشعار میں مسائل کا کوئی حل پیش کرتا ہے تو اس سے کیا حاصل ہو گا۔ اس لیے کہ جب گلستاں ہی اجڑ گیا اور اس کا شیرازہ ہی منتشر ہو گیا تو اس لمحے بہار کی تازہ ہوا کے پیام کی نوید بے معنی سی بات ہے۔

اس لیے کہ وہ منظر تو کب کا نظروں سے غائب ہو چکا جب تیری قوم اپنے عروج کے آخری لمحات میں تھی۔ وہ اضطراب اور تڑپ ناقابل فراموش ہے۔ لہذا اس کے بعد کوئی بہتری کے امکانات پیدا بھی ہو جائیں تو ان سے کیا مل سکے گا۔ اس لیے کہ ملت کے دلوں میں جدوجہد اور انقلاب کا جو شعلہ بھڑک رہا تھا وہ تو بجھ کر رہ گیا۔ اس کے بعد اگر کوئی اس شعلے کو ہوا دینے آیا بھی تو یہ ایک بے معنی سا عمل ہو گا۔ کہ جس قوم میں عمل اور احساس ذمہ داری کے جذبے مفقود ہو جائیں وہ تو مردہ بن کر رہ جاتی ہے۔

اے شاعر! اب تو نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ تو کتنے ہی نغمے بکھیرے ملت کے افراد ان پر کان دھرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ یہ قافلہ بے حس ہو چکا ہے۔

چوتھا بند معنی: **رشتہ الفت:** محبت کا دھاگہ۔ **فکر فلک پیما:** آسمان پر سیر کرنے والا فکر۔ **فرزانے:** عقلمند۔ **مینا:** صراحی۔ **وشت جنوں پرور:** دیوانگی دینے والا جنگل۔ **احساس زیاں:** نقصان کا احساس۔

مطلب: شمع کہتی ہے کہ اے شاعر! اگر ملت کو ایک بزم تصور کر لیا جائے تو تیری حیثیت اس بزم میں

ایک شمع کے مانند ہو گی لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ شمع محفل قرار دیے جانے کے باوجود بھی جب تجھ میں سوز اور تڑپ مفقود رہی تو ملت کے افراد جن کو پروانوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ان میں سوز اور تڑپ پیدا کس طرح ہو سکتی ہے۔ یعنی جب تجھ میں ہی ملت کی بقا کے لیے جدوجہد اور قربانی کا جذبہ نہیں ہے تو ملت کے عام افراد سے کیا توقع وابستہ کی جا سکتی ہے۔ جب تو یہ صلاحیت رکھتا تھا کہ ملت کے افراد کو رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر تسبیح کے دانوں کی طرح یکجا اور متحد کر سکتا تھا تو پھر یہ بتا کہ یہ لوگ نفاق اور انتشار کا شکار کس لیے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس ساری صورت حال کی ذمے داری تجھ پر اور صرف تجھ پر ہی عائد کی جا سکتی ہے۔ اب تو کیفیت یہ ہے کہ ملت کے افراد سے ماضی کی طرح مشکلات سے نبرد آزما ہونے اور بلندی فکر کی خصوصیات ناپید ہو گئیں اور اب ان پر عمل کرنے والا بھی کوئی نہیں رہا۔

اب تو افراد ملت میں نہ مشکلات و شدائد کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہے نا ہی جدوجہد اور قربانی کا جذبہ۔ یعنی اپنے مقاصد کے حصول سے انہیں کوئی رغبت نہیں رہی۔ یہ ایسی کیفیت ہے کہ اگر باقی کے چند افراد میں قربانی اور جدوجہد کی تڑپ موجود بھی ہو تو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو سکے گا؟ اگر تجھے ساقی بھی تصور کر لیا جائے تو شراب کیسے پلائے گا جب کہ نہ پینے والے باقی رہے نہ شرابخانے۔ مراد یہ ہے کہ جب افراد ملت بے عملی اور محرومی کو اپنے سر پر مسلط کر چکے ہوں تو اے شاعر! تو کتنی ہی دل سوزی کے ساتھ ان کے لیے نغمات تخلیق کرے۔ ان سے کوئی نتیجہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ جو قوم ماضی میں انتہائی عروج پر تھی آج وہ انتہائی سطح تک زوال کی شکار ہے۔ اس صورت حال کا ادراک اگر کسی ایک آدھ فرد کو ہے بھی تو اس سے کیا حاصل؟ آج تو وہ سارا منظر ہی تبدیل ہو چکا ہے جو کسی زمانے میں شان و شوکت اور عزت و وقار کا مظہر رہا تھا۔

افسوس تو اس امر کا ہے کہ ملت تباہ و برباد ہو کر رہ گئی بلکہ اس سے زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ افراد کے دل سے اس بربادی اور تباہی کا احساس بھی ختم ہو گیا۔

پانچواں بند معنی : **سطوت** : دبدبہ۔ **عیش دوام** : ہمیشہ کی آسودگی۔ **سامان شیون** : رونے کا سامان۔ **تجلی** : نور۔ **نور ایمن** : وہ روشنی جو حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر دیکھی تھی۔ **پابند نشیمن** : آشیانوں میں بیٹھ گئیں۔ **نظارہ سوز** : نظارے کو جلانے والی۔ **دیدۂ خونبار** : خون برسانے والی آنکھ۔ **منت کش** : احسان مند۔

مطلب : ان اشعار میں مسلمانوں کے پر شکوہ ماضی کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ جن جوانمردوں نے اپنے جوش عمل اور کارکردگی سے اجاڑ جنگلوں کو بھی پر رونق بستیوں میں تبدیل کر دیا تھا اب ان کی زوال آمادگی کا یہ عالم ہے کہ ان جوانمردوں کے شہر اور آبادیاں مسمار ہو کر ویران جنگل کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ ان جوانمردوں کی عبادت اور نمازوں سے حقیقت یہ ہے کہ بت پرستوں کے انبوہ میں وحدانیت کے تصور کو فروغ حاصل ہوا۔ آج ان کی حالت یہ ہے کہ برہمن ان کے آقا بنے ہوئے ہیں اور ان کی نمازوں کا سلسلہ بھی انہیں آقاؤں کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں انہی اقوام کو عروج حاصل ہوا جنھوں نے اپنے آئین اور نظام کی پابندی کی ورنہ مادر پدر قسم کی آزادی سے تاسف کے بغیر اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اے شاعر! تجھے یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ جو حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر نظر آیا تھا اور جو خود اپنے دیکھے جانے کا آرزو مند تھا وہ ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہو چکا ہے کہ وہ بصیرت افروز نگاہیں ہی نہ رہیں جو

اس نور کے جلوے کو دیکھنے کی اہلیت رکھتی تھیں۔ وہ دور بھی بھی تھا کہ ہزارہا بلبل اس گلستاں میں محو پرواز رہتی تھیں۔ اب نہ جانے ان کو کیا ہوا کہ اپنے گھونسلوں میں چھپ کر بیٹھ گئیں۔ مراد یہ ہے کہ ملت کی بے عملی نے ان کو بھی مایوسی کا شکار بنا دیا ہے۔ جو بجلیاں آسمان پر چمکتی رہتی ہیں اور جن کے نظارے سے دل میں تڑپ پیدا ہوتی تھی اب وہ خرمن تک محدود ہو کر رہ گئیں یعنی ان میں حدت و حرارت اور تڑپ ختم ہو کر رہ گئیں۔ ایسے میں خون برسانے والی آنکھیں پھولوں کے لیے باغ کا احسان ہی کیوں لیں کہ انہوں نے تو اپنے مسلسل بہنے والے آنسوؤں سے دامن کو ہی گلزار بنا دیا ہے۔

اس ساری کیفیت کے باوجود یہ غم انگیز صورت حال مستقل حیثیت کی حامل نہیں ہے۔ یہ شام غم تو اب مسرت و شادمانی کی صبح کی خبر دے رہی ہے اور تاریکی شب میں بھی امید کی کرن نظر آنے لگی ہے۔ ملت کے زوال کا دور ختم ہونے کو ہے۔ اور آئندہ بہتر صورت حال کی توقع کی جانی چاہیے۔

چھٹا بند معنی: پیمانہ بردار: ساقی۔ **خمستان حجاز:** حجاز کا شراب خانہ۔ **نقد خودداری:** خودداری کی دولت۔ **صدائے نائو نوش:** شراب نوشی کے وقت کا شور و غوغا۔ **ماہ سیمایان ہند:** ہندوستان کی چاند جیسی پیشانی والے۔ **سلیمی:** عرب کے ایک شاعر کی محبوبہ۔ **جزویست از پیغمبری:** پیغمبری کا حصہ ہے۔ **پیغام سروش:** فرشتہ کا پیغام۔ سوز جوہر گفتار: کلام کی گرمی۔

مطلب: اے شہر حجاز کی شان میں نغمہ سرائی کرنے والے شاعر! تجھے خوش خبری ہو کہ ایک عرصے کے بعد تیرے چاہنے والے پھر سے ہوش میں آنے لگے ہیں۔ یعنی ملت اسلامیہ گہری نیند سے ایک بار پھر بیدار ہونے لگی ہے۔ کافی عرصے سے اس قوم نے اپنی غیرت و خودداری کو غیروں کے ہاتھ بیچ رکھا۔ مراد یہ ہے کہ ملت کے افراد اپنے عقیدے اور اصولوں کو خیرباد کہہ کر فرنگیوں اور **عجمیوں** کے عقائد کے ہم نوا ہو گئے تھے تاہم مقام شکر ہے کہ اب وہ پھر سے اپنے عقائد کی جانب لوٹ رہے ہیں۔ اب ہندوستان کی چاند جیسی پیشانی رکھنے والی محبوباؤں کا جادو ٹوٹ رہا ہے اور پھر **سلیمی** کا حسن جہاں سوز مسلمانوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مسلمانوں پر ہندو تہذیب و ثقافت کے جو اثرات تھے ان کا طلسم ٹوٹ رہا ہے اور وہ خود اپنی تہذیب و ثقافت میں از سر نو کشش محسوس کرنے لگے ہیں۔

ایک بار پھر سے شور بلند ہونے لگا ہے کہ غیروں کی تہذیب و ثقافت سے نجات حاصل کر کے اپنی ہی تہذیب و ثقافت کی جانب لوٹ آؤ۔ شمع ایک بار پھر شاعر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے کہ یہ خاموش رہنے کا وقت نہیں۔ تیرے نغمات قوم کی بیداری کا سبب بن سکتے ہیں۔ یہ وقت سحر ہے اور سورج طلوع ہو رہا ہے جو ملت کے لیے خوش آئندگی کی علامت ہے۔ یہ بڑی اہم بات کی جانب اشارہ ہے کہ دوسروں کے دکھ درد میں جلو اور دوسروں کو بھی سوز عشق میں مبتلا کرو یعنی متحد و متفق ہو کر ایک دوسرے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھو۔ ایک بڑے دانشور یہ نکتہ بیان کر گئے ہیں کہ اچھی شاعری عملاً پیغمبری کا جزو ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اچھی شاعری مسلمانوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اے شاعر! ملت کو اپنی شاعری کے ذریعے بیدار کر دے اور مردہ دلوں کو اضطراب اور تڑپ سے نواز دے۔

ساتواں بند معنی: جمعیت: اتحاد۔

مطلب: اے شاعر! تو جو ملت کا نمائندہ ہے افسوس ہے کہ مشکلات کا سامنا نہ کرنے اور بے عملی کی عادت نے تیری ہمت اور حوصلے کو پست کر کے رکھ دیا۔ وہ وقت بھی تھا جب تو صحرا میں سمندر کی مانند تھا

لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ گلستان میں پنج کرندی کا روپ دھار لیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مشکلات سے بچنے اور عملی جدوجہد سے گریز کرنے کی عادت اس لیے پڑی کہ صحرائے عرب اور افریقہ کے صحراؤں میں جس بے داری کے ساتھ تیرے عساکر دشمن کے مقابلے پر سینہ سپر ہو گئے لیکن جب بہت سے علاقے فتح کر کے تجھے آرام و سکون اور عیش و عشرت میسر آئے تو بے عملی کا اس قدر عادی ہوا کہ تیری شخصیت سمٹ کر رہ گئی۔ تو جب تک اپنے حقیقی اصولوں اور قواعد پر قائم تھا تو ملت بھی متحد و متفق تھی لیکن ان اصولوں اور قواعد کو فراموش کر کے تیری قوم بھی منتشر ہو کر رہ گئی۔

پانی کا ایک معمولی سا قطرہ دیکھا جائے تو ہمیں زندگی کے رازوں سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ قطرہ کبھی منجمد ہو کر موتی بن جاتا ہے۔ کبھی آسمان کی بلندیوں سے شبنم کی صورت واپس زمین پر آتا ہے اور کبھی آنسو جیسی نایاب چیز بن کر آسمان سے ٹپکتا ہے۔ دل ایک بڑی دولت ہے۔ یہاں مراد حوصلے سے ہے کہ حوصلہ ہی باقی نہ رہے تو زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیا میں تیری عزت و آبرو اس وقت تک ہی تھی جب تک کہ تیری ملت متحد و متفق تھی اور انتشار سے دوچار نہ ہوئی تھی۔ اور جب اتحاد نہ رہا تو تیری عزت بھی خاک میں مل کر رہ گئی۔

بغور سن لے! کہ فرد کا وجود اسی وقت تک قائم ہے کہ وہ ملت سے مربوط ہو۔ اسی طرح جیسے موج دریا میں تو اہم ہے دریا کے باہر بے معنی ہے۔

آٹھواں بند معنی: وادی سینا: وادی طور۔ **شعلہ تحقیق**: علم کی آگ۔ **حباب**: بلبلے کی مانند۔ **آسانگوں**: الٹا۔ **تلمیذ**: شاگرد۔

مطلب: اس بند کی تشریح سے قبل یہاں یہ واضح کرنا غیر ضروری نہ ہو گا کہ بعض شارحین نے چھٹے بند کے بعد کی تمام نظم کو شاعر سے مخاطبت کی بجائے اقبال کے توسط سے ملت مسلمہ سے مخاطبت قرار دیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ گذشتہ بند میں کہا گیا ہے کہ شمع نے شاعر کو ملت کا نمائندہ قرار دیا ہے اور اسی حوالے سے اس نے ملت کے بارے میں گفتگو کی ہے لیکن اس گفتگو کا تعلق شاعر یعنی اقبال سے ہی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اے شاعر! تیری بہتری اسی میں ہے کہ اپنے عشق حقیقی کو دل کے پردے میں ہی چھپا کر رکھ۔ اس کو قطعاً ظاہر نہ کر۔ ورنہ ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔ اس کی مثال شراب کی صراحی ہے جو شراب کے اخراج میں قلقل کی صدا سے خود شراب کے وجود کی خبر دے دیتی ہے۔ چنانچہ تو اس طرح کی روش اختیار نہ کر۔ اے شاعر! تو اور تیری ملت جو ایک عرصے سے اپنے وجود کی جانب سے بے نیاز ہو چکے ہو۔ کمر ہمت باندھ لو۔ حضرت موسیٰ کی طرح کوہ طور کی وادی میں ڈیرے ڈال دے اور تحقیق کے شعلے کو بلند کر اور اپنے لیے صرف کر۔ مراد یہ کہ دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی تہذیبی، ملی اور معاشرتی اقدار کو فروغ دے۔ بے شک میری مانند شمع رات بھر جلتی رہتی ہے اور اس کے شعلے کے سبب لاتعداد پروانے جل کر خاک ہو جاتے ہیں تاہم شمع سے اس ظلم و ستم کے انتقام لینے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جو پروانے جل چکے ان کی خاک سے نئی صبح وجود میں لائی جائے۔ ظاہر ہے کہ صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی شمع کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کا وجود غیر ضروری ہو جاتا ہے اور اس کو بجھا دیا جاتا ہے۔

حباب یعنی بلبلہ پانی میں سرنگوں رہتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ حباب پانی کی سطح پر موجود رہنے کے باوجود خود کو الٹے پیالے کی طرح رکھتا ہے اور دریا سے کسی قسم کی خیرات نہیں لیتا۔ یہ جو قدیم کوہ و صحرا ہیں ان میں اب کوئی کشش باقی نہیں رہی اب تو ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی تگ و دو کے لیے نیا میدان تلاش کر۔ اس لیے کہ اب تیرا عزم اور جنون بھی نئے ہیں۔

اگر تجھے حالات نے انتہائی پستی سے ہم کنار کر دیا ہے تو اس کی پروا نہ کر۔ تو بھی حوصلہ کر اور عملی جدوجہد اسی طرح جاری رکھ۔ اس جدوجہد کا نتیجہ اس کسان کی کوشش کے مطابق برآمد ہو سکتا ہے جو زمین میں ہل چلا کر وہاں بیج ڈال دیتا ہے۔ یہ بیج بظاہر مٹی میں مل جاتا ہے لیکن پھر مٹی سے برآمد ہو کر تنے کی شکل میں قائم و استوار ہو جاتا ہے۔ مراد یہ کہ جدوجہد اور محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔

اے شاعر! پھر سے اپنے شاندار اور اصول پرست ماضی کی طرف لوٹ آ۔ کہ اسی حوالے سے تو جو نغمے وضع کرے گا وہی ملت اسلامیہ کے لیے مسرت و شادمانی کا سبب بن جائیں گے۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کے دو ہی طریقے اور اصول ہیں کہ یا تو مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے یا پھر خاموشی اختیار کر لی جائے۔

سو اے شاعر! تو اس دنیا میں شبنم کی طرح خاموش کیوں ہے تیرے لیے لازم ہے کہ اپنے لب کھول کہ تو کائنات کے ساز کا ایک نغمہ ہے۔

نواں بند معنی: باراں: بارش۔ خاشاک: گھاس پھوس۔

مطلب: شمع کہتی ہے کہ اے شاعر! تیرا وجود تو اس کسان کے مانند ہے جو عملی سطح پر بیج بھی، کھیتی بھی، بارش بھی۔ اور اس سے حاصل ہونے والی فصل کی طرح ہے۔ نہ جانے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر تو کس چیز کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔ جب کہ تو کسی کا محتاج نہیں ہے۔ راستے سے لے کر منزل تک سب تیرے وجود کی خبر دیتے ہیں۔ اسی طرح طوفان کے خوف سے تیرا دل نہ جانے کیوں لرزتا ہے جب کہ یہاں بھی ملاح بھی تو خود ہی ہے۔ سمندر بھی، کشتی بھی اور سمندر کا ساحل بھی بالآخر تو ہی ٹھہرتا ہے۔ تیرے وجود کے بغیر یہ عناصر بے معنی ہیں۔

اے شاعر! کبھی عشاق کے اجتماع میں بھی پہنچ کر دیکھ۔ وہاں بھی تجھے پتہ چلے گا کہ قیس اور لیلیٰ بھی تو ہے وہ صحرا جہاں قیس سرگرداں پھرتا تھا وہ بھی سمٹ کر تیرے وجود کا حصہ بن گیا ہے۔ اسی طرح وہ کجاوہ جس میں لیلیٰ سوار ہوتی تھی وہ بھی تو ہی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تو نے اپنی سادگی کے سبب ساقی کو ہی سب کچھ تصور کر لیا حالانکہ حقیقت مختلف ہے۔ شراب، بوتل، پیمانہ، ساقی اور جس محفل میں دور جام چل رہا ہے وہ سب تو ہی تو ہے۔ تجھ پر لازم ہے کہ مخالفین خدا کو شعلہ بن کر خاکستر کر دے۔ تجھے باطل کا خوف نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ باطل کو برباد کرنے والا بھی تو ہی ہے۔

نہ جانے تو اس قدر بے خبر کیوں ہے جب کہ تو ہی ہے جو زمانے کے آئینے کے جوہر کے علاوہ مسلمان کی حیثیت سے خدا کا آخری پیغام بھی ہے۔

دسواں بند معنی: شوکت طوفاں: طوفان کی شان۔ ہفت کشور: سات ولائتیں۔ تسخیر: فتح۔ کوہ فاراں: مکہ معظمہ کے قریب کے پہاڑ۔ پردۂ تقریر میں: گفتگو کے پردے میں۔ کسوت مینا: صراحی کا لباس۔

مطلب: اے شاعرِ بے بدل! تجھ پر لازم ہے کہ اپنی اصل حقیقت سے شناسائی حاصل کر لے تو تو اس قدر غفلت شعار ہے کہ یہ بھی نہیں جانتا کہ معمولی سا قطرہ ہونے کے باوجود اپنی وسعت میں بحرِ بیکراں کی مانند ہے۔ نہ جانے تو اپنی کم مائیگی کے احساس میں کیوں مبتلا ہے۔ جب کہ تیرے وجود میں نہ جانے کتنے طوفانوں کا جوہ و جلال پوشیدہ ہے۔ تیرا سینہ تو اس معبودِ حقیقی کے راز کا دفینہ ہے جو اس کائنات میں ظاہر بھی ہے اور پوشیدہ بھی۔ یعنی یہاں جو مظاہرِ فطرت ہیں وہ چشمِ بینا کے لیے خالقِ حقیقی کے وجود کا پتہ دیتے ہیں جب کہ عملاً اس کی ذات پوشیدہ ہے۔

اے شاعر! تو اس ملت کا فرزند ہے جس نے اپنی قوتِ ایمان سے بے سروسامانی کے عالم میں بھی ہزاروں فتوحات حاصل کیں اور عظیم الشان سلطنتوں کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ تو نے آنحضرتؐ سے کیا ہوا وعدہ فراموش کر دیا۔ اس وعدے کی شہادت کوہِ فاراں کی خامشی آج بھی فراہم کر رہی ہے۔ تو نے تو انتہائی نادانی اور سادگی کا ثبوت دیا ہے کہ محض چھوٹی چھوٹی عنایات پر ہی قناعت کر کے انہیں سب کچھ سمجھ لیا حالانکہ ذرا صبر کرتا تو تیرے اور ملت کے مسائل بآسانی حل ہو سکتے تھے۔

دل میں جو کیفیات پوشیدہ ہوتی ہیں وہ تو اشعار میں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ یہ تو اہلِ ذوق پر منحصر ہے کہ وہ ان اشعار تک کس حد تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان کے مفاہیم کا کس حد تک ادراک کرتے ہیں۔ اس شعر میں اقبال خود اپنی ذات کے حوالے سے کہتے ہیں کہ میں ایک آتش نوا شاعر ہوں در اسی آتش نوائی نے مجھے جلا کر خاک کر دیا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میری زندگی کا ماحصل اور مقصد یہی آتش نوائی ہے۔ چنانچہ اس آتش نوائی کا جو راز ہے وہ میرے سینے میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس آگ نے میرے دل کو ایک ایسے آئینے میں تبدیل کر دیا ہے جس میں مستقبل میں پیش آنے والے مناظر کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

گیارھواں بند **معنی:** آئینہ پوش: منور ہو گا۔ سیماب پا ہو جائے گی: بھاگ جائے گی۔ نکہت خوابیدہ: سوئی ہوئی خوشبو۔ سینہ چاکان: چمن کے سینہ چاک (یعنی مسلمان)۔ طیور: طائر کی جمع (پرندے)۔ شب گریزاں ہو گی: رات بھاگ جائے گی۔

مطلب: زیرِ تشریح نظم کے ان آخری اشعار میں اقبال بالآخر امید اور رجائیت کے منظرنامے میں مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ جن مصائب سے دوچار رہ چکی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ یہ مصائب ختم ہو کر رہ جائیں گے اس لیے کہ ظلمتِ شب کا خاتمہ ہو رہا ہے اور نورِ سحر نے زمین تو کیا آسمان کا احاطہ بھی کر لیا ہے۔ اب وہ دور آنے والا ہے کہ بہار کی ٹھنڈی ہوا وہ نغمے پیدا کرے گی کہ کلیوں اور غنچوں میں سوئی ہوئی خوشبو بھی نغموں کی صورت میں بیدار ہو گی یعنی ملتِ اسلامیہ کے تغافل شعار اور خوابیدہ افراد بیدار ہو کر سرگرمِ عمل ہو جائیں گے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت ایک بار پھر حاصل کر لیں گے۔

ملت کے مختلف فرقوں کے مابین نفاق و انتشار کی جو فضا موجود ہے وہ ختم ہو کر رہ جائے گی اور یہ لوگ ہر نوع کا بغض و کینہ فراموش کر کے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو جائیں گے۔ میری شاعری ان لوگوں میں زندہ رہنے کا احساس پیدا کرے گی اور تمام مسلمان اس کیفیت سے آگاہ ہو جائیں گے جو میرے سینے

اور اشعار میں موجود ہے۔ مغربی تہذیب کے طوفان نے جس طرح ہمیں پستی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا ہے اب یہ طوفان بالآخر خود ہی مغربی تہذیب کو لے ڈوبے گا۔

اس لیے کہ وہ وقت آگیا ہے جب ملت اسلامیہ اپنے زندہ عقائد کی طرف لوٹ آئے گی اور اس کی پیشانیاں خانہ کعبہ کی جانب جھک جائیں گی۔ مراد یہ ہے کہ تمام مسلمان حضورؐ سرور کائنات کی تعلیمات پر پھر سے عمل کر کے دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکیں گے۔ اسلام دشمن طاقتیں اب خود اپنے ظلم و ستم کی بنا پر کف افسوس ملیں گی اور نالہ و فریاں پر مجبور ہو جائیں گی اور یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے یقیناً خوش آئند ہو گی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میں اتنے بڑے انقلاب کا منظر نامہ دیکھ رہا ہوں جس پر مجھے خود بھی حیرت ہے اور اس امر کا اظہار فی الحال میرے لیے ممکن نہیں کہ اس انقلاب کے سبب دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ یہ آنے والا وقت ہی بتا سکے گا۔

بس یہ توقع ہے کہ طلوع مہر کے ساتھ ظلمت شب رخصت ہو جائے گی اور ہر طرف نغمہ توحید سنائی دے گا۔ یعنی ملت اسلامیہ کو ایک بار پھر سے عروج حاصل ہو گا۔

118

مسلم

(جون 1912ء)

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے
سینہ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے

نغمہ امید تیری بربط دل میں نہیں
ہم سمجھتے ہیں یہ لیلا تیرے محمل میں نہیں

گوش آواز سرود رفتہ کا جویا ترا
اور دل ہنگامہ حاضر سے بے پروا ترا

قصہ گل ہم نوایان چمن سنتے نہیں
اہل محفل تیرا پیغام کہن سنتے نہیں

اے درائے کاروان خفتہ پا! خاموش رہ
ہے بہت یاس آفریں تیری صدا خاموش رہ

زندہ پھر وہ محفل دیرینہ ہو سکتی نہیں
شمع سے روشن شب دوشینہ ہو سکتی نہیں

ہم نشیں! مسلم ہوں میں، توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں

نبض موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے

حق نے عالم اس صداقت کے لیے پیدا کیا
اور مجھے اس کی حفاظت کے لیے پیدا کیا

دہر میں غارت گر باطل پرستی میں ہوا
حق تو یہ ہے حافظ ناموس ہستی میں ہوا

میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے
میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

قسمت عالم کا مسلم کوکب تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسون سحر شرمندہ ہے

آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرار حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکار حیات

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

ہاں یہ سچ ہے، چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں
اہل محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں

یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

٭

① سے ③ معنی: مستور: چھپا ہوا۔ معمور: لبریز، بھرا ہوا۔ بربطِ دل: دل کا ساز۔ سرودِ رفتہ: گذرے ہوئے زمانے کا راگ۔

مطلب: اس نظم میں علامہ اقبال سے مخاطب ہو کر ایک بے عمل اور مایوس مسلمان کہتا ہے۔ اے اقبال! نہ جانے کیا وجہ ہے کہ تیرا ہر سانس آہ و فریاد میں چھپا ہوا ہے اور جو تیرا سینہ ہے وہ بھی نالہ و فریاد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اگر تیرے دل کو ایک ساز تصور کر لیا جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ تیرے نغموں یعنی شاعری میں رجائیت کی کوئی رمق باقی نہیں ہے۔ اور تو جس محمل کا پرستار ہے وہ محبوب سے خالی ہے ہرچند کہ تیری سماعت ماضی کے بھولے بسرے نغموں کو پھر سے سننے کی متقاضی ہے اور تیرا دل عصرِ موجود کے تمام ہنگاموں سے بے پروا ہے یعنی تو ملتِ مسلمہ کے عروج کا پھر سے خواہشمند ہے۔

④ سے ⑥ معنی: یاس آفریں: مایوسی پیدا کرنے والی۔ شبِ دوشینہ: گذشتہ (رات)۔

مطلب: اے اقبال تو اپنے اشعار میں اسلام کے دورِ ماضی کی جو تاریخ دہرانے کا خواہاں ہے تیرے ہم عصر آج کے مسلمان اس کو سننا پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا اس مایوس کن صورتِ حال میں تیرے لیے یہی مناسب ہے کہ تیرے اشعار جو اب مایوسی کو جنم دے رہے ہیں ان کو منقطع کر دے۔ اس لیے کہ ملت کے دلوں میں مایوسی پیدا کرنے سے خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے۔ لہٰذا تو بھی خاموش ہو جا۔ یہ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ ماضی میں مسلمانوں کی جو عظمت و شان رہی ہے اب وہ از سرِ نو بروئے کار نہیں آسکتی اور محض تیرے اشعار کے سبب ملت کے وقار میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکتا۔ مراد یہ کہ قوم بے حس ہو چکی ہے اس میں احساس بیداری پیدا کرنا مشکل کام ہے۔

دوسرا بند ⑦ سے (12) معنی: شاہدِ عادل: سچا گواہ۔ جسارت: بے باکی۔ ناموس: عزت۔ کوکبِ تابندہ: روشن ستارا۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال جواباً کہتے ہیں کہ اے ہم نشیں! یہ نہ بھول کہ میں ایک سچا مسلمان ہوں اور حق تعالیٰ کی وحدانیت کا پوری طرح قائل ہوں اور توحید کی صداقت پر ازل سے ہی میں ایک سچے گواہ کی حیثیت رکھتا ہوں۔ یہ تصورِ توحید ہی ہے جس کے سبب پوری کائنات میں حرارت اور عمل کی قوت موجود ہے۔ یہ توحید ہی ہے جس کے سبب ملت کے پیروکاروں میں جراءت و ہمت پائی جاتی ہے۔ اسی صداقت کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے کائنات کی تخلیق کی اور مسلمانوں کو اس صداقت کے تحفظ کی ذمے داری سونپی۔

یہ ملتِ مسلمہ کے پیروکار ہی تھے جنھوں نے دنیا میں باطل کو فنا کر ڈالا اور اسی لیے سچ تو یہ ہے کہ زندگی اور اس کے ننگ و ناموس کے محافظ ٹھہرتے ہیں۔ یہ میرا وجود ہی تھا جو کائنات کی عریانی کو لبادہ فراہم

پوری دنیا کے لیے روشن ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسا ستارہ جس کی چمک دمک سے صبح کا نور بھی ماند پڑتا نظر آتا ہے۔

(13) **معنی**: دوش: گذرا ہوا کل۔ فردا: آنے والا کل۔

مطلب: میری آنکھوں پر زندگی کے تمام رازہائے سربستہ آشکار ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو عملی جدوجہد سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ میں ملت کے عارضی زوال سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ مجھے اس کے تابندہ مقدر پر پورا پورا اعتماد ہے۔ میرے روز و شب ناامیدی اور یاس کے عنصر سے بے نیاز ہیں۔ میں جس معرکے میں ہوں اس کا جوش و خروش مکمل فتح کی نوید دے رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ ماضی کی پر شکوہ تاریخ پر میری نظر رہتی ہے اور وہی داستان میں اپنے اشعار میں ہم عصر مسلمانوں کو سناتا ہوں۔ یہی یاد میری خاک کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اور اسی شاندار ماضی میں اپنے درخشاں مستقبل کی جھلکیاں دیکھتا ہوں۔

حضور رسالت مآبؐ میں

119

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رخت سفر روانہ ہوا
قیود شام و سحر میں بسر تو کی، لیکن
نظام کہنہ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزم رسالتؐ میں لے گئے مجھکو
حضور آیہ رحمتؐ میں لے گئے مجھکو

کہا حضورؐ نے اے عندلیب باغ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمی نوا سے گداز
ہمیشہ سرخوش جام ولا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرت سجود نیاز
اڑا جو پستی دنیا سے تو سوئے گردوں
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعت پرواز
نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

*

پہلا بند **معنی**: گراں: ناقابل برداشت۔ **رخت سفر**: راستے کا سامان۔ **آیہ رحمتؐ**: رسول اکرم ﷺ کی رحمت کے حضور۔

مطلب

اقبال کہتے ہیں کہ جب یہ عہد میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تو رخت سفر باندھ کر عالم بالا کی طرف روانہ ہو گیا اس لیے کہ یہ دنیا جو صبح و شام کی قید سے عبارت ہے وہاں زندگی جیسے تیسے بسر تو کی تاہم یہاں کے فرسودہ نظام سے قطعی مانوس نہیں ہو سکا۔ چنانچہ جب میں عازم سفر ہوا تو فرشتوں نے میری رہنمائی کی اور مجھے حضورؐ سرور کائنات کی بارگاہ میں لے گئے۔ حضورؐ جو رحمت اللعالمین ہیں۔

دوسرا بند **معنی**: ملائک: ملک کی جمع' فرشتے۔

مطلب: آنحضرتؐ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ تو بے شک گلستان حجاز کا بلبل ہے۔ تیرے نغموں یعنی شاعری سے ملت کا ہر فرد بے شک متاثر ہوا ہے۔ یہ کارنامہ جو تو نے انجام دیا بے حد عظیم ہے۔ تیرا دل ہمیشہ ہماری محبت سے سرشار رہتا ہے۔ تیری خاکساری اور انکساری ہزارہا سجدوں کے لیے باعث رشک ہے۔ تو زمین کی پستی سے اڑ کر جو یہاں پہنچا ہے کہ فرشتوں نے تجھے بلند پروازی سکھائی ہے۔

بے شک تو باغ دنیا سے خوشبو کی طرح اڑ کر یہاں آیا ہے مگر ہمارے لیے کیا تحفہ لایا؟

تیسرا بند **معنی**: آبگینہ: شیشہ' صراحی۔

مطلب: آنحضرتؐ کے استفسار پر اقبال نے عرض کی کہ حضورؐ دنیا وہ مقام ہے جہاں آرام و سکون ناپید ہے اور جس زندگی کی تلاش ہو وہ بھی میسر نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس دنیا میں بے شمار انسان بستے ہیں لیکن ان میں حمیت و وفا کا نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں حضورؐ کی خدمت اقدس میں ایک ایسا آبگینہ لے کر آیا ہوں کہ اس میں جو گرانقدر شے ہے وہ جنت میں بھی نہیں مل سکتی۔

یہ نایاب شے جو اس آبگینے میں موجود ہے وہ طرابلس کے شہیدوں کا لہو ہے۔ جس سے حضورؐ کی امت کی آبرو اور توقیر جھلکتی ہے۔

شفاخانہ حجاز

120

اک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا — کھلنے کو جدہ میں ہے شفاخانہ حجاز
ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرہ بے قرار — سنتا ہے تو کسی سے جو افسانہ حجاز
دست جنوں کو اپنے بڑھا جیب کی طرف — مشہور تو جہاں میں ہے دیوانہ حجاز

دارالشفا حوالی بطحا میں چاہیے
نبض مریض پنجہ عیسیٰ میں چاہیے

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات — پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابہ اجل میں جو عاشق کو مل گیا — پایا نہ خضر نے مے عمر دراز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی — میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں

آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا؟
رکھتے ہیں اہل درد مسیحا سے کام کیا؟

✽

[illegible]

مطلب: دو بند پر مشتمل اس نظم کے اولین بند میں اقبال کہتے ہیں کہ ایک روز مجھ کو ایک قوی رہنما نے بتایا کہ سعودی عرب کے شہر جدہ میں ہسپتال کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔ جب تو کسی شخص سے حجاز کا ذکر سنتا ہے تو تیرے جسم کا ہر ذرہ بے قرار ہونے لگتا ہے۔ اب میں اس سرزمین میں ہسپتال کے قیام کی تجھے جو نوید دے رہا ہوں تو اس سے اظہار عقیدت کے طور پر اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا اور ہسپتال کی تعمیر میں امداد کے لیے عطیہ دے کہ اس علاقے میں مریضوں کے لیے ہسپتال کا قیام اشد ضروری ہے تاکہ اطباء وہاں بیمار لوگوں کا علاج کر سکیں۔

شفا بند معنی: شفا: صحت۔

مطلب: اقبال اس پیشوائے قوم سے مخاطب ہو کر جواباً کہتے ہیں کہ جس شے کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے فی الواقع وہ زندگی کا ایک ایسا رخ ہی ہے جس طرح کہ حقیقت مجاز میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ایک سچے عاشق کو فنا میں جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ حضرت خضرؑ اپنی طویل عمر میں بھی حاصل نہیں کر سکے۔ سو جناب زندگی کا یہ پیغام حضور دوسروں کو دیں میں تو سرزمین حجاز پر موت کا تمنائی ہوں۔ آپ میرے پاس شفا کا یہ کیا پیغام لے کر آئے ہیں کہ اہل درد لوگ تو معالجوں سے سروکار نہیں رکھا کرتے۔ کہ تکلیف ان کے لیے راحت ہے۔

زیر تشریح نظم کا پس منظر یہ ہے کہ انگریزوں نے سرزمین حجاز میں ہسپتال تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے رقم درکار تھی۔ ہندوستان میں بھی اس مقصد کے لیے عطیات جمع کیے گئے لیکن اقبال اور بعض دوسرے اکابر اس نوعیت کے ہسپتال کی تعمیر کے خلاف تھے جو انگریز کی زیر سرپرستی قائم ہو۔ لہذا اس منصوبے کے خلاف یہاں آواز اٹھائی گئی۔ اقبال کی یہ نظم بھی اس احتجاج کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

121

جواب شکوہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — پر نہیں، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے، رفعت پہ نظر رکھتی ہے — خاک سے اٹھتی ہے، گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالہ بے باک مرا

پیر گردوں نے کہا سن کے، کہیں ہے کوئی — بولے سیارے، سر عرش بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا، نہیں، اہل زمیں ہے کوئی — کہکشاں کہتی تھی، پوشیدہ یہیں ہے کوئی

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا
عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا
تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا؟
آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا؟
غافل آباد سے سکان زمیں کیسے ہیں!
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں!

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے؟
عالمِ کیف ہے، دانائے رموزِ کم ہے
ہاں، مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے!
ناز ہے طاقت گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا
اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا
کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہرِ قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں
امت باعثِ رسوائیِ پیغمبرؐ ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تا براہیمؑ پدر، اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا
نازشِ موسمِ گل لالۂ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا اللہ کا سودائی تھا
کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا
کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کر لو
ملتِ احمدِ مرسلؐ کو مقامی کر لو

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے! ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمہیں کہدو یہی آئینِ وفاداری ہے
قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو

بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن، تم ہو　　بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟　　نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟　　میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو آباء وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

کیا کہا؟ بہر مسلماں ہے فقط وعدۂ حور　　شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطر ہستی کا ازل سے دستور　　مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیؑ ہی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک　　ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

کون ہے تارک آئین رسولؐ مختار؟　　مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار؟　　ہو گئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا، تو غریب　　زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا، تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب　　پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا، تو غریب
امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی!　　برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں، روح بلالی نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود　　ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود　　یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

دم تقریر تھی مسلم کی صداقت بیباک   عدل اس کا تھا قوی، لوث مراعات سے پاک
شجر فطرت مسلم تھا حیا سے نمناک   تھا شجاعت میں وہ اک ہستی فوق الادراک

خود گدازی نم کیفیت صہبایش بود
خالی از خویش شدن صورت مینایش بود

ہر مسلماں رگ باطل کے لیے نشتر تھا   اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اسے قوت بازو پر تھا   ہے تمھیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو

ہر کوئی مست مے ذوق تن آسانی ہے   تم مسلماں ہو؟ یہ انداز مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے، نے دولت عثمانی ہے   تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم   تم خطاکار و خطابیں، وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم   پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم

تخت فغفور بھی ان کا تھا، سریر کے بھی
یوں ہی باتیں ہیں، کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟

خودکشی شیوہ تمھارا، وہ غیور و خوددار   تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار   تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی

مثل انجم افق قوم پہ روشن بھی ہوئے   بت ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے
شوق پرواز میں مہجور نشیمن بھی ہوئے   بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدظن بھی ہوئے

ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

قیس زحمت کش تنہائی صحرا نہ رہے   شہر کی کھائے ہوا، بادیہ پیما نہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے، بستی میں رہے یا نہ رہے   یہ ضروری ہے، حجاب رخ لیلا نہ رہے

گلہ جور نہ ہو، شکوۂ بیداد نہ ہو
عشق آزاد ہے، کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو

عہد نو برق ہے، آتش زن ہر خرمن ہے   ایمن اس سے کوئی صحرا، نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوام کہن ایندھن ہے   ملت ختم رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی — کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی — گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

امتیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی — اور محرومِ ثمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی
سیکڑوں نخل ہیں، کاہیدہ بھی، بالیدہ بھی — سیکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی
نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سیکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا — تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا — غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا
نخلِ شمع استی و در شعلہ دود ریشہ تو
عاقبت سوز بود سایہ اندیشہ تو

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے — نشہ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا — غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے، یہ ساماں ہے دل آزاری کا — امتحاں ہے ترے ایثار کا، خودداری کا
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری — ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری — کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری
وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مثلِ بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا — رخت بردوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ، تو ذرے سے بیاباں ہو جا — نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو — چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو — بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمۂ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامن کہسار میں، میدان میں ہے بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

مردم چشم زمیں، یعنی وہ کالی دنیا وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمی مہر کی پروردہ، ہلالی دنیا عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری میرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

*

یہ تو ایک واضح حقیقت ہے کہ زیر تشریح نظم اقبال نے اپنی پہلی نظم "شکوہ" کے جواب میں کہی۔ "شکوہ" میں اقبال نے جس بے تکلفانہ انداز میں رب جلیل سے مکالمہ کیا تھا اس وقت اس نظم کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ اس تاثر کو کسی حد تک زائل کرنے کے لیے "جواب شکوہ" لکھی ہوئی "بانگ درا" میں شکوہ اور جواب شکوہ کے درمیان چودہ نظمیں اور موجود ہیں لیکن میں نے بوجوہ ترتیب بدل کر مذکورہ دونوں نظموں کو یکجا کر دیا ہے۔ تاکہ قاری کے لیے تسلسل برقرار رہ سکے۔ ترتیب کے اعتبار سے مذکورہ چودہ نظمیں اس کے بعد شامل کی جائیں گی۔ زیر تشریح نظم میں چھتیس بند شامل ہیں۔

پہلا بند معنی: قدسی الاصل: اپنی اصل کے لحاظ سے فرشتہ۔ **رفعت:** بلندی۔ **گردوں:** آسمان۔ **فتنہ گر:** ہنگامہ برپا کرنے والا۔

مطلب: اس بند کی طرح دوسرے کئی ابتدائی بند میں اقبال نے اپنی نظم "شکوہ" کی اثرانگیزی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ جو بات انسان کے دل کی گہرائی سے نکلتی ہے وہ دوررس اثرات کی حامل ہوا کرتی ہے۔ خلوص دل سے کہی ہوئی بات وسائل نہ ہونے کے باوجود وسیع تر سطح پر تاثیر کی صلاحیت ضرور رکھتی ہے کہ یہ سچائی ہمیشہ رفعت اور بلندی پر نظر رکھتی ہے۔ بے شک یہ بات زمین پر کہی جائے تاہم اگر اس میں وزن ہے اور صداقت ہے تو اس کی رسائی آسمان تک ممکن ہوتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ "شکوہ" میں میرا عشق اور اس کا اظہار بے شک تند و تیز سہی تاہم سچائی پر مبنی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میری فریاد نے آسمان اور اس کے باسیوں تک کو ہلا ڈالا۔

دوسرا بند معنی: عرش بریں: آٹھواں آسمان۔ **رضواں:** بہشت کا داروغہ۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جب میری فریاد بلند ہوئی تو اس سے متاثر ہو کر بوڑھے آسمان نے کہا لگتا ہے قریب ہی کوئی شخص موجود ہے۔ سیاروں کا خیال تھا کہ غالباً فریادی عرش پر موجود ہے۔ چاند کا استدلال یہ

تھا کہ یہ تو کوئی زمین پر رہنے والا شخص ہے جب کہ کہکشاں کا خیال تھا کہ یہ شخص کہیں ہمارے اردگرد ہی چھپا ہوا ہے۔ تاہم اگر میری فریاد کو کسی حد تک حقیقت کے روپ میں دیکھا تو وہ داروغہ جنت رضوان تھا جو مجھے جنت سے نکالے ہوئے انسان سے تعبیر کر رہا تھا۔

تیسرا بند معنی: **عرش والوں:** ساتویں آسمان والے۔ **تا سر عرش:** عرش کے کنارے تک۔ **پستی کے مکیں:** زمین کے رہنے والے۔

مطلب: فرشتے پر اس امر پر حیرت زدہ تھے کہ یہ فریاد کی جو صدا ان تک پہنچ رہی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ جو لوگ عرش پر مقیم تھے وہ بھی اس راز کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا انسان کی رسائی اب آسمان تک بھی ہو گئی ہے؟ اور کیا خاک کی چٹکی میں وہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اس قدر بلندی تک پرواز کر سکے؟ ان کا کہنا تھا کہ اگر ایسا ہے تو ماننا پڑے گا کہ ساکنان زمین آداب محفل سے آگاہی نہیں رکھتے۔ اتنی پستی پر قیام کرتے ہوئے یہ جسارت شوخی اور گستاخی نہیں تو کیا ہے؟

چوتھا بند معنی: **برہم:** ناراض۔ **مسجود ملائک:** جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا (مراد انسان)۔ **نا محرم:** ناواقف۔

مطلب: یہ فریادی تو اس قدر شوخ ہے کہ رب ذوالجلال سے بھی برہمی کا اظہار کر رہا ہے۔ کیا یہ وہی آدم ہے جس کو کبھی فرشتے سجدہ کیا کرتے تھے؟ یہ درست ہے کہ انسان کو زندگی کے بیشتر مسائل کا علم ہے اور وہ اپنی دانش کے ذریعے ہر شے تک رسائی بھی حاصل کر سکتا ہے تاہم لگتا یوں ہے کہ ان خصوصیات کے باوجود عجز و انکسار کے خواص سے قطعی طور پر آگاہ نہیں ہے۔ اس کو اپنی طاقت گفتار پر تو بے شک فخر و ناز ہے لیکن امر واقع یہ ہے کہ اس میں بات کرنے کا سلیقہ تک نہیں۔

پانچواں بند معنی: **لبریز:** بھرا ہوا۔ **آسماں گیر:** آسمان کی بلندی پر پہنچنے والا۔

مطلب: فرشتوں کی یہ گفتگو جاری تھی کہ عرش بریں سے ایک بلند آواز پیدا ہوئی۔ یقیناً یہ رب ذوالجلال کی آواز تھی اس آواز نے اقبال سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ بے شک تیری داستان غم و اندوز سے لبریز ہے اور تیری آنکھوں سے جو آنسو نکلے ہیں ان کی سچائی میں بھی کلام نہیں۔ تیری یہ شوخ لہجے والی فریاد آسمان تک پہنچ گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تو ایسے دل کا مالک ہے جو دیوانگی میں انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تو نے اپنے شکوہ کا جس طرح اظہار کیا ہے اس میں شکایت کو بھی شکر کے قالب میں ڈھال دیا ہے یوں اپنے حسن کلام سے تو نے انسانوں اور خدا کے مابین مکالمہ کرایا ہے۔

چھٹا بند معنی: **مائل بہ کرم:** مہربانی کے لیے راغب۔ **گل:** مٹی۔ **شان کئی:** "کے" ایران کے بادشاہ کا ایک مشہور خاندان۔

مطلب: رب ذوالجلال فرماتے ہیں! کہ ہم تو ہمیشہ سے مائل بہ کرم رہے ہیں لیکن جب کوئی سائل ہی نہ ہو تو عنایات و کرم کس پر ہیں۔ اے اقبال! تو نے اپنے "شکوہ" میں جو گلے کیے ہیں وہ خلاف حقیقت ہیں۔ دراصل رہنمائی اسی کی کی جاتی ہے جس میں جوہر قابل اور صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ تیری قوم میں تو وہ مادہ ہی برقرار نہیں رہا جو قوموں کی تعمیر کا سبب بنتا ہے۔ اگر کسی میں حاصل کرنے

کی صلاحیت ہو تو ہم اسے بادشاہوں جیسی شان و شوکت عطا کرنے کے لیے تیار ہیں اور کولمبس کی مانند جو کوئی نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تو ہم اسے اس دنیا کی راہ بھی دکھا دیتے ہیں۔ اس بند میں کہا گیا ہے کہ ملت مسلمہ جب خود ہی قوت عمل سے محروم ہو کر اپنی بے عملی پر انحصار کیے بیٹھی ہے تو خدا سے التفات و کرم کی کمی کا شکوہ کیسا؟

ساتواں بند معنی: بے زور: بے طاقت۔ **بت گر:** بت تراش۔ **آزر:** حضرت براہیمؑ کے والد کا نام۔ **بادہ آشام:** شراب پینے والے۔

مطلب: یہ بھی سن لے کہ اس دور کے مسلمان صرف بے عمل اور قوت تخلیقی اپج سے محروم ہی نہیں بلکہ ان کے دل بھی کفر و الحاد کے عادی بن چکے ہیں۔ یہی وہ امتی ہیں جو آج اپنے پیغمبرؐ کو رسوا کرنے کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جو بھی بت شکن ہوا کرتے تھے وہ تو جا چکے۔ اب جو باقی رہ گئے ہیں وہ تو عملی سطح پر بت تراش واقع ہوئے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ باپ کو ابراہیمؑ سمجھ لو جو بت شکن تھے لیکن بیٹا آزر کی حیثیت رکھتا ہے جو بت تراش تھا۔ یعنی تمہارے اسلاف ابراہیمؑ کی مانند تھے جب کہ تم آزر کے مماثل ہو۔

اب تو کیفیت یہ ہے کہ پرانی اقدار کو فراموش کر کے نئی قدروں کو اپنا لیا گیا ہے حتیٰ کہ نئے کعبے کے ساتھ تم نے بھی خود کو اسی رنگ میں رنگ لیا ہے۔

آٹھواں بند معنی: مایہ رعنائی: حسن کا سرمایہ۔ **نازش:** فخر۔ **ملت احمد مرسلؐ:** مراد مسلمان۔

مطلب: وہ زمانہ فراموش نہیں کیا جا سکتا جب کہ مسلمان میری ذات کو ہی باعث فخر سمجھا کرتے تھے اور میں ہی ان کے لیے سب کچھ تھا۔ اس وقت تو جو مسلمان صفحہ ارض پر موجود تھا میرا ہی سودائی بنا پھرتا تھا اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جسے تو آج ہرجائی قرار دے رہا ہے وہی تم مسلمانوں کا محبوب ہوا کرتا تھا۔ پھر بھی اگر میری صفات سے بدظنی کا اظہار کرتے ہو تو جاؤ کسی جامد شخصیت کے ہاتھ پر بیعت کر لو اور آنحضرتؐ کی نبوت کو محدود کر کے کسی ایک مقام سے وابستہ کر لو۔

نواں بند معنی: گراں: بوجھل۔ **جذب باہم:** باہمی کشش۔ **محفل انجم:** ستاروں کی محفل۔

مطلب: تم لوگ شکایت تو کرتے ہو پر اتنا تو بتاؤ کہ نماز فجر کے لیے بیدار ہونا تمہارے لیے کس قدر تکلیف دہ امر ہو گیا ہے۔ تمہیں دراصل ہم سے محبت نہیں بلکہ اپنی نیند ہی تمہیں پیاری ہے۔ پھر تم لوگ اس قدر آزاد طبع ہو چکے ہو کہ تمہیں ماہ رمضان کے روزے بھی ایک مصیبت نظر آتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ ان حالات کے پیش نظر مجھ سے وفاداری کا یہی انداز رہ گیا ہے۔ جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ قوم مذہب کی بنیاد پر ترتیب پاتی ہے۔ اگر مذہب نہیں تو وہ قوم ہی نہیں۔ تم لوگوں کی حیثیت بھی بے معنی ہے۔ اس کی مثال ستاروں سے دی جا سکتی ہے۔ کہ یکجا ہو کر وہ ایک جھرمٹ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

دسواں بند معنی: خرمن: کھلیان۔ **اسلاف کے مدفن:** بزرگوں کی قبریں۔ **نکو نام:** نیک نام۔

مطلب: امر واقع یہ ہے کہ جن کو دنیا میں رہتے ہوئے کوئی ہنر اور فن نہیں آتا وہ تم لوگ ہو۔ جس قوم کو اپنے گھر کی پروا بھی نہیں ہے کہ وہ کیسا ہے کس حال میں ہے وہ قوم تم جیسے لوگوں سے ہی عبارت ہے۔ تمہارے نشیمن پر تو بجلیاں بھی بڑی آسانی سے گر سکتی ہیں یعنی تم اس قدر کمزور واقع ہوئے ہو کہ

دشمن کسی وقت کے بغیر تمہیں زیر کر سکتا ہے۔ اور تو اور تم لوگ تو اپنے اسلاف کے مقبروں کو بھی بیچ کھاتے ہو۔ ذرا غور تو کرو کہ جب تم اس عمل میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تو تمہیں بت فروشی میں کیا عار محسوس ہو گا۔

گیارہواں بند معنی: صفحہ دہر: مراد دنیا ہے۔ **آبا:** آباؤ اجداد۔ **منتظر فردا:** کل کے انتظار میں۔

مطلب: مجھے کم از کم ان سوالات کا جواب تو دو کہ ان دنیا سے کفر و باطل کا نشان مٹانے والا کون تھا؟ پھر یہ بھی بتاؤ کہ دنیا بھر کے انسانوں کو غلامی سے نجات دلوائی! حرم کعبہ کو اپنے سجدوں سے آباد کس نے کیا؟ آخری بات یہ کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے میرے بھیجے ہوئے صحیفے یعنی قرآن کو اپنے سینوں سے لگا کر رکھا؟ بے شک اس سارے عمل کے ذمہ دار تمہارے اسلاف ہی تھے مگر ان کے مقابلے میں تم تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے مستقبل کے منتظر ہو اس کے سوائے اور کچھ نہیں۔

بارہواں بند معنی: شعور: عقل۔ **فاطر ہستی:** دنیا کو پیدا کرنے والا (مراد خدا)۔

مطلب: یہ تم نے ہی شکایت کی ہے کہ ہم نے مسلمانوں کو محض وعدہ حور پر ہی ٹال رکھا ہے مگر سوچو کہ اگر کوئی شخص بے جا شکوہ بھی کرتا ہے تو اس کے لیے بھی تہذیب و شعور درکار ہوتے ہیں۔ اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد ہم نے تو ازل سے ہی اپنا وطیرہ عدل و انصاف بنا رکھا ہے چنانچہ اگر کافر بھی مسلمانوں کے طور طریقے اختیار کر لیں تو عدل و نصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ ان کو حور و قصور سے نوازا جائے ان پر کسی دوسرے کی اجارہ داری تو نہیں ہے۔ تمہارے طرز عمل کے پیش نظر لگتا تو یوں ہے کہ تم میں دراصل حوروں کو چاہنے کی خواہش موجود نہیں ہے۔ بالفاظ دگر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ طور کا جلوہ تو اپنی جگہ موجود ہے لیکن اس کو دیکھنے کے لیے موسیٰ موجود نہیں۔

تیرھواں بند معنی: منفعت: نفع۔ **حرم پاک:** خانہ کعبہ۔ **پنپنے:** ترقی کرنا۔

مطلب: اے مسلمانو! تمہاری جو قوم ہے اس کا نفع نقصان بھی سب کے لیے یکساں ہے۔ سب کا نبیؐ بھی، دین بھی اور اسلام بھی ایک ہی ہے۔ ان کے حوالے سے کسی فرقے یا قبیلے میں امتیاز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تمہارا تو خانہ کعبہ بھی سب کے لیے ایک ہی ہے۔ پالنے والا اور قرآن بھی ایک ہی ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہوتی جو مسلمان سب کے سب ایک ہی ہوتے۔ جب کہ وہ تو گروہ در گروہ بٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کے نفع نقصان کے علاوہ نبیؐ، دین، ایمان، حرم پاک، خدا اور قرآن سب کے لیے ایک ہی ہے۔

اس کے باوجود ملت اسلامیہ میں کہیں تو لوگ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کہیں ذاتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ کیا انہی حالات میں کوئی قوم پنپ سکتی ہے۔

چودھواں بند معنی: تارک: ترک کرنے والا۔ **آئین رسولؐ مختار:** سنت نبویؐ۔ **طرز سلف:** بزرگوں کے طور طریقے۔

مطلب: پیغمبر اسلامؐ کے دینی اصولوں کو یہ بتاؤ، ترک کرنے والا کون ہے؟ کون ہے جو ذاتی منفعت کے لیے مصلحت کیشی کا شعار اپنائے ہوئے ہے؟ اور غیر مسلموں کی بدعتوں نے کس کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ اس نے انہیں ایک طرح سے اپنا عقیدہ شمار کر لیا ہے اور کس کا دل ہے جو بزرگوں کے طرز عمل

سے بیزار ہو چکا ہے۔
سچ پوچھو تو تم وہ لوگ ہو جن کے دل تپش سے خالی ہو چکے ہیں اور جن کی روح میں جیالوں کی طرح زندگی گزارنے کا احساس نہیں رہا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تمہیں تو آنحضرتؐ کے پیغام کا بھی احساس نہیں رہا یعنی تم پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کو بھی بھلا بیٹھے ہو۔

پندرھواں بند معنی: صف آرا: صفیں باندھنا۔ **زحمت:** تکلیف۔ **ملت بیضا:** اسلام۔

مطلب: یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ مساجد کا جائزہ لیں تو اس امر کا پتہ چلے گا کہ وہاں نماز کی ادائیگی کے لیے صرف غریب طبقے کے لوگ ہی وارد ہوتے ہیں اور جو روزہ رکھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں وہ بھی غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ہمارا (خدا) کا نام لیتا ہے تو وہ بھی غریب ہی ہوتا ہے۔ اور اگر کسی نے اپنے عمل سے تمہارا اور ملت اسلامیہ کا بھرم قائم رکھا ہوا ہے تو وہ غریب ہی ہے۔
جہاں تک دولت مند لوگوں کا تعلق ہے وہ دولت کے نشے میں ہم سے قطعاً غافل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ دیکھا جائے تو ملت مسلم صرف اور صرف غریب اور نادار لوگوں کے دم سے ہی زندہ ہے۔

سولھواں بند معنی: پختہ خیالی: سنجیدہ خیالات۔ **برق طبعی:** جوش و خروش۔ **روح بلالی:** حضرت بلالؓ جیسا جذبہ۔ **فلسفہ:** عقلی علم۔ **تلقین غزالی:** غزالی کا اخلاقی فلسفہ۔

مطلب: قوم کو جو لوگ وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں دیکھا جائے تو ان میں پختہ خیالی کا فقدان ہے۔ نہ ان کی طبیعتوں میں بجلی کی سی تڑپ ہے نا ہی گفتگو میں کسی قسم کی تاثیر باقی رہی ہے۔ وہ شعلہ بیانی کا جوہر دیکھا جائے تو نابود ہو چکا ہے۔ کیفیت تو یہ ہے کہ اب اذان محض ایک رسم کی طرح باقی رہ گئی ہے جو پانچ وقت ادا کی جاتی ہے۔ اس میں حضرت بلالؓ کی سی روح اور جذبے کا عمل دخل نہیں رہا یعنی جب بلال اذان دیا کرتے تھے تو آنحضرتؐ خود ان کے لحن کو پسند فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح فلسفہ تو باقی رہ گیا لیکن امام غزالی کی طرح اس کی توجیہہ کرنے والے باقی نہیں رہے۔ اب تو مساجد اس امر پر مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی باقی نہیں رہے یعنی وہ لوگ بھی موجود نہیں جو حجازیوں کے سے وصف رکھتے تھے۔

سترھواں بند معنی: نابود: غائب۔ **نصاریٰ:** عیسائی۔ **ہنود:** ہندو۔

مطلب: ہر طرف اس امر کا شور و غوغا عام ہے کہ اس دنیا سے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے بحیثیت قوم اب ناپید ہو چکے ہیں جب کہ ہمارا موقف یہ ہے کہ کیا کہیں کسی مقام پر مسلمان موجود بھی تھے؟ اس لیے کہ اے اسلام کے نام لیواؤ! دیکھا جائے تو تم وضع قطع میں تو عیسائیوں کے اور رہن سہن کے حوالے سے ہندوؤں کے پیروکار نظر آتے ہو۔ سچ پوچھو تو تم ایسے مسلمان ہو جنہیں دیکھ کر یہودی بھی شرما کر رہ جائیں۔
یہ تسلیم کہ ذات پات کے حساب سے تو تم میں سید بھی موجود ہیں، مرزا بھی افغان بھی! لیکن ذرا یہ تاؤ کہ سبھی کچھ ہونے کے باوجود کیا تم مسلمان بھی ہو؟

ہواں بند معنی: **بیباک:** بے خوف۔ **لوث:** آلودگی۔ **نمناک:** تازہ۔ **فوق الادراک:** عقل ... **خود گدازی:** اپنے آپ کو پگھلانا۔

وہ وقت بھی تھا کہ جب خطاب کے دوران مسلمان مقرر کی تقریر صداقت اور جراءت

حیائی کی آئینہ دار ہوا کرتی تھی۔ عدل و انصاف کے دوران ہر قسم کی رعایتوں سے گریز کرتے تھے وہ فطری اعتبار سے اس درخت کی مانند تھی جو صدا نم آلود رہتا ہے۔ شرم و حیا اس کے زیور تھے۔ جہاں تک جراءت و شجاعت کا تعلق ہے اس کی صلاحیتوں کا عقل و شعور تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس بند کے آخری شعر میں فی الواقع آنحضرتؐ کے بعد کا جو دور تھا اس کے اولوالعزم اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ باہم ایثار سے کام لیا کرتے تھے۔ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا کرتے تھے۔ ہمیشہ ضرورتمندوں کے کام آتے اور اپنے عمل کو ذاتی مفادات سے آلودہ نہیں کرتے تھے۔

انیسواں بند معنی: **رگ باطل**: کافر۔ **ازبر**: زبانی یاد۔

مطلب: اس عہد میں صورت یہ تھی کہ ہر مسلمان کفر و باطل کے سینوں میں نشتر کی مانند تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے کردار میں عمل بنیادی جوہر کی حیثیت رکھتا تھا۔ انہیں اگر کسی پر بھروسہ بھی تھا تو اپنے قوت بازو پر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عصر موجود کے مسلمانوں کو تو محض موت سے ڈر لگتا ہے جب کہ ماضی کے مسلمان تو محض خوف خدا کے قائل تھے۔

سو یہ بتاؤ کہ اگر بیٹے کو باپ کی علمیت کا ادراک نہ ہو اس صورت میں وہ کیسے باپ کا وارث بن سکتا ہے۔

بیسواں بند معنی: **ذوق تن آسانی**: آرام و آرائش کا شوق۔ **حیدری فقر**: حضرت علیؓ جیسا فقر۔ **تارک قرآں**: قرآن کو ترک کرنے والے۔

مطلب: تم میں سے تو ہر کوئی سل انگار ہے اور محض عیش و آرام کی زندگی کا خواہاں ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تم جو مسلمان ہونے کے دعویدار ہو کیا مسلمانی کا انداز یہی ہے؟ جس کے تم عادی ہو چکے ہو۔ دیکھا جائے تو نہ تمہاری طبیعت میں حضرت علیؓ کا سا فقر اور درویشی ہے نا ہی حضرت عثمانؓ جیسی امیرانہ شان و شوکت ہے۔ اس صورت میں کیا اس امر کی جوابدہی کر سکو گے کہ اپنے اسلاف کے ساتھ تمہاری کیا روحانی نسبت ہے؟

جہاں تک تمہارے اسلاف کا تعلق تھا تو وہ بحیثیت مسلمان معزز و محترم رہے جب کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات ترک کر کے تم دنیا میں خوار اور رسوا ہو رہے ہو۔ ان اشعار میں اقبال نے ماضی اور آج کے مسلمانوں کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔

اکیسواں بند معنی: **خطا بیں**: غلطیاں پکڑنے والے۔ **اوج ثریا**: انتہائی بلندی۔ **فغفور**: چین کے بادشاہوں کا لقب۔

مطلب: جہاں تک تمہارا تعلق ہے تم تو آپس میں جنگ و جدل کے قائل ہو جب کہ تمہارے اسلاف ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا کرتے تھے۔ تم خود بھی خطا کرتے ہو اور دوسروں کی خطاؤں کے ضمن میں متجسس رہتے ہو۔ جب کہ تمہارے اسلاف دوسروں کی خطاؤں کو نظرانداز بھی کر دیتے تھے اور بخش بھی دیا کرتے تھے۔ یوں تو دنیا میں سب ہی لوگ اس امر کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ وہ انتہائی بلند مدارج پر فائز ہوں لیکن اس کے لیے کوئی ضروری صلاحیت بھی تو پیدا کرے۔

جہاں تک تمہارے اسلاف کا تعلق تھا انہوں نے اپنی ہمت و جراءت سے کم و بیش ساری دنیا کو تسخیر کر لیا جس کے عوض انہوں نے چین جیسے عظیم ملک کے شہنشاہ کا تخت بھی حاصل کر لیا اور ایران کے تخت پر بھی قبضہ جما لیا جب کہ تم تو ان کے مقابلے میں محض باتیں بنانے کے عادی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم میں اسلاف کی سی حمیت نہیں رہی۔

بائیسواں بند معنی: گلستاں بکنار: جھولی میں باغ۔ **نقش:** لکھی ہوئی ہے۔

مطلب: تمہارا طرز عمل تو فی الواقع خودکشی کے مترادف ہے جب کہ تمہارے اسلاف بلاشبہ غیرت مند اور خوددار تھے۔ تم لوگ بھائی چارے سے گریز کرتے ہو جب کہ وہ بھائی چارے کو انسانی رشتوں کی بنیادی اساس تصور کیا کرتے تھے۔ تم تو سراپا باتونی اور بڑبولے ہو جب کہ وہ "کلیتا" عمل کے قائل تھے۔ تم تو ایک کلی کے لیے ترستے ہو جب کہ باغات ان کی دسترس میں تھے۔ مراد یہ کہ تم بے عملی کا شکار ہو اور تمہارے اسلاف بلند کردار اور باعمل لوگ تھے۔ اسی سبب وہ ساری دنیا پر مختصر عرصے میں چھا گئے۔

آج تک دنیا بھر کی قوموں کو ان کی داستانیں ازبر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کی صداقت کے نقوش صفحہ دہر پر ثبت ہیں۔

تئیسواں بند معنی: بت ہندی: ہندی تمدن۔ **مہجور نشیمن:** آشیانے سے جدا۔

مطلب: تمہاری حالت تو یہ ہے کہ قلیل عرصے کے لیے قومی افق پر ستاروں کی طرح سے روشن ہو گئے پھر ہندوستان کو اپنا وطن تصور کر کے تم اسی کے ہو رہے اور اپنے مذہبی و قومی تقاضوں کو قطعی فراموش کر دیا۔ دوسرے مقامات پر جانے کے لیے پر تولے تو گھر کو بھی تج دیا۔ تمہارے جو جس سال فرزند تمہاری ہی طرح بے عمل تو تھے ہی دیکھا دیکھی دین سے بدظن بھی ہو گئے۔

یہ وہی لوگ تھے جنہیں جدید تہذیب نے راہ سے بھٹکا دیا اور یہ پھر مادر پدر آزادی کے جویا بن گئے۔ حد تو یہ ہے کہ کعبہ کو چھوڑ کر انہوں نے بت خانے کو آباد کر لیا۔ مراد یہی ہے کہ انہیں نہ اسلاف کی عظمت اور کردار کا پاس رہا نا ہی وہ مذہبی اصولوں اور تعلیمات کے ہی قائل رہے۔

چوبیسواں بند معنی: زحمت کش تنہائی: تنہائی کی تکلیف۔ **بادیہ پیمانہ:** صحرا کو طے کرنے والا۔ **حجاب:** پردہ۔ **شکوۂ بیداد:** ظلم کی شکایت۔

مطلب: عصر موجود کے قیس کی مانند عاشق صادق ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن کسی نوع کی بھی سختی اٹھانے سے گریز کرتے ہیں۔ شہری زندگی کو اس لیے زیادہ پسند کرتے ہیں کہ یہاں کی زندگی عیش و عشرت سے مزین ہے۔ یہ عشق کے دعویدار صحرانوردی کے قریب نہیں پھٹکتے۔ اس کے برعکس اس نظریے کے قائل ہیں کہ قیس تو دیوانہ تھا وہ خواہ شہر میں بودوباش اختیار کرتا یا صحرا کی ریت پھانکتا اس سے اسے کیا فرق پڑ سکتا تھا البتہ لیلیٰ کو اس عشق میں جو صعوبت اٹھانا پڑیں ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ یہ نوجوان تو ایسی زندگی چاہتے ہیں جس میں مشکلات نہ ہوں جس میں عشق کی طرح حسن بھی آزاد ہو۔

پچیسواں بند معنی: عہد نو: دور جدید۔ **ایمن:** امن میں، محفوظ۔ **ملت ختم رسل ؐ:** مسلمان قوم۔ **شعلہ بہ پیراہن:** جس کے لباس میں آگ لگی ہوئی ہے۔

مطلب: عہد نو تو ایک ایسی بجلی کی مانند ہے جو ہر کھلیان کو پھونکنے کے لیے ہر لمحے آمادہ [illegible]۔ اس

بجلی سے کوئی صحرا اور کوئی گلستان محفوظ نہیں ہے اور سچ پوچھیے تو یہ ایک ایسی آگ کی طرح ہے جس کا ایندھن قدامت پرست اقوام کو قرار دیا جا سکتا ہے جس کے سبب نبی آخر الزماں کی امت کا پیراہن جل کر خاک ہو رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو قدامت پرست اقوام نئے زمانے کا ساتھ دینے سے عاری ہیں وہ ان کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس ساری صورت حال کے سبب مسلمانوں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ آج بھی ان میں اگر حضرت ابراہیم جیسے پیغمبروں کا عقیدہ پیدا ہو جائے تو پھر ان کے عہد کی طرح آگ گلستان میں ہو سکتی ہے۔

چھبیسواں بند معنی: کوکب: ستارہ۔ خس و خاشاک: گھاس پھوس۔ گل برانداز: پھول برسانا۔ عنابی: سرخ۔ افق تابی: افق کو روشن کرنا۔

مطلب: ملت مسلمہ کی جو ابتر صورت حال ہے اس کو دیکھ کر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ بے شک یہ چمن اجڑا ہوا ہے تاہم جلد ہی اس میں بہار آنے والی ہے۔ اب یہ چمن گھاس پھونس اور غیر ضروری اشیا سے پاک ہونے والا ہے۔ شہداء کے لہو کی سرخی اب یہاں پھول بکھیر رہی ہے۔ ذرا غور سے دیکھ کہ آسمان کا رنگ بڑی تیزی کے ساتھ عنابی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ اندھیری شب کے بعد سویرا نمودار ہونے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طلوع آفتاب کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں۔

ستائیسواں بند معنی: ثمر چیدہ: پھلوں سے لدی ہوئی (یعنی کامیاب)۔ کاہیدہ: سوکھے ہوئے۔ بالیدہ: سرسبز۔

مطلب: اس کائنات میں بے شمار قومیں ایسی ہیں جو اپنی جدوجہد کے طفیل سرخرو ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ ایسی اقوام بھی موجود ہیں جو اب بھی محرومی کا شکار ہیں۔ اور یوں لگتا ہے کہ خزاں ان کے چمن کا مقدر ہے۔ زندگی کہ ایک باغ کی مانند ہے اس میں بے شمار درخت ہیں جن میں سے بعض کمزور اور مرجھائے ہوئے ہیں جب کہ کچھ درخت شاداب اور سرسبز نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں سینکڑوں درخت تو ابھی باغ کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔ لیکن ان سب کے مقابلے میں شجر اسلام پھلنے پھولنے کے حوالے سے مثالی حیثیت کا حامل ہے کیوں نہ ہو جب کہ یہ صدیوں کی کاوش کا ثمر ہے۔

اٹھائیسواں بند معنی: گرد وطن: وطن کی مٹی۔ کنعاں: حضرت یوسفؑ کا وطن۔ نخل: درخت۔

مطلب: یہ امر باعث اطمینان ہے کہ تیرا دامن وطنیت کے تصور سے پاک ہے۔ تو تو ایسے یوسفؑ کی مانند ہے جس کے لیے مصر کی سرزمین بھی کنعان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان کا کوئی ملک وطن نہیں ہوتا بلکہ ہر خطہ زمین اس کے لیے وطن کی مانند ہے۔ اسی واسطے تیرا قافلہ کہیں رکے بغیر منزل کی جانب رواں دواں رہے گا۔ اس لیے کہ تو نے تو اپنے آپ کو ہر نوع کے ساز و سامان سے بے نیاز رکھا ہے۔

اے مسلمان! تیری مثال تو ایک ایسی موم بتی کی طرح ہے جس میں دھاگہ ایک رشتے کے مانند شعلے میں دوڑتا ہے۔ تیرے فکر و خیال کا عکس بھی اسی طرح دل انسان میں سوز اور تپش پیدا کرے گا۔

انتیسواں بند معنی: پیمانے: جام۔ یورش تاتار: تاتاریوں کا فتنہ۔

مطلب: زیر تشریح بند میں وطنیت کے تصور کی اسلامی نقطہ نظر سے وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

بالفرض سلطنت ایران کا خاتمہ ہو جائے تو اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اسلام اور مسلمان ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کی مثال شراب کا نشہ ہے جس کا عملاً پیمانے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ نشہ شراب میں ہوتا ہے نہ کہ پیمانے میں۔ یہ حقیقت تاتاریوں کے حملوں سے بھی کھل جاتی ہے کہ ایک زمانے میں انہوں نے بغداد اور کئی دوسرے اسلامی ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ پھر یہی تاتاری مغل اور ترکوں کے روپ میں ایشیا' افریقہ اور یورپ میں اسلام کے علمبردار بن گئے۔ جہاں تک تیری ذات کا تعلق ہے کہ سچائی کو زندہ رکھنے کے لیے تیری ذات ہی بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ اور یہ جو عصر نو ہے یہ تو ایک اندھیری رات کی طرح ہے اس میں تو ہی ہے جو ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔

تیسواں بند معنی: یورش بلغاری: بلغاریہ کا فتنہ (13-1912ء میں)۔ **صہیل فرس**: گھوڑے کی ہنہناہٹ۔ **نفس**: سانس۔

مطلب: ترکوں پر بلغاریہ کے عساکر نے جو یلغار کر رکھی ہے وہ تم لوگوں کے لیے جو غفلت کی نیند سو رہے ہو بیداری کا پیغام ہے۔ تیرا خیال ہے کہ ان حملوں کے باعث تیری دل آزاری مقصود ہے؟ نہیں! یہ تو دراصل تیرے ایثار اور خودداری کا امتحان ہے۔

نہ جانے تو دشمنوں کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے خوف زدہ کیوں ہو رہا ہے۔ ذرا بنظر غائر دیکھے تو تجھے خود ہی پتہ چل جائے گا کہ دشمنوں کی پھونکوں سے حق کا چراغ نہیں بجھ سکتا۔

اکتیسواں بند معنی: کوکب: ستارہ۔ **خلافت**: ۔ **اتمام**: تمام کرنا' تکمیل کرنا۔

مطلب: تو کیا ہے اور تیری حقیقت کیا ہے؟ یہ سب تو ابھی دوسری اقوام کی نگاہوں سے چھپا ہوا راز ہے۔ ورنہ امرواقعہ تو یہ ہے کہ ابھی اس دنیا کو تیری ضرورت ہے تجھ میں جو عمل کی حرارت موجود ہے وہی تو زمانے کو زندہ اور سرگرم رکھے ہوئے ہے۔ تیری خلافت و حکومت اس دنیا کے مقدر کا ستارہ ہیں کہ تو ختم ہو گیا تو یہ بھی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اے مسلمان! اٹھ سرگرم عمل ہو کہ فرصت کا وقت نہیں رب ذوالجلال نے تجھے جو ذمے داری سونپی ہے اس کی تکمیل تیرا فرض ہے خدا کی وحدانیت کو عام کرنے کا کام بھی باقی ہے۔

بتیسواں بند معنی: رخت بردوش: سامان کندھے پر اٹھائے ہوئے۔ **چمنستان**: باغ۔ **تنک مایہ**: بے مایہ۔

مطلب: تیری مثال تو اس خوشبو کے مانند ہے جو غنچے میں محبوس ہے تیرے لیے لازم ہے کہ اس قید سے رہا ہو کر گلستاں کی ہوا کے کاندھے پر سوار رخت سفر باندھ کر سارے عالم میں پھیل جا۔ اگر تو بے بضاعت اور بے مال و منال ہے تو ایسی صلاحیت پیدا کر کہ ذرے سے بیاباں میں تبدیل ہو جائے۔ اور اگر دریا کی موج کے نغمہ کے مماثل ہے تو اس حیثیت کو ترک کر کے طوفان کے ہنگامے کی شکل اختیار کر لے۔

تجھ میں جو عشق حقیقی کی قوت موجود ہے اس کی وساطت سے دنیا کی ہر ادنیٰ شے کو بلند کر دے اور اس تاریک زمانے میں آنحضرتؐ کے نام کی روشنی سے اجالا کر دے۔

تینتیسواں بند معنی: ترنم: سر' لے۔ **خم**: شراب کا مٹکا۔ **استادہ**: کھڑا ہوا۔ **تپش آمادہ**: حرارت

پذیر۔

مطلب: آنحضرتؐ کی ذات صفات کو پھول سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ پھول باغ میں نہ ہو تو بلبل نغمے الاپنا چھوڑ دے۔ دنیا کے باغ میں کلیوں کا تبسم بھی باقی نہ رہے۔ اگر آنحضرتؐ مے حقیقی نہ پلائیں تو نہ پیانہ ہو نہ صراحی! یہ جو وحدانیت کی محفل سجی ہوئی ہے یہ اور تم مسلمان بھی ناپید ہو جاؤ۔ آسمان اسی نام سے قائم ہے اور انسانی وجود میں جو حرارت ہے اس کا سبب بھی یہی نام ہے۔ مراد یہی ہے کہ آنحضرتؐ کے لیے ہی یہ دنیا پیدا کی گئی۔

چونتیسواں بند　معنی: بحر: سمندر۔ رفعت: بلندی۔

مطلب: یہ نام اور شخصیت جو پیغمبر آخر الزماںؐ کی ہے اس کا وجود ہر شے میں ہے۔ خواہ صحرا ہو، پہاڑ ہوں، میدان ہوں، سمندر اور اس کی موجوں کی آغوش میں یا طوفان میں سب میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ چین کے شہروں میں، مراکش کے بیابانوں میں اور اہل اسلام کے ایمان میں پوشیدہ ہے۔ دنیا بھر کی قومیں قیامت تک یہ منظر دیکھتی رہیں گی کہ رب ذوالجلال نے حضورؐ کا تذکرہ اور مرتبہ بلند رکھنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ کس انداز میں پورا کیا جاتا رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے نام کے ساتھ توحید اور رسالت بھی ہمیشہ قائم رہے گی اور یہ وعدہ ضرور پورا ہوتا رہے گا۔

پینتیسواں بند　معنی: مردم چشم زمیں: زمین کی آنکھ کی پتلی، (مراد افریقہ کی سیاہ فام قوم)۔ گرمی مہر: سورج کی گرمی۔ تپش اندوز: گرمی حاصل کرنے والی۔

مطلب: اس بند میں براعظم افریقہ کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ یہ خطہ ارض جسے "کالی دنیا" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس خطہ ارض پر بے شمار شہداء کی پرورش ہوئی ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جسے سورج کی حدت نے پرورش کیا ہے اور جو ملت مسلمہ کے پرچم سے متعلق ہے جس پر چاند ستارہ بنا ہے جسے اہل عشق حضرت بلال حبشیؓ سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ دنیا! آنحضورؐ کے نام سے ہی پارے کی مانند متحرک اور پرجوش ہے۔ اسی نام کے طفیل آنکھ کی پتلی کی طرح نور اور روشنی میں ڈوبی ہوئی ہے۔

چھتیسواں بند　معنی: سپر: ڈھال۔ ماسوا: اللہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لوح و قلم: قسمت کی تختی اور تقدیر کو رقم کرنے والا قلم۔

مطلب: اے ملت مسلمہ کے فرزند! عقل تیرے لیے ڈھال کی حیثیت رکھتی ہے اور عشق تیری تلوار ہے۔ اے میرے درویش! بے شک تیری حکومت و خلافت ساری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تیری تکبیر معبود حقیقی کے سوا اور سب کے لئے آگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر تو پکا اور پختہ عقیدہ مسلمان ہو جائے تو تیری تدبیر ہی تقدیر کا روپ دھار لے گی۔

سوائے عزیز! اگر تو نے میرے پیغمبر محمدؐ سے وفا کی اور ان کی تعلیمات کو اپنا شعار بنایا تو جان لے کہ ہم تیرے ہی ہیں اور یہ دنیا تو الگ رہی لوح و قلم بھی تیرے ہوں گے۔

122 ساقی

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
سحر قریب ہے، اللہ کا نام لے ساقی

*

معنی: ساقی: شراب پلانے والا۔ بادہ کش: شرابی۔ آبِ بقائے دوام: ہمیشہ زندہ رکھنے والا پانی۔

مطلب: یہ مختصر سی نظم محض تین اشعار پر مشتمل ہے۔ ان اشعار کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ لگانے میں کوئی قباحت نہیں ہو گی کہ اقبال نے اس نظم میں اپنے عہد کے بعض ایسے رہنماؤں پر طنز کی ہے جو ذاتی مفاد کے لیے اپنے پیروؤں کو مذہب اور سیاست کے نام پر استعمال کرتے تھے۔ فرماتے ہیں: شراب پلا کر ہر کوئی دوسرے کو بدمست اور مدہوش کر سکتا ہے اور اس بدمستی اور مدہوشی میں پھنے

والا زمین پر ہی گرتا ہے لیکن ساقی کا کام محض مدہوش کرنا ہی نہیں ہے بلکہ گرتے ہوؤں کو تھامنا بھی ہے۔ مطلب یہ کہ ذاتی مفاد کے لیے دوسروں کو پستی سے ہم کنار کرنا تو سب کو آتا ہے تاہم حقیقی رہنمائی کا لطف اس عمل میں ہے کہ پستی میں گرنے والے کو سہارا دے۔ پستی سے نجات دلائی جائے جو پرانے لوگ مے نوشی کے عادی تھے وہ تو بتدریج فنا کے گھاٹ اترتے جا رہے ہیں چنانچہ یہ امر اب لازم ہو گیا ہے کہ انہیں آب حیات پلا کر بقائے دوام سے ہم کنار کیا جائے۔

اے ساقی! تو نے اپنی ساری عمر تو اسی قسم کے ہنگاموں میں گزاری ہے اب جب کہ تو عمر کے آخری مراحل میں ہے سب ہنگامے چھوڑ کر اللہ اللہ کر لے کہ یہی آخرت میں کام آئے گا۔ مراد یہ ہے کہ خود ساختہ اور مفاد پرست رہنماؤں کا کردار عام لوگوں کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں۔ خدا کرے وہ عبرت حاصل کر سکیں۔

تعلیم اور اس کے نتائج

123

(تضمین بر شعر ملا عرشی)

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

"تخمِ دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو"

*

معنی: الحاد: دین سے پھرنا۔ پرویز: خسرو ثانی (شاہ ایران کا لقب)۔ تخم: بیج۔

مطلب: حصول تعلیم کے ضمن میں نوجوانوں نے جو ترقی کی وہ دوسروں کی طرح ہمارے لیے بھی مسرت و انبساط کا باعث ہے۔ مگر مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے ساتھ ہی فریاد بھی نکل جاتی ہے اس لیے کہ ہم تو یہی سوچتے تھے کہ تعلیم کے سبب قوم کی مشکلات دور ہوں گی لیکن اس کا علم نہ تھا کہ مروجہ تعلیم کے ہمراہ قوم کے نوجوانوں میں فراغت اور آسائش کے ساتھ کفر و الحاد بھی ان کے دلوں میں گھر کر لے گا۔ اس کی مثال تو ایسی کہ پرویز بادشاہ کے محل میں اس کی مطلوبہ محبوبہ شیریں آ تو گئی مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اپنے عشاق فرہاد کا تیشہ بھی ساتھ لے آئی۔ مراد یہ کہ تعلیم نے نوجوانوں کے ذہنوں کو قدرے جلاء تو بخشی لیکن انہیں کفر و الحاد سے بھی متاثر کر کے رکھ دیا۔

آخری شعر ایرانی شاعر ملا عرشی کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اب ہمیں کہیں سے نیا بیج لانا چاہیے اور اسے کاشت کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو بیج پہلے کاشت کیا تھا اس کی فصل کاٹنا باعث ندامت بن گیا ہے۔ یہاں ملا عرشی کا مختصر تعارف بے محل نہ ہو گا کہ وہ ایران کے صفوی بادشاہ طہماسپ کے دربار سے وابستہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑے زود گو شاعر تھے۔ ن کا دیوان دس ہزار اشعار پر مشتمل بتایا جاتا ہے۔

124

قربِ سلطان

تمیز حاکم و محکوم مٹ نہیں سکتی — مجال کیا کہ گداگر ہو شاہ کا ہمدوش
جہاں میں خواجہ پرستی ہے بندگی کا کمال — رضائے خواجہ طلب کن قبائے رنگیں پوش
مگر غرض جو حصولِ رضائے حاکم ہو — خطاب ملتا ہے منصب پرست و قوم فروش
پرانے طرزِ عمل میں ہزار مشکل ہے — نئے اصول سے خالی ہے فکر کی آغوش
مزا تو یہ ہے کہ یوں زیرِ آسماں رہیے — ہزار گونہ سخن در دہان و لب خاموش
یہی اصول ہے سرمایۂ سکونِ حیات — گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
مگر خروش پہ مائل ہے تو، تو بسم اللہ — بگیر بادۂ صافی، ببانگ چنگ بنوش
شریکِ بزمِ امیر و وزیر و سلطاں ہو — لڑا کے توڑ دے سنگِ ہوس سے شیشۂ ہوش
پیامِ مرشدِ شیراز بھی مگر سن لے — کہ ہے یہ سرِ نہاں خانۂ ضمیرِ سروش

محلِ نورِ تجلی است رائے انورِ شاہ
چو قربِ او طلبی در صفائے نیت کوش

*

اس دنیا کا نظام ہی اس طرز پر وضع کیا گیا ہے کہ حاکم و محکوم کے مابین جو امتیاز قائم کیا گیا وہ کسی طور پر بھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے یہ بات طے ہے کہ کوئی بھکاری بادشاہ کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں غلامی کا کمال ہی یہ ہے کہ آقا کی پرستش کی جائے اور اس کے احکامات بے چون وچرا مان لیے جائیں۔ کہ آقا کی خوشنودی کی صورت میں غلام سرخرو ہو سکتا ہے۔ تاہم مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی حاکم کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہاں ہو تو اسے عہدوں کا لالچی اور قوم فروش کہا جاتا ہے اور لوگ اسے معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

اب دیکھا جائے تو ماضی کے اصولوں پر عمل کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ جدید قواعد اور اصولوں میں فکر موجود ہی نہیں۔ لطف تو اسی صورت میں ہے کہ اس آسمان تلے رہائش کے دوران ہر چند کہ زبان پر ہزار ہا باتیں ہوں پھر بھی لب کشائی نہ کی جائے اور خاموشی اختیار کر لی جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی میں سکون و اطمینان کا ایک نسخہ خواجہ حافظ شیرازی نے اس طرح سے پیش کیا ہے کہ اے حافظ! بے شک تو ترک دنیا کر کے محض ایک گوشے میں پناہ لینے والا درویش ہے اس لیے تجھے شور و ہنگامہ بپا کرنے کی بجائے خاموش رہنا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر تو ہنگامہ کرنے پر تلا ہی ہوا ہے تو شوق سے کر۔ مگر اس کے لیے شراب خالص کا حصول ناگزیر ہے کہ سے راگ و رنگ کی محفل میں نوش جاں کیا جا سکے۔ شاہوں، وزیروں اور امیروں کی محفلوں میں شرکت اس طرح سے کر کہ اپنے فکر و شعور کو بھول جا اور محض اہل محفل کی خوشنودی کا خیال رکھ۔

اس ساری صورت حال کے باوجود شیراز کے مرشد کا یہ پیغام بھی بہ قائمی ہوش و حواس سن لے۔ عملاً یہ پیغام ایک ایسا راز ہے جو انسانوں کو خوش خبری دینے والے فرشتے کے ضمیر میں پوشیدہ ہے اور وہ

پیغام یہ ہے کہ شاہوں کی رائے پر تجلیوں کا نور برستا ہے۔ لہٰذا جب تو شاہ کی قربت میں بیٹھے تو ہمیشہ اپنی نیت کو صاف رکھ۔

دراصل یہ اشعار اقبال نے بظاہر تو بندہ و آقا کے مابین امتیاز کے حوالے سے کہے ہیں لیکن علاوہ مسئلہ جبر و قدر کو زیر بحث لاتے ہیں کہ فرد کے مقدر میں غلامی لکھی ہے تو اس پر قناعت ہی کی جا سکتی ہے۔

125 شاعر

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے — پی کے شراب لالہ گوں میکدۂ بہار سے
مست مے خرام کا سن تو ذرا پیام تو — زندہ وہی ہے، کام کچھ جس کو نہیں قرار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دخترِ خوش خرام ابر — کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے
جام شراب کوہ کے خمکدے سے اڑاتی ہے
پست و بلند کر کے طے کھیتوں کو جا پلاتی ہے

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری — ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں — کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری
اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگیِ دوام ہے — خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری
گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

*

پہلا بند معنی: جوئے سرود آفریں: نغمہ سناتی ہوئی ندی۔ **خمکدے:** شراب خانہ۔

مطلب: اس نظم میں بھی منظر نگاری اور امیجری اپنے کمال پر ہے۔ ندی اپنی تمامتر نغمہ ریزی کے ساتھ پہاڑ کی چٹانوں میں سے گزرتی بل کھاتی نیچے زمین کی طرف آ رہی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بہار کے موسم میں گل لالہ جیسی سرخ شراب پی کر مستی و مدہوشی کے عالم میں رواں دواں ہو۔ اس ندی کا پیغام سن۔ جو زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ اس دنیا میں وہی شے زندہ رہتی ہے جو سکون و ثبات کی بجائے حرکت و عمل کی قائل ہو۔

یہ خوبصورت چال والی بادل کی بیٹی ندی۔ اس طرح وادیوں کا طواف کرتی ہے جیسے کہ مرغزار کے سبزے سے عشق لڑا رہی ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ندی کوہسار کے میکدے سے شراب کے جام اڑا کر لاتی ہے اور پھر اونچے نیچے مقامات سے گزار کر کھیتوں تک جا پہنچتی ہے اور یہ شراب انہیں پلا دیتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ پہاڑی ندی چٹانوں سے گزرتی ہوئی جب وادی میں پہنچتی ہے تو کھیتوں کو سیراب کرتی ہے۔

دوسرا بند معنی: مزرع: کھیتی۔ **سخنوری:** مراد شاعری۔

مطلب: اس بند کے اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح ندی کے کردار کا ذکر اوپر کے شعروں میں کیا گیا ہے اسی منظر نامے میں اگر کسی دلنواز شاعر کی تخلیقات اور فکر کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اگر شاعر

بھی مبالغہ آرائی کی بجائے سچ کو اپنا شعار بنا لے اور اس سچ کے اظہار میں جراءت مندی سے کام لے تو حیات انسانی کے لیے مفید اور سودمند ثابت ہو سکتا ہے یعنی ندی تو صرف کھیتوں اور باغات کو سیراب کرتی ہے جب کہ شاعری فکر انسان اور کائنات کے لیے افادیت کا سبب بنتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ شاعر اگر حقیقت پسند ہے اور سچائی کے اظہار پر دسترس رکھتا ہے تو ایسے شاعر کے کلام سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی شان ظاہر ہوتی ہے خاص طور پر ان مراحل میں جب کہ اس کی قوم آزر کی طرح بت تراشی اور بت پرستی کی جانب مائل ہو جائے۔ چنانچہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے ان بتوں کو ریزہ ریزہ کر کے وحدانیت اور حق پرستی کا راستہ دکھایا تھا۔ شاعر بھی اپنی ملت کے لیے یہی کردار ادا کر سکتا ہے جو شاعری سچائی اور خون جگر سے پرورش پاتی ہے وہ سننے والوں کے لیے ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے اس گلستاں میں اگر شعر کی ندی نہ ہو یعنی شاعری نہ ہو تو پھر یہاں پھول، کلی، سبزہ اور چمن کا وجود بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

126 نوید صبح

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر — منزل ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر
محفل قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت — دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت
چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغام حیات — باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرام حیات
مسلم خوابیدہ اٹھ، ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق، گرم تقاضا تو بھی ہو

وسعت عالم میں رہ پیما ہو مثل آفتاب — دامن گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغ سحاب
کھینچ کر خنجر کرن کا، پھر ہو سرگرم ستیز — پھر سکھا تاریکی باطل کو آداب گریز
تو سراپا نور ہے خوشتر ہے عریانی تجھے — اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے
ہاں! نمایاں ہو کے برق دیدۂ نقاش ہو
اے دل کون و مکاں کے راز مضمر فاش ہو

*

پہلا بند معنی: ہنگامہ در دامن: اپنے دامن میں ہنگامے لیے ہوئے۔ **خاموشی سفر**: خاموشی رخصت ہو جاتی ہے۔

مطلب: زیر تشریح نظم دو بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند کا آغاز اقبال اس انداز سے کرتے ہیں کہ جس گھڑی مشرق کی جانب سے صبح اپنے دامن میں ہنگامے لیے آتی ہے اس وقت کائنات سے خامشی رخصت ہو جاتی ہے۔ ساری فضاء پر جو سکوت چھایا ہوا ہوتا ہے وہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور کائنات میں موجود ہر شے اپنی زندگی کا ثبوت فراہم کرنے لگتی ہے جوں ہی ہر جانب سے زندگی کا پیغام ملنے لگتا ہے تو پرندے بھی چہچہانے لگتے ہیں اور پھول بھی اپنی شگفتگی سے اپنے وجود سے آگاہ کر دیتے ہیں۔

سو جب کائنات کی ہر شے سرگرم عمل ہے تو اے مسلمان! تو بھی اپنی نیند سے بیدار ہو جا کہ مشرق میں افق کی روشنی پھیل رہی ہے لہٰذا دوسرے عناصر کی طرح تو بھی مصروف عمل ہو جا۔

دوسرا بند معنی: سرگرم ستیز: جنگ میں مصروف۔

مطلب: اے مسلمان! تو بھی سورج کی مانند کائنات کی وسعت میں اپنے سفر کا آغاز کر دے تاکہ آسمان پر بادلوں کے جو داغ احاطہ کیے ہوئے ہیں وہ مٹ جائیں۔ سورج کی کرنوں کی طرح تو بھی اپنے خنجر کو تیز کر لے اور باطل کے خلاف اعلان جنگ کر دے کہ وہ حق کے مقابلے میں فرار پر مجبور ہو جائے۔ آج باطل کے اندھیرے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اگر تو سرگرم عمل ہو جائے تو حق کی فتح لازمی ہے اور اس کی روشنی ہر طرف پھیل سکتی ہے۔ تو کہ سر سے پا تک روشنی ہے تجھے تو اپنے وجود کو نمایاں کرنا چاہیے اور اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنا چاہیے۔

اگر باطل کو چمگادڑ یعنی اندھیرا تسلیم کر لیا جائے تو اے مسلمان تو اس پر اپنی روشنی سے حملہ آور ہو تاکہ باطل کی تاریکی ختم ہو کر رہ جائے۔

127 دعا

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

پھر وادیِ فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے، پھر ذوقِ تقاضا دے

محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو، پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو، پھر وسعتِ صحرا دے

پیدا دلِ ویراں میں، پھر شورشِ محشر کر
اس محملِ خالی کو، پھر شاہدِ لیلا دے

اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے، جو چاند کو شرما دے

رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر
خودداریِ ساحل دے، آزادیِ دریا دے

بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر، دل صورتِ مینا دے

احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

*

① سے ⑤ **معنی:** فاراں: پہاڑ کا نام ہے۔ دیدۂ بینا: دیکھنے والی آنکھ۔ آہو: ہرن۔ خوگر: عادی۔

مطلب: اس نظم میں اقبال بارگاہ الٰہی میں یوں دعا گو ہیں کہ اے مالک جہاں! مسلمانوں کے دلوں میں ایسی بیدار تمنائیں پیدا کر جو ہر قلب کو مضطرب کر دے اور ان کی روح کو تڑپا کر رکھ دے۔ اے مولا! ایک بار پھر حرم کعبہ کے ایک ایک ذرے کو منور کر دے اور مسلمانوں کے دلوں میں وہ شوق پیدا کر دے جو اس روشنی کو اپنے اندر جذب کرنے کا سبب بن سکے۔ وہ لوگ جو چشم بصیرت سے محروم ہو چکے ہیں انہیں بصیرت کے ساتھ بصارت بھی عطا کر۔ اور میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ دوسرے مسلمانوں کو بھی

دکھا دے۔ مسلمان آج ایک گم کردہ راہ ہرن کی طرح ہے۔ اسے پھر سے حرم کعبہ کی طرف لوٹا دے اور اس کی فکر کو صحرا جیسی وسعت عطا کر دے۔ اس اجڑے ہوئے دل میں پھر سے حشر بپا کر دے اس کے خالی کجاوے کو لیلیٰ جیسا محبوب عنایت فرما۔

⑥ سے ⑩ **معنی:** **رفعت:** بلندی۔ **مینا:** شیشہ، صراحی۔

مطلب: یہ دور تاریکی کا دور ہے جس میں کسی کو کچھ نہیں سوجھ رہا۔ اسی سبب مسلمانوں کے دل ابتری کا شکار ہیں۔ ان دلوں کو ایسا داغ محبت دے جو چاند کو بھی شرما دے۔ ان کے جو مقاصد ہیں ان کو ثریا کی سی بلندی عطا کر۔ ان کو ساحل جیسی خودداری اور دریا کی روانی جیسی آزادی بخش دے۔ ان مسلمانوں کے دلوں میں ایسی محبت موجزن ہو جو بالکل بے لوث ہو جس میں لالچ اور ہوس کا شائبہ تک نہ ہو۔ مزید یہ کہ انہیں بے خوف و خطر سچ بولنے کی توفیق عطا فرما۔ ان کے دلوں میں اجالا پیدا کر دے اور دلوں کو وہ صلاحیت دے جو دوسروں کو فیض پہنچا سکے۔ مسلمان آج مصائب و آلام میں گھرے ہوئے ہیں لیکن بے حسی کا شکار ہیں۔ خدایا انہیں مصائب سے متنبہ کر اور حال کے ہنگاموں کے پس منظر میں مستقبل کی فکر عطا کر۔

اقبال کہتے ہیں اے آقا! میں تو ایک ویران باغ میں نالہ و فریاد کرنے والا بلبل کی طرح ہوں جس کی گریہ و زاری میں تاثیر باقی نہیں رہی چنانچہ اے ہر فرد کی حاجت روائی کرنے والے میں تجھ سے اپنی تاثیر کا طلبگار ہوں۔

128 عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں

یہ شالامار میں اک برگ زرد کہتا تھا
گیا وہ موسم گل جس کا رازدار ہوں میں

نہ پائمال کریں مجھ کو زائران چمن
انہیں کی شاخ نشیمن کی یادگار ہوں میں

ذرا سے پتے نے بے تاب کر دیا دل کو
چمن میں آ کے سراپا غم بہار ہوں میں

خزاں میں مجھکو رلاتی ہے یاد فصل بہار
خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں میں

اجاڑ ہو گئے عہد کہن کے مے خانے
گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار ہوں میں

پیام عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

*

چھ اشعار پر مشتمل اس مختصر سی نظم میں اقبال ایک مخصوص صورت حال کے پس منظر میں غم و الم کی تصویر بنے آتے ہیں۔ یوں بھی عید پر شعر کہنے کی فرمائش کے جواب میں انہوں نے یہاں جو کچھ کہا ہے اسے ایک معذرت نامے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

معنی: **برگ زرد:** زرد رنگ کا پتا۔ **زائران چمن:** باغ کی سیر کرنے والے۔ **ہلال عید:** عید کا چاند۔

مطلب: مغلوں کے خوبصورت باغ شالامار میں سیر کے لیے گیا تو کسی درخت کے ایک مرجھائے ہوئے زرد پتے نے زبان حال سے کہا کہ وہ بہار اور شان و شوکت کا زمانہ تو رخصت ہو گیا جس کا میں چشم دید گواہ

اور رازدار ہوں۔ باغ میں سیر کو آنے والے لوگ مجھے یوں اپنے قدموں تلے نہ روند ڈالیں کہ میں اس درخت سے شاخ کا جزو ہوں جس پر کبھی ان کا نشیمن ہوا کرتا تھا یعنی میں بھی اس گزری ہوئی شان و شوکت کا مظہر ہوں جو کبھی ملت اسلامیہ کی عظمت کا حصہ تھی۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس ذرا سے پتے کی زبان حال سے فریاد نے میرے دل کو اضطراب سے دوچار کر دیا اور یہاں باغ میں سیر سے لطف اندوز ہونے کی بجائے مذکورہ فریاد سن کر دل بے چین ہو کر رہ گیا اور قلبی مسرت غم کے سانچے میں ڈھل گئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں خزاں کے دور میں بہار کے موسم کو یاد کر کے اشک بار ہوتا ہوں۔ اس غم انگیز کیفیت میں مجھے عید کی کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ میں تو ماضی کی یاد میں پہلے ہی سوگوار رہوں۔ ملت اسلامیہ کی عظمت و شان کا وہ دور ختم ہو چکا جس کی یادگار کے طور پر میں ابھی تک بقید حیات ہوں۔

اس کیفیت میں عید کا چاند عیش و مسرت کا مژدہ سنا کر دراصل ہمارا مذاق اڑاتا ہے۔

129 فاطمہ بنت عبداللہ

(عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی

1912ء

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موج نور
جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے جن کی ضو ناآشنا ہے قید صبح و شام سے
جن کی تابانی میں انداز کہن بھی، نو بھی ہے
اور تیرے کوکب تقدیر کا پرتو بھی ہے

*

پہلا بند معنی: امت مرحوم: مراد ہے ملت اسلامیہ۔ **سقائی:** پانی پلانا۔ **خاکستر:** راکھ۔ **آہو:** ہرن۔

مطلب: مندرجہ بالا نوٹ میں علامہ اقبال نے خود اس نظم کی شان نزول کی جانب اشارہ کیا ہے۔ زیر

تشریح بند کا آغاز کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں اے فاطمہ بنت عبداللہ تو اس امت کی عزت و آبرو ہے جس پر باری تعالیٰ نے اپنی رحمت کا نزول فرمایا۔ سچ تو یہ ہے کہ تیرے جسم کا ذرہ ذرہ تمام گناہوں سے پاک و منزہ ہے۔ اے حور صحرائی! دراصل یہ سعادت تیرے حصے میں ہی آئی تھی کہ دین کی راہ میں جان نثار کرنے والوں اور فاتح جوانوں کو میدان کارزار میں پانی پلانے کا شرف حاصل کرے۔

سچ تو یہ ہے کہ تو نے اللہ کی راہ میں کسی تلوار اور ڈھال کے بغیر حیرت انگیز طور پر بڑی جی داری کے ساتھ جہاد کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوق شہادت نے تجھ کس جراءت مند اور بہادر بنا دیا تھا۔ تیری مختصر زندگی اور موت کے پیش نظر حیرت زدہ ہو کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدایا! ہمارے اجڑے ہوئے باغ میں ایسی کلی بھی موجود تھی؟ یہی نہیں بلکہ ملت اسلامیہ جو دیکھا جائے تو راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ اس ڈھیر میں ایسی تابناک اور باطل کو جلا دینے والی چنگاری بھی موجود تھی۔

لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے صحرا میں اتنے جیالے آہو ابھی تک چھپے ہوئے ہیں اور جو بادل برس چکا ہے اس میں ابھی تک بجلیاں چھپی ہوئی ہیں۔ مراد یہ کہ قوم میں ابھی بھی جوہر قابل اور جاں نثاروں کی کمی نہیں ہے۔

دوسرا بند معنی: خانہ ایام: زمانے کا اندھیرا۔

مطلب: اے فاطمہ! ہرچند کہ تیرے غم میں ہماری آنکھیں اشکبار ہیں لیکن آہ و زاری کے ان مراحل میں کچھ طمانیت بخش پہلو بھی موجود ہیں۔ تیری حیات اور موت کے واقعات ہمارے لیے بے حد حوصلہ افزا ہیں۔ تیری خاک کا ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے معمور ہے۔ تیری قبر کا سکوت بھی ایک ہنگامے کا پتہ دیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس قبر کی آغوش میں ایک نئی اور زندہ قوم پرورش پا رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں اس نئی قوم کی وسعت اور اس کے بنیادی مقاصد سے آگاہی نہیں رکھتا۔ تاہم اس قدر یقین ہے کہ اس نئی قوم کی پیدائش اور آغاز تیری ہی قبر سے ہو رہا ہے۔

اے فاطمہ بنت عبداللہ! میری چشم بصیرت افروز اس حقیقت کا نظارہ کر رہی ہے کہ آسمان پر ایک نئے اور تابندہ ستارے کا ظہور ہو رہا ہے۔ ہرچند کہ عام انسان کی نظروں کو اس کا ادراک نہیں ہے۔ یہ محض ایک ستارہ نہیں بلکہ بہت سے ستارے ہیں۔ یہ ستارے ابھی وقت اور ماحول کے اندھیرے سے نمودار ہو رہے ہیں۔ ان کی روشنی ابھی تک دن رات اور صبح و شام کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ مراد یہ ہے کہ ملت مسلمہ کے لیے عروج و ارتقا کے نئے مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں تاکہ وہ حال کے ساتھ اپنے مستقبل کی تعمیر کر سکے۔

اے فاطمہ بنت عبداللہ! یہ جو ستارے نمودار ہو رہے ہیں ان کی روشنی اور چمک دمک میں قدیم اور نئے انداز کے ساتھ تیرے مقدر کے ستارے کا عکس بھی موجود ہے۔

شبنم اور ستارے

130

اک رات یہ کہنے لگے شبنم سے ستارے ہر صبح نئے تجھ کو میسر ہیں نظارے
کیا جانیے تو کتنے جہاں دیکھ چکی ہے جو بن کے مٹے ان کے نشاں دیکھ چکی ہے

زہرہ نے سنی ہے یہ خبر ایک ملک سے . انسانوں کی بستی ہے بہت دور فلک سے
کہ ہم سے بھی اس کشور دلکش کا فسانہ
گاتا ہے قمر جس کی محبت کا ترانہ

اے تارو! نہ پوچھو چمنستان جہاں کی
گلشن نہیں، اک بستی ہے وہ آہ و فغاں کی
آتی ہے صبا واں سے پلٹ جانے کی خاطر
بیچاری کلی کھلتی ہے مرجھانے کی خاطر
کیا تم سے کہوں کیا چمن افروز کلی ہے
ننھا سا کوئی شعلہ بے سوز کلی ہے
گل نالہ بلبل کی صدا سن نہیں سکتا
دامن سے مرے موتیوں کو چن نہیں سکتا
ہیں مرغ نوا ریز گرفتار، غضب ہے
اگتے ہیں تہ سایہ گل خار، غضب ہے
رہتی ہے سدا نرگس بیمار کی تر آنکھ
دل طالب نظارہ ہے، محروم نظر آنکھ
دل سوختہ گرمی فریاد ہے شمشاد
زندانی ہے اور نام کو آزاد ہے شمشاد
تارے شرر آہ ہیں انساں کی زباں میں
میں گریہ گردوں ہوں گلستاں کی زباں میں
نادانی ہے یہ گرد زمیں طوف قمر کا
سمجھا ہے کہ درماں ہے وہاں داغ جگر کا
بنیاد ہے کاشانہ عالم کی ہوا پر
فریاد کی تصویر ہے قرطاس فضا پر

*

پہلا بند معنی: زہرہ: ایک مشہور ستارہ۔ اسے رقاصہ فلک بھی کہتے ہیں۔

مطلب: یہ ایک رات کا ذکر ہے کہ ستاروں نے شبنم سے مخاطب ہو کر کہا۔ تجھ کو ہر صبح نئے نئے نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ نہ جانے تو اب تک کتنی دنیائیں دیکھ چکی ہے۔ جو چیزیں عروج پا کر زوال کا شکار ہو چکی ہیں تو نے تو ان کی افتاد کا نظارہ بھی کیا ہے۔ اے شبنم! زہرہ ستارے نے کسی فرشتے سے یہ خبر سنی ہے کہ انسان جس دنیا میں آباد ہیں وہ آسمان سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔

اے شبنم! چونکہ تو انسانوں کی اس دلکش بستی کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ چاند بھی جس کی محبت کے نغمے گاتا ہے اس کا احوال سنا۔

دوسرا بند معنی: چمن افروز: باغ کی زینت۔ شعلہ بے سوز کلی: ایک چنگاری ہے جس میں جلن نہیں ہے۔ مرغ نوا ریز: نغمے گانے والے پرندے۔ تہ سایہ گل: پھول کے سائے میں۔ درماں: علاج۔ قرطاس: صفحہ۔

مطلب: ستاروں کی زبانی یہ بات سن کر شبنم نے جواباً کہا کہ اے ستارو! تم انسانی دنیا کے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ وہ کوئی شگفتہ باغ نہیں بلکہ ایسی بستی ہے جو آہ و فغاں سے عبارت ہے وہاں صبا محض اس لیے آتی ہے کہ مایوس ہو کر واپس لوٹ جائے اور باغوں میں کلی صرف مرجھانے کی خاطر ہی کھلتی ہے۔ اس کلی کا احوال تم سے کیا کہوں کہ وہ کس طرح باغ کی آرائش کا سامان بنتی ہے۔ وہ تو شاید ایک ایسا ننھا سا شعلہ ہے جو تپش سے محروم ہے۔

اس دنیا میں پھول اس قدر مجبور ہے کہ اسے نالہ بلبل بھی سنائی نہیں دیتا۔ میں خود اس کے دامن

میں موتیوں کی طرح گرتی ہوں لیکن وہ انہیں بھی نہیں چن سکتا۔ اس بستی میں تو نغمے الاپنے والے پرندوں کو بھی قیدی بنا لیا جاتا ہے۔ حیرت تو یہ کہ وہاں پھولوں کے زیر سایہ کانٹے اگتے ہیں۔ نرگس کے پھول نظارے کی تڑپ تو رکھتے ہیں لیکن ان کی آنکھیں بصارت سے محروم ہیں۔ شمشاد کا درخت فریاد کی حدت سے تپش آمادہ رہتا ہے۔ بظاہر وہ آزاد ہے پھر بھی قیدی کی حیثیت کا حامل ہے۔ خوبصورت ستارے بھی انسان کی زبان میں آہوں کے شرارے ہیں اور اہل گلشن بجھے بجھے آسمان کے آنسوؤں سے تعبیر کرتے ہیں۔ چاند جو زمین کی محبت میں گرفتار ہو کر وہاں کا طواف کرتا ہے نادان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جہان فانی کی بنیاد محض ہوا پر قائم ہے۔ اور یہ درحقیقت غم و اندوہ اور نالہ و فغاں کا مرقع ہے۔ اس نظم میں اقبال نے دنیا کی بے ثباتی کی تصویر کشی کی ہے۔

131 محاصرۂ ادرنہ

یورپ میں جس گھڑی حق و باطل کی چھڑ گئی — حق خنجر آزمائی پہ مجبور ہو گیا
گرد صلیب، گرد قمر حلقہ زن ہوئی — شکری حصار درنہ میں محصور ہو گیا
مسلم سپاہیوں کے ذخیرے ہوئے تمام — روئے امید آنکھ سے مستور ہو گیا
آخر امیر عسکر ترکی کے حکم سے — "آئین جنگ" شہر کا دستور ہو گیا
ہر شے ہوئی ذخیرۂ لشکر میں منتقل — شاہیں گدائے دانۂ عصفور ہو گیا
لیکن فقیہ شہر نے جس دم سنی یہ بات — گرما کے مثل صاعقۂ طور ہو گیا
ذمی کا مال لشکر مسلم پہ ہے حرام — فتویٰ تمام شہر میں مشہور ہو گیا
چھوتی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج
مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا

*

علامہ اقبال نے یہ نظم اس جنگ کے پس منظر میں تخلیق کی ہے جو ترکی پر 1913ء میں بلغاریہ اور سرویا کے مشترکہ حملے کے سبب وقوع پذیر ہوئی۔ ان دونوں ممالک نے ادرنہ پر حملے کر کے اسے فتح کر لیا لیکن چند ماہ کے بعد ترک سپہ سالار انور پاشا نے اس شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ دراصل ادرنہ وہ شہر تھا جو فتح قسطنطنیہ سے قبل ترکی عثمانیہ سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ اسی سبب اس عہد میں ادرنہ کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

① سے ④ **معنی:** صلیب: سولی۔ آئین جنگ: فوجی قانون یا مارشل لاء۔

مطلب: چنانچہ نظم کا آغاز کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ یورپ میں جس لمحے حق و باطل کے مابین جنگ چھڑ گئی تو حق کو بھی مجبور ہونا پڑا کہ باطل کے خلاف تلوار اٹھائے۔ مراد یہ ہے کہ بلغاریہ اور سرویہ کی افواج نے جس وقت ترکی کے دارالحکومت ادرنہ پر حملہ کیا تو عثمانی سلطنت کے عساکر بھی ان کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ صلیبی یعنی عیسائی افواج نے جب مسلم علاقے کا محاصرہ کر لیا تو ترک سالار اپنی فوجی قوت کو مجتمع کر کے ادرنہ کے قلعہ میں محصور ہو گیا اور دشمن کے خلاف مختصر فوج کے باوجود اس بے

جگری سے مزاحمت کی کہ عیسائی سالار بھی اسے داد دینے پر مجبور ہو گئے۔
اس معرکے نے اتنا طول پکڑا کہ مسلمانوں کے پاس سامان رسد ختم ہو گیا اور فوجی بھوکوں مرنے لگے۔ باہر سے کمک کی کوئی توقع نہیں تھی آخر کار مجبور ہو کر شکری پاشا نے حکم جاری کیا کہ جنگ کے قانون کے مطابق شہریوں سے جبراً سامان خوراک حاصل کر لیا جائے۔ اس حکم کی رو سے اسلامی لشکر نے عام لوگوں سے خوراک کے ذخیرے حاصل کر کے جمع کر لیے۔

⑤ سے ⑧ معنی: منتقل: ایک جگہ سے دوسری جگہ لانا۔ **عصفور:** چڑیا۔ **فقیہ شہر:** شہر کا مفتی۔ **صاعقہ:** چمکنے والی بجلی۔ **ذمی:** وہ غیر مسلم جس کی حفاظت کا ذمہ مسلم حکومت نے اٹھایا ہے۔

مطلب: جب تمام سامان رسد لشکر کے ذخیرے میں منتقل ہو گیا تو عمومی سطح پر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانے لگا کہ "شاہیں جو تھا وہ چڑیوں کی خوراک کا بھکاری بن گیا ہے"۔ مراد یہ کہ مسلمان فوجی جو بے حد جی دار اور جراءت مند ہونے کے ساتھ بلند حوصلہ بھی رکھتے تھے انہوں نے آخر کار بھوک سے مجبور ہو کر عام لوگوں کے کھانے پینے کا سامان بھی قبضے میں لے لیا ہے۔
تاہم جب یہ خبر شہر کے مفتی تک پہنچی تو وہ اس قدر غضبناک ہوا کہ فوری طور پر ترک لشکر کے حکم کے خلاف فتویٰ جاری کیا جس کی رو سے اسلامی آئین کے مطابق پناہ میں آئے ہوئے غیر مسلموں کا مال مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیا گیا۔ یہ فتویٰ آناً "فاناً" سارے شہر کے لوگوں کے مابین پھیل گیا۔ حتیٰ کہ ترک سپاہیوں تک بھی یہ خبر پہنچ گئی۔
اس فتوے کی جاری ہونے کے بعد اس پر فوری طور پر عمل شروع ہو گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ترک فوجیوں نے ادرنہ میں رہنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کے مال و متاع کو ہاتھ لگانے تک سے انکار کر دیا۔ اور یوں مسلمان اپنی شدید ضرورتوں کے باوجود اس حکم خداوندی کی پیروی پر مجبور ہو گئے۔ جو مفتی شہر کی وساطت سے ان تک پہنچا تھا۔

132 غلام قادر رہیلہ

رہیلہ کس قدر ظالم، جفا جو، کینہ پرور تھا
نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے

دیا اہل حرم کو رقص کا فرماں ستمگر نے
یہ انداز ستم کچھ کم نہ تھا آثار محشر سے

بھلا تعمیل اس فرمان غیرت کش کی ممکن تھی
شہنشاہی حرم کی نازنینان سمن بر سے

بنایا آہ! سامان طرب بیدرد نے ان کو
نہاں تھا حسن جن کا چشم مہر و ماہ و اختر سے

لرزتے تھے دل نازک، قدم مجبور جنبش تھے
رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدۂ تر سے

یونہیں کچھ دیر تک محو نظر آنکھیں رہیں اس کی
کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بار مغفر سے

کمر سے اٹھ کے تیغ جانستاں آتش فشاں کھولی
سبق آموز تابانی ہوں انجم جس کے جوہر سے

رکھا خنجر کو آگے، اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا
تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشم احمر سے

بجھائے خواب کے پانی نے اخگر اس کی آنکھوں کے
نظر شرما گئی ظالم کی درد انگیز منظر سے

پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے
شکایت چاہیے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے

مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی، تکلف تھا کہ غفلت دور ہے شانِ صف آرایانِ لشکر سے
یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

*

غلام قادر رہیلہ، رہیل کھنڈ کے سردار ضابطہ خاں کا بیٹا اور نجیب الدولہ کا پوتا تھا۔ تاریخی اعتبار سے نجیب الدولہ ان مسلم سرداروں میں سے ایک تھا جنھوں نے مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مرہٹوں نے جو ہزیمت اٹھائی جس کا بدلہ انہوں نے نجیب الدولہ کے انتقال کے فوراً بعد لیا۔ بد قسمتی سے روہیل کھنڈ پر حملہ آور ہونے اور یہاں قتل و غارت کا بازار گرم کرنے کے عمل میں مغلیہ تاجدار شاہ عالم ثانی کی فوجیں بھی مرہٹوں کے ساتھ شامل تھیں۔ غلام قادر رہیلہ اس وقت چھوٹا سا تھا جب جوان ہوا تو اس نے دہلی پر قبضہ کر کے شاہ عالم ثانی کی انتقاماً آنکھیں نکال لیں۔ بعد میں وہ مرہٹوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

① سے ⑧ **معنی**: **رہیلہ**: غلام قادر۔ **شاہ تیموری**: شاہ عالم ثانی۔ **سمن بر**: چنبیلی جیسے جسم والی۔ **بار مغفر**: خود' لڑائی میں سر پر پہننے کی فولادی ٹوپی۔ **چشم احمر**: سرخ آنکھ۔

مطلب: چنانچہ اس تاریخی پس منظر کے حوالے سے زیر تشریح نظم میں اقبال کہتے ہیں کہ غلام قادر رہیلہ اس قدر ظالم، ستم شعار اور جفاجو تھا کہ مغل تاجدار شاہ عالم ثانی کی آنکھیں انتقاماً خنجر سے نکال لیں۔ یہی نہیں بلکہ بعد میں اس نے شاہی خاندان کی خواتین کو اپنے روبرو رقص کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم ظاہر ہے کہ انتہائی ظالمانہ اور محشر خیز تھا۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ اس نے یہ سب کچھ انتقاماً کیا اور شاہی خاندان کی ان خواتین کی بے حرمتی کی جن کو سب عزت و احترام سے دیکھتے تھے۔ اور جو کبھی کسی نامحرم کے سامنے بھی نہ آئی تھیں۔ اس ظالم نے اپنی انا کی تسکین کے لیے ان خواتین کو رقص پر مجبور کیا جن کا آنچل تک چشم فلک نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس عمل کے دوران شہزادیوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور شرم و حیا کی شدت سے جسم لرز رہے تھے۔ غلام قادر رہیلہ کچھ دیر تک تو یہ منظر دیکھتا رہا پھر اس کے بعد اس نے گھبرا کر سر سے اپنا خود اتار لیا۔ اور پھر کمر سے تلوار بھی کھول لی۔ اس کے بعد اس نے خنجر کو کچھ سوچتے ہوئے اپنے سامنے قالین پر رکھ لیا۔ اور بظاہر اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے کہ اسے غنودگی نے بری طرح سے گھیر لیا ہو۔

⑨ سے (13) **معنی**: **اخگر**: شعلہ۔ **حمیت**: غیرت۔

مطلب: یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قدر ظالم اور سنگدل ہونے کے باوجود غلام قادر رہیلہ داخلی طور پر انتہائی شرمسار تھا۔ اس کے بعد وہ تھوڑی دیر تک اسی عالم میں آنکھیں بند کیے ہوئے پڑا رہا لیکن کب تک۔ آخر کار وہ اپنا سر جھٹک کر اس طرح اٹھ بیٹھا جیسے نیند سے بیدار ہو۔

چند لمحے بعد وہ شاہی محل کی خواتین کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ تمہیں اپنے مقدر کی شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ میں جس انداز میں مسند پر بظاہر محو خواب تھا یہ تو ایک بناوٹ تھی اور دکھاوے کی نیند تھی۔ اس

لیے کہ جنگ جو سرداران لشکر کبھی اس طرح سے غفلت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ میں تو محض یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم تیمور کی بیٹیوں میں کوئی حوصلہ مند ایسی بھی ہو جو مجھے غفلت کے عالم میں موت کے گھاٹ اتار دے مگر یوں لگتا ہے کہ جس چیز کا غیرت و حمیت نام تھا وہ تیمور کے خاندان سے رخصت ہو گئی۔

133 ایک مکالمہ

اک مرغ سرا نے یہ کہا مرغ ہوا سے
پردار اگر تو ہے، تو کیا میں نہیں پردار
گر تو ہے ہوا گیر، تو ہوں میں بھی ہوا گیر
آزاد اگر تو ہے، نہیں میں بھی گرفتار
پرواز خصوصیت ہر صاحب پر ہے
کیوں رہتے ہیں مرغان ہوا مائل پندار
مجروح حمیت جو ہوئی مرغ ہوا کی
یوں کہنے لگا سن کے یہ گفتار دل آزار
کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد ہے تو بھی
حد ہے تری پرواز کی لیکن سر دیوار
واقف نہیں تو ہمت مرغان ہوا سے
تو خاک نشیمن، انہیں گردوں سے سروکار
تو مرغ سرائی، خورش از خاک بجوئی
ما در صدد دانہ بانجم زدہ منقار

*

ہر دانشور کا طرز عمل بالعموم یہی ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے نتائج اخذ کرے چنانچہ اقبال کی بے شمار نظمیں اسی طرز عمل کی آئینہ دار ہیں۔ وہ معمولی کرداروں اور چھوٹی چھوٹی اشیا کی فطرت اور کارکردگی کا مطالعہ و مشاہدہ کرتے ہیں پھر ان کا تجزیہ کر کے اظہار کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ زیر تشریح نظم میں بھی کم و بیش ایک جیسے دو پرندوں کی فطرت اور کردار کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کا مطالعہ و مشاہدہ اس "مکالمہ" کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

① **معنی:** **مرغ سرا:** گھریلو پرندہ۔ **مرغ ہوا:** فضا میں اڑنے والا پرندہ۔ **مائل پندار:** مغرور۔ **مجروح:** زخمی۔ **حمیت:** غیرت۔ **خورش:** خوراک۔ **ما در صدد دانہ بانجم زدہ منقار:** ہم ستاروں کو دانہ سمجھ کر چونچ مارتے ہیں۔

مطلب: ایک گھر میں پلنے والے پرندے نے اڑنے والے پرندے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں بھی مرتبے میں تجھ سے کم تر نہیں ہوں۔ اس لیے کہ اگر تو پر رکھتا ہے تو میرے جسم میں بھی پر موجود ہیں۔ اگر تو ہوا میں اڑ سکتا ہے تو کیا میں پرواز کا اہل نہیں ہوں۔ جب کہ پرواز تو ہر پرندے کی فطرت میں شامل ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جو پرندے فضاء میں اڑنے والے ہیں وہ اتنے مغرور کس لیے ہیں۔

گھریلو پرندے کی ان باتوں سے فضا میں اڑنے والے پرندے کے دل کو ٹھیس پہنچی تو وہ یوں گویا ہوا بے شک تو بھی پرواز کے عمل میں آزاد ہے لیکن تیری رسائی زیادہ سے دیوار تک ہے۔ دراصل تو فضاء میں اڑنے والے پرندوں کی ہمت و حوصلے سے آگاہ نہیں۔ تو نے تو زمین پر بسیرا کر رکھا ہے جب کہ میں آسمان تک کی خبر لاتا ہوں۔ تو اپنی خوراک مٹی سے حاصل کرتا ہے جب میں تو ستارہ تک کو دانہ سمجھ کر اپنی خوراک کے لیے نشانہ بنا سکتا ہوں۔

134 میں اور تو

مذاق دید سے نا آشنا نظر ہے مری — تری نگاہ ہے فطرت کی رازداں' پھر کیا؟
رہین شکوۂ ایام ہے زباں مری — تری مراد پہ ہے دور آسماں' پھر کیا؟
رکھا مجھے چمن آوارہ مثل موج نسیم — عطا فلک نے کیا تجھکو آشیاں' پھر کیا؟
فزوں ہے سود سے سرمایہ حیات ترا — مرے نصیب میں ہے کاوش زیاں' پھر کیا؟
ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں تیرے طیارے — مرا جہاز ہے محروم بادباں' پھر کیا؟
قوی شدیم' چہ شد؟ ناتواں شدیم' چہ شد؟ — چنیں شدیم' چہ شد؟ یا چناں شدیم' چہ شد؟
بہیچ گونہ دریں گلستاں قرارے نیست — تو گر بہار شدی' ما خزاں شدیم' چہ شد؟

یہ نظم عملاً ایک عجیب و غریب کیفیت کی حامل ہے۔ معنوی سطح پر اس کے کرداروں میں اگرچہ "میں" مشترک ہے کہ اس کا تعلق ایک عام فرد سے ہے لیکن "تو" کو کم از کم دوہرے کردار کے منظرنامے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلا "تو" ایک آسودہ حال سرمایہ دار ہو سکتا ہے جو استحصال پسندی کا قائل ہے۔ دوسرا کردار مغربی استعمار پرستوں پر مشتمل ہے۔ اقبال نے دوسرے کردار کو واضح طور پر پینٹ نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر ایسا کیا ہو۔ بہرحال وہ فرماتے ہیں۔

① سے ⑦ **معنی: مذاق دید:** دیکھنے کی لذت۔ **رہین شکوۂ ایام:** زمانے کی شکایت۔ **فزوں:** زیادہ۔ **کاوش زیاں:** نقصان کی تکلیف۔ **قوی شدیم' چہ شد:** ہم طاقتور ہوئے تو کیا؟ **گلستاں:** مراد ہے دنیا۔ **قرارے نیست:** قیام ممکن نہیں۔

مطلب: میری آنکھیں تو کسی شے کو اس کے حقیقی منظرنامے میں دیکھنے کا ذوق بھی نہیں رکھتیں جب کہ تیری نگاہ تو فطرت کی رازداں ٹھہرتی ہے مگر اس سے کچھ بھی تو فرق نہیں پڑتا۔ ادھر میری زبان تو ہر لمحے زمانے کے شکوے کرتی رہتی ہے جب کہ آسمان تیری مرضی کے مطابق گردش کرتا رہتا ہے لیکن اس سے بھی کیا ہوا مجھے تو موج نسیم کی طرح آوارہ و سرگرداں رکھا گیا ہے اور تجھ کو بود و باش کے لیے قدرت نے گھر عطا کیا ہوا ہے تو اس سے کیا؟ اگر تیری تقدیر میں فائدے ہی فائدے ہیں اور میرے نصیب میں نقصان ہی نقصان تو بھی اس سے کوئی فرق پڑنے کا امکان نہیں۔

اگر تیرے جہاز فضا میں پرواز کرتے رہتے ہیں اور میری کشتی کو بادباں بھی میسر نہیں تو کیا ہوا؟ اگر تو طاقتور ہے تو کیا اور میں کمزور ہوں تو پھر کیا ہوا؟ اس طرح ہو گیا تو کیا؟ اور اس طرح ہو گیا تو کیا ہوا؟ اس کائنات میں کسی طور پر بھی آرام و سکون میسر نہیں ہے۔ اگر تو بہار ہے اور میں خزاں ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ بالآخر انجام دونوں کا یکساں ہے۔

135 تضمین بر شعر ابو طالب کلیم

خوب ہے تجھ کو شعار صاحب یثربؐ کا پاس — کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں
جس سے تیرے حلقہ خاتم میں گردوں تھا اسیر — اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں

وہ نشان سجدہ جو روشن تھا کوکب کی طرح ہو گئی ہے اس سے اب ناآشنا تیری جبیں
دیکھ تو اپنا عمل تجھکو نظر آتی ہے کیا وہ صداقت جس کی بیباکی تھی حیرت آفریں
تیرے آبا کی نگہ بجلی تھی جس کے واسطے ہے وہی باطل ترے کاشانہ دل میں مکیں
غافل! اپنے آشیاں کو آ کے پھر آباد کر نغمہ زن ہے طور معنی پر کلیم نکتہ بیں

"سرکشی باہر کہ کردی رام او باید شدن
شعلہ ساں ازہر کجا برخاستی آنجانشیں"

*

ابو طالب کلیم وہ ہمہ جہت فارسی شاعر ہے جسے ایک بار خوش ہو کر شاہجہاں نے چاندی میں تلوایا تھا۔ پیدا ہمدان میں ہوا۔ جہانگیر کے دور میں ہندوستان آیا اور یہیں آباد ہو گیا۔ بعد میں کشمیر میں مستقل بودوباش اختیار کر لی اور وہیں پر وفات پائی۔ اقبال نے اس کے شعر پر تضمین کہی۔ ملاحظہ ہو:

① سے ⑦ **معنی**: صاحب یثربؐ: مراد ہے رسول کریم ﷺ۔ حلقہ خاتم: انگوٹھی۔ نگیں: نگینہ۔ حیرت آفریں: حیرت کا باعث۔

مطلب: اے مسلمان تجھ کو آنحضرت ﷺ کے اصولوں اور سنت کا اچھا پاس ہے؟ تیرا عمل ہی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تو تو فی الواقعہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ تیری غفلت کے سبب وہ نگینہ تلف ہو گیا جس کے باعث تقدیر خود تیری گرفت میں تھی۔ تیری پیشانی پر سجدوں کے وہ نشان جو ہمیشہ ستاروں کی مانند روشن رہتے تھے اب تو ان سجدوں سے ہی تیری پیشانی محروم ہو چکی ہے۔

اے آسمان! ذرا تو اب اپنے اعمال کا جائزہ لے کہ کیا تجھے اب اپنی زندگی میں وہ صداقت نظر آتی ہے جس کی بے خوفی ایک زمانے میں دنیا بھر کو حیران کر دیتی تھی۔ تیرے اسلاف کی نظر جو کبھی باطل اور جھوٹ کے لیے برق کی حیثیت رکھتی اب وہی باطل اور جھوٹ خود تیرے دل میں اپنے پنجے پیوست کیے بیٹھا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اب تو عملاً ایسی زندگی گزار رہا ہے جو کافروں کے لیے مخصوص ہے۔ اے غفلت شعار! تیرے لیے یہی مناسب ہے کہ اپنے قدیم طور طریقوں پر عمل کر۔ غور کر کہ حقیقت کو پرکھنے والا ابو طالب کلیم کیا کہہ رہا ہے؟ وہ کہتا ہے تو نے جس سے بغاوت کی اب پھر اس کی اطاعت قبول کر لے۔ تو جس مقام سے شعلے کی طرح بلند ہوا تھا پھر اسی پر مرتکز ہو جا۔

شبلی و حالی

136

مسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا دیوان جزو و کل میں ہے تیرا وجود فرد
تیرے سرود رفتہ کے نغمے علوم نو تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد
پتھر ہے اس کے واسطے موج نسیم بھی نازک بہت ہے آئنہ آبروئے مرد
مردان کار ڈھونڈ کے اسباب حادثات کرتے ہیں چارۂ ستم چرخ لاجورد
پوچھ ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ رازدار کیونکر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد
مسلم مرے کلام سے بے تاب ہو گیا غماز ہو گئی غم پنہاں کی آہ سرد

کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیت خزاں　اوراق ہو گئے شجر زندگی کے زرد
خاموش ہو گئے چمنستاں کے رازدار　سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستاں　حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد
"اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟"

*

1914ء اس لیے تاریخ میں بے حد اہمیت کا سال گردانا جاتا ہے کہ اسی سال جنگ عظیم ہوئی اور اس حوالے سے مسلمانوں کے لیے یہ سال خصوصیت سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ برصغیر کے دو عظیم مسلم دانشور اور رہنما مولانا شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی علی الترتیب نومبر14ء اور دسمبر14ء میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ اقبال کو ان زعماء کی وفات سے جو گہرا رنج پہنچا اس کا اظہار انہوں نے اس نظم میں اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

① **معنی:** فرد: یگانہ۔ موج نسیم: ہوا کی لہر۔ چرخ لاجورد: نیلے رنگ کا آسمان۔ ہم نبرد: لڑنے والا۔ سوئے فردوس رہ نورد: بہشت کی طرف راہی۔

مطلب: ایک روز اقبال نے مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس کائنات میں تیرا وجود یقیناً بڑی انفرادیت کا حامل ہے۔ جو آج نئے مروجہ علوم ہیں وہ تیرے شاندار ماضی کے پیدا کردہ ہیں اور جو آج کی تہذیب ہے یہ بھی تیرے ماضی کی تہذیب کا چربہ ہے۔ یہ تہذیب ایک ایسے نازک اور لطیف آئینے کی مانند ہے کہ موج نسیم بھی اس کے لیے ایک پتھر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی انسان اپنی عزت و آبرو کے حوالے سے ایک نازک آئینے کے مانند ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے ہی ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔

اے مسلم یاد رکھ! کہ جب لوگوں میں قوت عمل ہوتی ہے وہ نیلے آسمان کے ظلم و ستم کا تدارک کر لیتے ہیں اور حادثوں کے اسباب بھی معلوم کر لیتے ہیں۔ جو لوگ امت مسلمہ کے عروج و زوال کی تاریخ سے آگاہی رکھتے ہیں تو ان سے جملہ مسائل کے بارے میں استفسار کر سکتا ہے۔ جس سے تجھے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ تیرے گلستاں میں خزاں کیونکر وارد ہوئی یعنی امت مسلمہ زوال پذیر کس طرح سے ہوئی۔

سو میری بات سن کر وہ مسلمان مضطرب ہو گیا اور ایک سرد آہ نے اس کے سینے میں پوشیدہ غم کو ظاہر کر دیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ اے اقبال تو نے جو امت کے زوال کا ذکر کیا ہے تو وہ کیفیت بھی دیکھ لے جس سے مسلمان دوچار ہیں۔ زندگی کو اگر ایک درخت سے تعبیر کر لیا جائے تو یہ بھی دیکھ لے کہ اس درخت کے پتے مرجھا کر سوکھ چکے ہیں۔

اے اقبال! وہ لوگ جو ملت اسلامیہ کے بہی خواہ اور رازدار تھے اور جن کی پر سوز اور درد بھری آواز ہمارے دلوں کو متاثر کرتی تھی اور پگھلا کر رکھ دیتی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کر گئے۔ شبلی کی وفات نے ہمارے دلوں کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ابھی ہم اس المیے پر آنسو بہا رہے تھے کہ مولانا حالی بھی اس دنیا سے کوچ کر کے جنت کو سدھار گئے۔

اب یہ جراءت و حوصلہ کس میں ہے کہ باغباں سے استفسار کرے کہ بلبل نے کیا کہا' گل نے کیا سنا اور صبا نے کیا عمل کیا؟

137 ارتقا

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز سرشت اس کی ہے مشکل کشی' جفا طلبی

سکوت شام سے تا نغمہ سحرگاہی ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی

کشا کش زم و گرما' تپ و تراش و خراش زخاک تیرہ دروں تا بہ شیشہ حلبی

مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید میان قطرۂ نیسان و آتش عنبی

اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی

"مغاں کہ دانہ انگور آب می سازند

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند"

*

① سے ⑦ **معنی**: **ستیزہ کار**: لڑائی کرنے والا۔ **شرار بولہبی**: ابولہب کا شرر۔ حضرت محمدﷺ کے چچا کی کنیت۔ **غیور**: غیرت مند۔ **زخاک تیرہ دروں**: ایسی مٹی جس میں جلا نہیں۔ **قطرۂ نیسان**: موسم بہار کی بارش کا قطرہ۔ **آتش عنبی**: انگور کی شراب۔

مطلب: زیر تشریح نظم میں اقبال نے اسلام کے حوالے سے مسئلہ ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب سے کائنات وجود میں آئی ہے کفر باطل اور حق و صداقت کے مابین آویزش جاری ہے اور کفر اسلام کے خلاف ہمیشہ سے معرکہ آرا رہا ہے۔ دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ زندگی اپنے مزاج کے اعتبار سے ہمیشہ شعلہ مزاج' غیور اور ہنگامہ خیز رہی ہے۔ اس کی سرشت میں مشکلات اور دشواریاں جھیلتا رہا ہے یعنی آرام و سکون زندگی کی فطرت سے ربط نہیں رکھتے۔ شام کے سکوت سے لے کر طلوع سحر تک رات بظاہر خاموشی سے گزرتی ہے لیکن اس کی خاموشی میں ہزارہا نالے اور آہیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حلب میں تاریک مٹی سے بڑا نفیس اور خوبصورت آئینہ تیار ہوتا ہے لیکن مٹی کو آئینے تک پہنچنے کے لیے ہزارہا مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

موسم بہار میں برسنے والی بارش کے ایک قطرے اور شراب انگور کے مابین بظاہر کوئی فرق نہیں لیکن بارش کا یہ قطرہ انگور کی کاشت اس کے بعد کشیدگی کے عمل اور شراب کی تیاری تک نہ جانے کتنا سفر طے کرتا ہے۔ زندگی میں اسی مسلسل جدوجہد اور کشاکش پیہم کے سبب ہی قومیں زندہ رہتی ہیں اور ملت اسلامیہ کو جو عروج حاصل ہوا اس کا راز بھی یہی ہے۔

شراب بنانے والے بظاہر انگور کو پانی بناتے ہیں جب کہ عملاً وہ ستارے توڑ کر ان سے سورج بناتے ہیں۔

138

صدیقؓ

اک دن رسولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا
دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
ارشاد سن کے، فرطِ طرب سے عمرؓ اٹھے
اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
لائے غرض کہ مال رسولِ امیںؐ کے پاس
ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار
پوچھا حضورِ سرورِ عالم نے اے عمرؓ
اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا
مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گذار
کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوتؐ بھی آ گیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت
ہر چیز، جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
ملکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس
اسپِ قمر سم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضورؐ، چاہیے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار
پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

*

پہلا بند معنی: اصحابؓ: صحابہؓ۔ راہوار: گھوڑا۔ دست نگر: محتاج۔

مطلب: یہ نظم عملاً دو بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں اقبال اس طرح سے آغاز کرتے ہیں کہ ایک روز آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب اور رفقا سے فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ دولت مند ہوں وہ اپنا مال راہ حق میں عطیہ کے طور پر دیں۔ آنحضرتؐ کی زبان سے یہ الفاظ برآمد ہوئے تو حضرت عمرؓ مسرت و انبساط کے عالم میں جھوم اٹھے۔ اس روز ان کے پاس کئی ہزار درہم موجود تھے۔ انہوں نے دل میں سوچا کہ آج میں یقیناً حضرت ابوبکرؓ سے بازی لے جاؤں گا۔ چنانچہ وہ اپنی رقم لے کر آنحضرتؐ کے پاس آئے اور حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دی۔

آنحضرتؐ نے استفسار کیا کہ اے عمرؓ! واقعی تیرا دل جوش حق سے مضطرب ہے۔ لیکن یہ تو بتا کہ اس مال میں سے اپنے اہل و عیال کے لیے بھی کچھ رکھا ہے یا نہیں؟ کہ مسلمان پر یہ بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے اہل و عیال اور دیگر اعزہ کا خیال رکھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں نے اپنی رقم میں سے نصف اپنے اہل خانہ کے لیے مخصوص کر دی ہے اور باقی ملت مسلمہ پر نثار کر رہا ہوں۔

دوسرا بند معنی: ملک یمین: مراد ہے لونڈی غلام۔ اسپ قمر سم: چاند جیسے سم والے گھوڑے۔ قاطر: خچر۔ حمار: گدھا۔ فروغ گیر: روشنی حاصل کرنے والے۔ تکوین: بنانا، پیدا کرنا۔

مطلب: ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ حضرت ابوبکرؓ بھی آگئے اور ساتھ وہ سارا مال و متاع لے آئے جو

ان کے پاس موجود تھا۔ اس میں نہ صرف درہم ہی تھے بلکہ دوسرا ساز و سامان حتیٰ کہ سواری کا گھوڑا' اونٹ اور تلوار تک شامل تھی۔ حضورؐ نے ان سے بھی ارشاد فرمایا کہ ہر شخص کو اپنے اہل و عیال کی فکر بھی کرنی چاہیے۔ اس مرحلے پر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ حضورؐ کی ذات والا صفات سے ستارے اور چاند درخشندہ و تابندہ ہیں اور حضورؐ کی ذات ہی کائنات کی تزئین و آرائش کا باعث ہے۔

چنانچہ جس طرح پروانے کو چراغ اور بلبل کے لیے پھول کا وجود کافی ہوتا ہے اسی طرح میرے لیے خدا کا رسولؐ ہی کافی ہے یعنی میں آپ کی ذات گرامی قدر سے زیادہ اپنے عزیز و اقربا اور اہل و عیال کو بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہوں۔

139 تہذیب حاضر

تضمین بر شعر فیضی

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی

کیا ذرہ کو جگنو' دے کے تاب مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتاب جلوہ فرما کی

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی' یہ بیداری' یہ آزادی' یہ بے باکی

تغیر آ گیا ایسا تدبر میں' تخیل میں
ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی

کیا گم تازہ پروانوں نے اپنا آشیاں لیکن
مناظر دل کشا دکھلا گئی ساحر کی چالاکی

حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت' خود فروشی' ناشکیبائی' ہوسناکی

فروغ شمع نو سے بزم مسلم جگمگا اٹھی
مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی

"تو اے پروانہ! ایں گرمی ز شمع محفلے داری
چو من در آتش خود سوز اگر سوز دلے داری"

٭

① سے ③ **معنی**: **بادۂ تہذیب حاضر**: موجودہ تہذیب کی شراب۔ **بھبوکا بن کے**: شعلہ بن کر۔ **تاب مستعار**: عارضی چمک۔ **بے باکی**: مراد ہے گستاخی۔

مطلب: عالمی سطح پر جو تہذیب رائج ہے وہ مغرب کی وضع کردہ ہے۔ اس تہذیب میں اتنی حرارت اور حدت ہے جس نے ملت اسلامیہ کو بھی بھسم کر کے رکھ دیا ہے۔ مراد یہ ہے مسلمانوں کی اپنی زندہ تہذیب اور مستحکم روایت کے باوجود یورپی تہذیب اس قدر بھرپور انداز میں عام ہو چکی ہے کہ مسلم تہذیب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی دیکھیے کہ یورپی تہذیب کو ایسی روشنی عطا کی ہے جس کے ذریعے یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک ذرے کو جگنو کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم نوجوانوں نے وہی رعنائی' بیداری' آزادی اور بے خوفی کے انداز اپنا لیے جو مغرب کی تہذیب سے عبارت ہیں۔

④ سے ⑤ **معنی**: **ساحر**: جادوگر۔

مطلب: اقبال آئندہ چل کر اس نظم میں کہتے ہیں کہ انسانی تدابیر اور تخیل میں اس نوع کی تبدیلی واقع ہو گئی ہے کہ خلوص کے ساتھ انجام دیئے ہوئے کارناموں کو بھی اب مذاق سے تعبیر کیا جانے لگا ہے اور ہر نوع کی قربانی کو محض دکھاوے کا نام دیا جا رہا ہے۔ لیکن تہذیب حاضر کے نوجوانوں پر اثرات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ ماضی کی مستحکم روایت اور اسلام کے وضع کردہ بلند ترین اصول فراموش کر چکے ہیں اور اس راہ سے بھٹک کر اب تباہی کے غار میں گر رہے ہیں۔

⑥ سے ⑧ **معنی:** کہنہ ادراکی: پختہ سمجھ۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جب سے مغربی تہذیب مشرق پر اثرانداز ہوئی تو اس کے منفی اثرات رقابت، خود فروشی، بے صبری اور حرص و ہوس کی صورت میں رونما ہوئے ہیں۔ یعنی مسلم نوجوان نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے حسد کرنے لگے ہیں بلکہ انہوں نے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے اپنے آپ کو غیروں کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ وہ اس قدر بے صبرے اور ناشکرے بن چکے ہیں کہ لالچ اور حرص و ہوا نے ان کی تمام تر اچھی صلاحیتیں چھین لی ہیں۔ بظاہر اس نئی تہذیب سے مسلمان استفادہ کر کے دوسری قوموں کی برادری میں شامل ہو رہے ہیں لیکن میری ماضی پرست فطرت اس امر کی نشاندہی کر رہی ہے کہ دوسروں سے مستعار لی ہوئی روشنی سے کسی حد تک استفادہ تو ممکن ہے تاہم انفرادیت خود اپنے اصولوں کی حدت میں ہے۔

140 والدہ مرحومہ کی یاد میں

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے

آسماں مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

ہے شکست انجامِ غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں

نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اسی زنجیرِ عالمگیر میں ہر شے اسیر

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِ مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں

قلبِ انسانی میں رقصِ عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے، لطفِ زیر و بم رہتا نہیں

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنابی نہیں

جانتا ہوں آہ! میں آلامِ انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز

میرے لب پر قصۂ نیرنگیِ دوراں نہیں
دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں

پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پائندہ ہے
درد کے عرفاں سے عقلِ سنگدل شرمندہ ہے

موج دود آہ سے آئینہ ہے روشن مرا ۔ گنج آب آورد سے معمور ہے دامن مرا
حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا ۔ رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا
رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا ۔ عہد طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا
جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جان ناتواں ۔ بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخی گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور ۔ دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم ۔ صحبت مادر میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں ہم

بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو اب ہو گا وطن میں آہ، میرا انتظار؟ ۔ کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار؟
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا ۔ اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا ۔ گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات ۔ تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی ۔ میں تری خدمت کے قابل جب ہوا، تو چل بسی
وہ جواں، قامت میں ہے جو صورت سرو بلند ۔ تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبار زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا ۔ وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا
تجھ کو مثل طفلک بے دست و پا روتا ہے وہ ۔ صبر سے نا آشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانہ برنا و پیر ۔ آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت ۔ گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت
زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں ۔ کیسی کیسی دختران مادر ایام ہیں
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت ۔ دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں ۔ ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
نے مجال شکوہ ہے، نے طاقت گفتار ہے ۔ زندگانی کیا ہے، اک طوق گلو افشار ہے

قافلے میں غیر فریاد درا کچھ بھی نہیں
اک متاع دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی ۔ ہیں پس نہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی
سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا؟ ۔ نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا؟
جھاڑیاں، جن کے قفس میں قید ہے آہ خزاں ۔ سبز کر دے گی انہیں باد بہار جاوداں

خفتہ خاک پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا؟ عارضی محمل ہے یہ مشت غبار اپنا تو کیا؟
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظام کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
آہ! غافل! موت کا راز نہاں کچھ اور ہے نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے
جنت نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ
پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا
اس روش کا کیا اثر ہے ہیئت تعمیر پر؟ یہ تو حجت ہے ہوا کی قوت تعمیر پر
فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

آہ! سیماب پریشاں، انجم گردوں فروز شوخ یہ چنگاریاں، ممنون شب ہے جن کا سوز
عقل جس سے سر بزانو ہے وہ مدت ان کی ہے سرگزشت نوع انساں ایک ساعت ان کی ہے
پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
جو مثال شمع روشن محفل قدرت میں ہے آسماں اک نقطہ جس کی وسعت فطرت میں ہے
جس کی نادانی صداقت کے لیے بیتاب ہے جس کا ناخن ساز ہستی کے لیے مضراب ہے
شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا؟

تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے کس قدر نشوونما کے واسطے بے تاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے خودنمائی، خود فزائی کے لیے مجبور ہے
سردی مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
ہے لحد اس قوت آشفتہ کی شیرازہ بند ڈالتی ہے گردن گردوں میں جو اپنی کمند
موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں

کہتے ہیں اہل جہاں درد اجل ہے لادوا زخم فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا
دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے حلقہ زنجیر صبح و شام سے آزاد ہے
وقت کے افسوں سے تھمتا نالہ ماتم نہیں وقت زخم تیغ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

سر پہ آ جاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں — اشک پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں
ربط ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے — خون دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے
آدمی تاب شکیبائی سے گو محروم ہے — اس کی فطرت میں یہ اک احساس نامعلوم ہے
جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں — آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں
رخت ہستی خاک، غم کی شعلہ افشانی سے ہے — سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے

آہ! یہ ضبط فغاں غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہے یہ دلاسائی فراموشی نہیں

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح — داغ شب کا دامن آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ — بے زباں طائر کو سرمست نوا کرتی ہے یہ
سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے — سیکڑوں نغموں سے باد صبحدم آباد ہے
خفتگان لالہ زار و کوہسار و رود بار — ہوتے ہیں آخر عروس زندگی سے ہمکنار

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقد انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح؟

دام سیمین تخیل ہے مرا آفاق گیر — کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر
یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے — جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات — جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہان بے ثبات
مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہے — آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے
ہے وہاں بے حاصلی کشت اجل کے واسطے — سازگار آب و ہوا تخم عمل کے واسطے
نور فطرت ظلمت پیکر کا زندانی نہیں — تنگ ایسا حلقۂ افکار انسانی نہیں
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر — خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا — نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

*

عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ یہ نظم علامہ اقبال نے اپنی والدہ امام بی بی کی وفات پر لکھی۔ ظاہر ہے کہ اس نظم کی حیثیت اگرچہ ایک مرثیے کی سی ہے تاہم اس میں جابجا انہوں نے اپنے نظریات اور فلسفے کے حوالے سے اہم اشارے کیے ہیں۔ ہرچند کو امام بی بی پڑھی لکھی نہیں تھیں اس کے باوجود علامہ اقبال کی تربیت میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ زیر تشریح نظم تیرہ بند اور چھیاسی اشعار پر مشتمل ہے اور یہ علامہ کی طویل نظموں میں سے ایک ہے۔

پہلا بند **معنی**: دہر: دنیا۔ **زندانی تقدیر**: تقدیر کا قیدی۔ **انجم سیماب پا**: پارے کے قدم رکھنے والے ستارے۔ **شکست انجام**: جس کا انجام شکست ہو۔ **آواز خاموش ضمیر**: ضمیر کی خاموش آواز۔

مطلب: نظم کا آغاز کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ اس کائنات کا ہر ایک ذرہ عملاً تقدیر کے زنداں میں

قید ہے۔ یعنی ہر لمحے دنیا بھر میں وہی کچھ ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ اور جس چیز کو ہم تدبیر کا نام دیتے ہیں وہ فی الواقع اپنی مجبوری اور بے بسی پر پردہ ڈالنے کی ایک صورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آسمان بھی مجبور ہے اور سورج کے علاوہ چاند بھی مجبور ہے۔ ان کے علاوہ ستارے جو انتہائی تیز رفتار سمجھے جاتے ہیں وہ بھی اپنی رفتار کی حد تک مجبور واقع ہوئے ہیں۔ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ہر لمحے سفر میں ہی رہیں۔ باغ میں موجود غنچے کا انجام چٹک کر پھول کی وضع اختیار کر لینے میں ہی ہے۔ اسی طرح سبزہ ہو یا پھول یہ سب اس امر پر مجبور ہیں کہ نمو پائیں اور پھلیں پھولیں۔ خواہ بلبل کا نغمہ ہو یا ضمیر کی خاموش آواز۔ یہ سب چیزیں کائنات پر محیط اسی تقدیر کی زنجیر میں قید ہیں۔

دوسرا بند معنی: سر مجبوری: مجبوری کا راز۔ زیر و بم: اتار چڑھاؤ۔ **الماس کا ٹکڑا**: ہیرے کا ٹکڑا۔ **اشک عنابی**: خونیں آنسو۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جب ہماری آنکھ پر ان مجبوریوں کا راز منکشف ہوتا ہے تو دل سے برآمد ہونے والا آنسوؤں کا سیلاب خود بخود ہی خشک ہو جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایسی صورت میں ان مجبوریوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ بریں وجہ قلب انسانی میں مسرت اور غم کا احساس باقی نہیں رہتا۔ یوں زندگی کا نغمہ تو برقرار رہتا ہے لیکن اس کے سروں کے اتار چڑھاؤ کا لطف باقی نہیں رہتا۔ مراد یہ ہے کہ انسان پر بے حسی اور بے کیفی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ مختلف جذبوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیتا ہے۔

مختلف اشیاء کے بارے میں معرفت اور دانائی فی الواقع آنسوؤں اور آہوں کے اثاثے کے لیے لوٹ مار مچانے والے ڈاکو ثابت ہوتے ہیں اور ہر نوع کے اسرار و رموز سے آگاہی رکھنے والا دل بالآخر الماس کا ایک ٹکڑا بن کر رہ جاتا ہے۔ ہر چند کہ میرا باغ اس قدر ویران ہو چکا ہے کہ اس میں شبنم کی تازگی تک باقی نہیں رہی۔ یہی نہیں بلکہ میری آنکھوں میں وہ آنسو بھی موجود نہیں جو کبھی خون برسایا کرتے تھے۔ اور جن آنسوؤں کی رنگت عنابی یعنی سرخ ہوا کرتی تھی۔

دراصل میں انسان کے غم و اندوہ کے راز سے پوری طرح سے آگاہ ہوں اسی لیے میں شکوہ شکایت کی جانب مائل نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ میں گردش زمانہ کا گلہ بھی نہیں کرتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ اقبال کے بقول میرے لبوں پر تغیرات زمانہ اور تبدیلیوں کی کہانی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا دل حسب واقعات' حیراں بھی نہیں ہے تاہم نہ خوشی کے موقع پر ہنستا ہوں نہ غم کے موقعہ پر آنسو بہاتا ہوں۔

لیکن اے ماں! جب بھی تیری تصویر کی جانب نظر ڈالتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے مسلسل رونے اور اشک بہانے پر مجبور کرتی ہے۔ افسوس کہ یہ عمل میری حکمت و دانائی کو بھی رد کرتا ہے اور اسے غیر مستحکم بھی بناتا ہے۔

تیسرا بند معنی: موج دود آہ: آہ کے دھوئیں کی موج۔ **گنج آب آورد**: پانی کا لایا ہوا خزانہ' آنسوؤں کی حالت۔ **عہد طفلی**: بچپن کا زمانہ۔ بے بہا: قیمتی۔

مطلب: یہاں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ اے ماں! میں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں کہ مسلسل رونے سے زندگی کی بنیاد زیادہ مضبوط و مستحکم ہوتی ہے۔ درد کے عرفان سے بے شک عقل کتنی بھی سنگدل ہو شرمسار ہو کر رہ جاتی ہے۔ مراد یہ کہ تکلیف و درد میں جو عرفان پوشیدہ ہے عقل کی اس تک

رسائی ممکن نہیں ہے۔ اے ماں! تیرے غم میں جو آہیں بھرتا ہوں ان کے سبب میرا آئینہ دل مزید صاف و شفاف ہو جاتا ہے۔ اور تیرے غم میں بہنے والے آنسوؤں سے میرا دامن تر ہو جاتا ہے۔

اے ماں! یہ اعجاز تیری تصویر کا ہی ہے جس نے وقت کی پرواز کا رخ بدل ڈالا ہے۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اس تصویر نے میرے حال و ماضی کو یکجا کر دیا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس نے ایک بار پھر مجھے اپنے بچپن سے آشنا کر دیا ہے۔ بے شک مجھے وہ وقت یاد آ رہا ہے۔ جب میرا کمزور جسم تیرے سایہ عاطفت میں پرورش پا رہا تھا اور میں نے ابھی اچھی طرح بولنا بھی نہیں سیکھا تھا۔

جب کہ آج ہر جگہ میری شوخی گفتار یعنی شاعری کے چرچے ہو رہے ہیں اور میری آنکھوں سے بہنے والے آنسو موتی تصور کیے جاتے ہیں۔

چوتھا بند معنی: اوج گاہوں: بلندیوں۔ خندہ زن: ہنسنا۔

مطلب: علم کے حصول اور اس کے بعد سنجیدگی سے گفتگو کرنے کا عمل' اپنی ضعیفی اور عمر کے باعث حاصل ہونے والی دانائی اور حکمت' زندگی میں ملنے والے مراتب اور منصب' اس کے ساتھ جوانی کی عمر کا غرور اور ولولہ۔ بے شک عرف عام میں انہیں انسانی بلندی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن جب وہ ماں کے سامنے ہوتا ہے تو پھر ان تمام بلندیوں سے نیچے اتر آتا ہے اور محض ایک معصوم بچہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ماں کے روبرو تو بڑے سے بڑے شخص کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

ماں کی محبت میں تو بڑے بڑے لوگوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ سب تکلفات بالائے طاق رکھ کر بلند آہنگ قہقہے لگاتے ہیں اور ہر نوع کے تفکرات سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ ماں کے سامنے وہ خود کو ماضی کی کھوئی ہوئی دنیا میں محسوس کرتے ہیں جو ایک طرح سے جنت گم گشتہ کی مانند تھی۔

پانچواں بند معنی: دعائے نیم شب: آدھی رات کی دعا۔ **سرو بلند:** سرو کا اونچا درخت۔ **بہرہ مند:** خوش نصیب۔ **طفلک بے دست و پا:** بے بس بچے کی مانند۔ **صبح و مسا:** صبح و شام۔ **کشت جاں:** روح کی کھیتی۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ والدہ کے انتقال کے بعد اب وطن میں میرا اور میرے خط کا انتظار کون کرے گا۔ واضح رہے کہ ان دنوں اقبال یورپ میں مقیم تھے وہ کہتے ہیں کہ جب میری وطن واپسی ہو گی تو اے ماں! تیری قبر پر یہ فریاد لے کر آؤں گا کہ نصف شب کے وقت میری بہبودی کے لیے تو جو دعائیں کرتی تھی اب کون کرے گا؟

اے ماں! یہ تیری تربیت اور پرورش کا نتیجہ ہی تھا کہ آج مجھے یہ عزت و وقار حاصل ہوا ہے اور ساری دنیا کی نظروں میں ہمارے خاندان کے احترام میں اضافہ ہوا ہے۔ اس صحیفہ کائنات میں تیری زندگی ایک سنہرے باب کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور عملاً تیری زندگی دین و دنیا کے حوالے سے ایک سبق کی مانند تھی۔ ساری عمر تو میری محبت و شفقت سے سرشار میری تربیت میں کوشاں رہی لیکن جب میں تیری خدمت کے قابل ہوا تو کس قدر دکھ کی بات ہے کہ تو داغ مفارقت دے گئی۔

ان اشعار میں اقبال اپنے بڑے بھائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بلند قد جواں سال' خوبصورت اور خوب سیرت شخص جو میرا بھائی اور تیرا بیٹا ہے وہ یہاں موجود رہ کر تیری خدمت میں سرگرداں رہا۔ اور میری نسبت تیری زیادہ دکھ بھال کرتا رہا۔ یہ شخص جو میرا عزیز بھائی ہے اور شک کا

ہے وہ میرے لیے عملاً تیری محبت کا بدل ہے۔ وہ میرے لیے قوت بازو کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اب یقیناً تیری موت پر بچوں کی طرح روتا ہوگا۔ اسے صبر کس طرح آئے گا۔ ظاہر ہے کہ صبح شام گریہ اس کا کام ہوگا۔ میں تو یہاں یورپ میں مقیم تیری یاد میں غم گسار ہوں۔ میرے لیے یہ کرب ناقابل برداشت ہے جب کہ میرا بھائی تو تیرے موت کے حادثے کو اپنی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

لیکن اے ماں! تو نے ہم بھائیوں کے دلوں میں محبت کا جو جذبہ پیدا کیا تھا اب تیرے غم کے سبب یہ جذبہ اور مستحکم ہوگیا ہے کہ یہ دکھ ہمارے مابین قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔

چھٹا بند معنی: پیر: بوڑھا۔ **طلسم دوش و فردا**: ماضی اور مستقبل کا جادو۔ **کلبۂ افلاس**: غریبی کی جھونپڑی۔ **کاشانے**: محل۔ **مجال شکوہ**: شکایت کی طاقت۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ یہ دنیا کیا ہے؟ یہی نا کہ ہر جوان اور بوڑھے کے لیے ماتم کدے کی حیثیت رکھتی ہے جب کہ انسان اس کی حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہا۔ یوں لگتا ہے کہ وہ ابھی ماضی اور حال کے طلسم میں اسیر ہے۔ زندگی اور موت کا اگر مقابلہ کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی بسر کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ اور موت اسی قدر سہل ہے جیسے کہ کسی باغ میں نسیم بلا کسی تردد کے رواں دواں رہتی ہے۔ اس زندگی میں تو زلزلے، بجلیاں، قحط اور آلام و مصائب کی بہتات ہے۔ زمانہ کی حیثیت ایک ایسی سنگ دل ماں کی طرح ہے جو اس نوع کی اولاد پیدا کرتی ہے۔ موت تو ایک ایسی حقیقت ہے جو افلاس و غربت کے تنگ و تاریک گھروں کے علاوہ امراء کے دولت کدوں تک جس کی رسائی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیابان و صحرا، آبادیاں، باغات اور ویرانے، بھی موت کی دسترس سے نہیں بچ سکے ہیں۔

موت تو ان پر سکون سمندروں پر بھی محیط ہے جو ہر نوع کے ہنگاموں اور طوفانوں سے محفوظ تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ کہ ایسے سمندروں میں رواں دواں کشتیاں موجوں کی آغوش میں ڈوب جاتی ہیں۔ موت تو ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ اس کے خلاف نہ تو کسی کو شکوہ کرنے کی جراءت ہوتی اور نہ گلہ کرنے کا حوصلہ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ موت تو ایک ایسے طوق کی مانند ہے جس سے پہننے والے کا گلا گھٹ جاتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو حیات انسانی ایک ایسے قافلے کے مانند ہے جس میں ایک انتہائی گھنٹی کے سوا ہر طرف خامشی طاری ہے۔ یہاں انسانی متاع محض آنکھ ہے جو آنسو بہاتی رہتی ہے۔

ساتواں بند معنی: **باد بہار جاوداں**: ہمیشہ کی بہار کی ہوا۔ **خاکستر**: راکھ۔

مطلب: جان لے کہ یہ مصائب و ابتلا کا دور بھی بالآخر ایک روز ختم ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے کہ نو آسمانوں کے پس پشت ابھی کچھ اور آسمان یعنی ادوار ابھی باقی رہتے ہیں۔ جنہیں کسی نہ کسی مرحلے پر ظہور پذیر ہونا ہے۔ اگر اس دنیا میں لالہ و گل کے سینے چاک ہیں اور بلبل آہ و زاری پر مجبور ہے تو پھر کیا ہوا؟ اس لیے کہ ایسی جھاڑیاں جنہیں خزاں نے تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے انہیں بہار کی ہوا نئے سرے سے تر و تازہ کر کے رکھ دے گی۔

اگر ہماری زندگی ایک پامال اور پژمردہ روح کی مانند ہے اور یہ خاکی جسم محض عارضی حیثیت کا حامل ہے تو کیا ہوا؟ اس لیے کہ زندگی جس آگ سے عبارت ہے اس کا انجام محض خاک نہیں ہے کہ زندگی تو ایک ایسا موتی ہے جس کے مقدر میں شکستگی نہیں ہے۔

آٹھواں بند معنی : **دیدۂ قدرت** : فطرت کی نگاہ۔ **حفظ زندگی** : زندگی کی حفاظت۔ **نقش حیات** : زندگی کی تصویر۔ **خلل** : رکاوٹ۔ **جنت نظارہ** : جنت کا جلوہ۔ **بالائے آب** : پانی کا بلبلہ۔ **ہیئت تعمیر** : تعمیر کی صورت۔ **فطرت ہستی** : زندگی کی سرشت۔ **پیکر** : جسم۔

مطلب : یوں بھی قدرت کی نگاہ میں زندگی اس قدر پیاری ہے کہ رب ذوالجلال نے ہر شے کو تخلیق کرتے وقت اس میں زندگی کے تحفظ کا جذبہ بھی شامل کر دیا تھا۔ اگر موت اتنی طاقتور ہوتی کہ اس کے ہاتھوں حیات انسانی کا نظام زیر و زبر ہو جاتا تو اس کو یعنی موت کو نظام کائنات میں یوں عام نہ کر دیا جاتا۔ اگر موت اتنی ارزاں اور سستی واقع ہوئی ہے تو سمجھ لو کہ جس طرح خواب کے عمل سے زندگی میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح موت کی حقیقت بھی معمولی سی ہے۔ انسان تو اس قدر غفلت شعار ہے کہ اس حقیقت کا بھی اسے ادراک نہیں کہ موت کا اصل راز کیا ہے؟ زندگی کی ناپائیداری سے کچھ اور ہی ظاہر ہوتا ہے۔

ذرا غور کیا کہ ہوا کے طرز عمل سے تعمیر پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ مضطرب موج بلبلوں کو توڑ کر پھر سے تعمیر کرنے کی صلاحیت سے مالامال ہے۔ لیکن ہوا کرتی کیا ہے کہ بلبلوں کو پیدا کر کے موج کے دامن میں چھپا دیتی ہے۔ یعنی خود ہی انتہائی بے دردی کے ساتھ اس نقش کو مٹا دیتی ہے۔ اس عمل کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر ہوا بلبلے کو از سر نو پیدا کرنے پر قادر نہ ہوتی تو اس بے پروائی سے اسے توڑتی ہی کیوں؟

ہوا کے اس رویے کا اثر تعمیر کی ہیئت پر کچھ نہیں پڑتا بلکہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہوا کو اپنی قوت تعمیر پر کس قدر گرفت حاصل ہے۔

اس ساری گفتگو سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ زندگی ہمیشہ فطرتاً نئی نئی آرزوؤں اور خواہشوں کی متلاشی رہتی ہے اور اس کو بہتر سے بہتر چیز کی جستجو رہتی ہے۔

نواں بند معنی : **ممنون شب** : رات کا احسان مند۔ **سر بزانو** : گھٹنوں پر سر رکھے ہوئے۔ **سوئے افلاک** : آسمان کی طرف۔ **قدسیوں** : فرشتے۔ **وسعت فطرت** : فطرت کا پھیلاؤ۔ **مضراب** : ستار بجانے کا آلہ۔ **کم بہا** : ارزاں۔

مطلب : افسوس کہ یہ پارے کی مانند مضطرب اور چمکدار ستارے جو فضائے آسمان کو منور کرتے ہیں یہ شوخ چنگاریاں جو اپنے وجود کی نمائش کے لیے تاریکی شب کی احسان مند ہیں انسانی دانش جب ان کی عمر کے بارے میں غور و خوض کرتی ہے تو کسی نتیجے پر پہنچنے کی بجائے حیران و پریشان ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ حیات انسانی ان ستاروں کے مقابلے میں محض چند لمحوں تک محدود ہے۔ مگر انسان جس کی نگاہ ہمیشہ آسمانوں سے بھی آگے نظارہ کرنے کی حامل ہے اور جو اپنے مقاصد میں فرشتوں سے بھی زیادہ پاک و پاکیزہ ہے یہی انسان جو محفل کائنات میں ایک روشن شمع کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی فطرت اور صلاحیتوں کے مقابلے میں آسمان محض ایک نقطے کی مانند ہے اس کے باوجود اپنی کم فہمی کے سبب سچائی کی تلاش میں مضطرب اور پریشان ہے جس کا وجود زندگی کے ساز کے لیے ایک مضراب کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا وہ گردوں کے ستاروں سے بھی آب و تاب میں کمتر ہے اور کیا اس کا رتبہ سورج کے مقابلے میں بھی کم ہے؟

دسواں بند معنی: تخم گل: پھول کا بیج۔ **مستور:** چھپا ہوا۔ **خودنمائی:** اپنے آپ کو ظاہر کرنا۔ **قبائے زندگی:** زندگی کا لباس۔ **قوت آشفتہ:** پریشان طاقت۔ **شیرازہ بند:** جمع کرنے والا۔ **جز سنجیدن پر:** اڑنے سے پہلے پرندوں کا پر تولنا۔

مطلب: اقبال ان اشعار میں یوں سخن طراز ہیں کہ پھول کا بیج زیر خاک بھی بویا جاتا ہے تو وہ نشوونما کے لیے مضطرب اور بے تاب رہتا ہے۔ اس معمولی سے بیج میں فی الاصل ایک ایسا شعلہ چھپا ہوا ہے جو زندگی سے عبارت ہے۔ یہ بیج اپنے اظہار و نمود کے لیے بے چین رہتا ہے۔ یہ بیج مٹی کی خنکی سے بھی نہیں مرتا اور خاک میں دبائے جانے کے باوجود اس میں زندگی کی حرارت باقی رہتی ہے۔

چنانچہ موقعہ پاتے ہی یہ بیج پھول بن کر خاک کی تہوں سے باہر نکل آتا ہے۔ بالفاظ دگر موت کے ہاتھوں زندگی کا لباس پہن لیتا ہے یعنی مٹی ہی اس کی تخلیق اور نمو کا باعث بنتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبر انسان کو فنا نہیں کرتی بلکہ اس کی ان منتشر قوتوں کو منظم کرتی ہے جو آسمان پر بھی کمند ڈال سکیں۔ یوں موت زندگی کے ذوق کی تجدید کا دوسرا نام ہے۔ بالفاظ دگر عالم خواب میں بیداری کا پیغام ہے۔

اس لیے کہ جو پرواز کے عادی ہوتے ہیں ان کو پرواز کا کوئی خوف نہیں ہوتا جب کہ موت اس دنیا میں نئے سرے سے پرواز پر آمادہ کرتی ہے۔

گیارھواں بند معنی: شفا: صحت۔ **حلقہ زنجیر:** زنجیر کی قید۔ **افسوں:** جادو۔ **سرشک آباد:** آنسوؤں کی بستی۔ **تاب شکیبائی:** صبر کی طاقت۔ **جوہر انساں:** انسان کی روح۔ **آگہی:** عقل و شعور۔ **دلاسائی:** دل کی تسکین۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ دنیا والوں کے نزدیک موت کا کوئی مداوا نہیں۔ اس کے باوجود مرنے والے کی جدائی کا غم وقت گزرنے کے ساتھ کم ہوتا جاتا ہے۔ گویا وقت زخم جدائی کے لیے مرہم کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل ایک ایسی بستی ہے جو مرنے والوں کے غم کو اپنے دامن میں محفوظ کر لیتی ہے اور اس پر زمانے کی کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ گریہ وزاری اور نالہ و ماتم کو وقت کا طلسم بھی نہیں روک سکتا۔ یوں مرنے والے جدائی کا جو زخم دے جاتے ہیں وقت اس کا مرہم نہیں بن سکتا۔ جس لمحے انسان پر اچانک کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

اس کیفیت میں دل کو نالہ و فریاد سے ایک باضابطہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور دل کا خون آنکھوں کے راستے بہ نکلتا ہے۔ ہرچند کہ انسان صبر کی قوت سے محروم ہے اس کے باوجود اس کی فطرت میں غیر محسوس طریق پر یہ حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ کہ انسان مرنے کے بعد بے شک ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا۔ بے شک غم کے شعلے زندگی کو جلا کر خاک تو کر دیتے ہیں تاہم دل کی یہ آگ محض اس احساس کی بدولت ہی بجھتی ہے کہ انسان اس دار فانی سے اٹھ تو جاتا ہے لیکن عملاً فنا نہیں ہوتا۔ اور یہی وہ احساس ہے جو رنج و غم کی مسلسل کمی کا سبب بنتا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے کسی عزیز کی وفات پر آہ و فغاں سے گریز کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ غم کے احساس سے غافل ہو چکا ہے اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ وہ موت کے بھیدوں سے آگاہی رکھتا ہے۔

بارہواں بند معنی: دامن آفاق: دنیا کا دامن۔ **آتش قبا:** آگ کا لباس۔ **سرود:** نغمہ۔ **خفتگان:** سوئے ہوئے۔ **عروس زندگی:** زندگی کی دلہن۔ **مرقد:** قبر۔

مطلب: زیر تشریح اشعار میں اقبال پھر سے اپنے موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب مشرق کی جانب سے افق پر صبح نمودار ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ کائنات کے دامن سے شب کی سیاہی کا داغ دھو رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ رات کی تاریکی کے بعد صبح کی روشنی نمودار ہو رہی ہے۔ باغ میں لالہ کا پھول و تاریکی شب کے سبب افسردہ نظر آتا تھا صبح سورج کی وساطت سے اس کو شعلے جیسا سرخ لباس عطا کرتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ علی الصبح جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کا عکس لالے کے پھول کو سرخی مائل کر دیتا ہے۔ اور پرندے جو تمام رات اپنے گھونسلوں میں خاموش رہے۔ ان کو چہچہانے اور نغمہ ریزی پر مجبور کر دیتی ہے۔ بلبل بھی اس لمحے نغمے گانے لگتی ہے اور صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پرندے ترنم ریز ہو جاتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ باغوں، پہاڑوں اور دریاؤں میں جو مظاہر شب بھر پر سکون رہے آمد صبح ان میں بھی زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔

سو! یہ اگر قانون قدرت ہے کہ ہر شام صبح پر منتج ہو تو پھر انسانی قبر کی تاریکی کا خاتمہ کس لیے ممکن نہیں۔ صبح اس کا مقدر کیوں نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے ان اشعار میں ایک منطقی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے کہ موت کوئی آخری مرحلہ نہیں ہے اس کے بعد بھی زندگی ہے۔

تیرھواں بند معنی: دام سیمین تخیل: تخیل کا چاندی سا جال۔ **جہان بے ثبات:** فانی دنیا۔ **جولاں گاہ:** تیزی دکھانے کی جگہ۔ **بے حاصلی:** کچھ حاصل نہ ہوا۔ **حلقہ افکار انسانی:** انسان کی فکر کا دائرہ۔ **ایوان:** محل۔ **شبستاں:** رات بسر کرنے کی جگہ۔ **سبزۂ نورستہ:** تازہ اگی ہوئی گھاس۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال کہتے ہیں کہ اے ماں! میرے خیالات میں اتنی وسعت ہے کہ ان کی حدود میں تیری یاد کو محفوظ کر لیا ہے۔ میرا غم زدہ دل تیری یاد سے معمور ہے بالکل اسی طرح جیسے حرم کعبہ کی فضائیں دعاؤں سے معمور ہیں۔ زندگی جس چیز کا نام ہے وہ تو ایک طرح سے انسانی فرائض کے تسلسل سے عبارت ہے۔ یہ زندگی لاکھوں ناپائیدار دنیاؤں میں جلوہ گر ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ زندگی کی ہر منزل کا طریق کار مختلف ہے۔ مرنے کے بعد انسان جس جہاں میں جاتا ہے وہ بھی زندگی کا ایک مظہر ہے۔ وہاں موت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہاں کا ماحول عمل کے لیے بڑا مناسب اور سازگار ہے۔

اے ماں! وہ جہان تو ایسا ہے جہاں انسان جسم کا قیدی نہیں ہو گا بلکہ وہاں تو محض روح ہو گی اور اس کا نور ہو گا۔ چنانچہ یہ قدرتی امر ہے کہ وہاں فکر انسانی کا دائرہ یہاں کی طرح محدود نہیں ہو گا۔ اے ماں! یہاں پر بھی تیری زندگی چاند کی روشنی سے بھی زیادہ منور تھی اور تیرا سفر حیات صبح کے ستارے سے بھی زیادہ آسودگی کا مظہر تھا۔ اے ماں! خدا کرے صبح کے مانند تیری قبر بھی منور اور روشن رہے اور تیری آخری آرامگاہ نور سے معمور رہے۔

اے عظیم ماں! بارگاہ ایزدی میں دعاگو ہوں کہ تیری قبر پر آسمان شبنم برسائے وراس کی نگہبانی تازہ اگا ہوا سبزہ کرے۔

141

شعاعِ آفتاب

صبح جب میری نگہ سودائیِ نظارہ تھی
آسماں پر اک شعاعِ آفتاب آوارہ تھی

میں نے پوچھا اس کرن سے اے سراپا اضطراب
تیری جانِ ناشکیبا میں ہے کیسا اضطراب

تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے کہ جس کو آسماں
کر رہا ہے خرمنِ اقوام کی خاطر جواں

یہ تڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے، کیا ہے یہ؟
رقص ہے، آوارگی ہے؟ جستجو ہے؟ کیا ہے یہ"

"خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستیِ خاموش میں
پرورش پائی ہے میں نے صبح کی آغوش میں

مضطرب ہر دم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے
جستجو میں لذتِ تنویر رکھتی ہے مجھے

برقِ آتش خو نہیں فطرت میں گو ناری ہوں میں
مہرِ عالم تاب کا پیغامِ بیداری ہوں میں

سرمہ بن کر چشمِ انساں میں سما جاؤں گی میں
رات نے جو کچھ چھپا رکھا تھا دکھلاؤں گی میں

"تیرے مستوں میں کوئی جویائے ہشیاری بھی ہے
سونے والوں میں کسی کو ذوقِ بیداری بھی ہے"

*

اقبال کی یہ نظم بھی "بانگ درا" کی دوسری بعض نظموں کی طرح مناظر فطرت کے حوالے سے تخلیق کی گئی ہے۔ اس نظم میں آفتاب کی ایک شعاع کو انہوں نے اظہار کا موضوع بنایا ہے۔ نو اشعار کی یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے جس میں اقبال کہتے ہیں۔

پہلا حصہ معنی : **سودائی نظارہ** : نظارہ کے لیے بیتاب۔ **سراپا اضطراب** : سر سے پاؤں تک بیقراری۔

مطلب: صبح کے لمحات میں جب میری نگاہیں مناظر فطرت کا جائزہ لے رہی تھیں تو میں نے آسمان پر آفتاب کی ایک کرن کو اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر سرگرداں پایا۔ اس کرن سے میں نے استفسار کیا کہ تو کیوں سراپا اضطراب بنی ہوئی ہے۔ آخر تو اس قدر بے چین کیوں ہو رہی ہے اور اس طرح بے صبری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ کیا تو ایک ننھی سی برق ہے۔ آسمان جسے دنیا کے لیے پرورش کر رہا ہے یعنی اگر اقوام عالم کو ایک کھلیان سے تعبیر کر لیا جائے تو تیری حیثیت غالباً اس کھلیان کو خاک کرنے کے حوالے سے دیکھی جا سکتی ہے۔

ابتدائے آفرینش سے تجھ میں جو اضطراب ہے یا عادت ہے مجھے بتا کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ رقص کا انداز ہے یا تجھے کس چیز کی تلاش ہے۔ اتنا بتا دے کہ یہ سب کیا ہے؟

دوسرا حصہ معنی : **ہستی خاموش**: خاموش زندگی۔ **مہر عالم تاب**: دنیا کو روشن کرنے والا سورج۔ **ذوق بیداری**: جاگنے کی لذت۔

مطلب: اقبال کے اس استفسار پر سورج کی وہ کرن زبان حال سے گویا ہوتی ہے کہ اے شاعر ہر چند کہ خامشی اور سکوت پر مبنی ہے اور عملاً میں نے صبح کی آغوش میں پرورش پائی ہے اس کے باوجود نہ جانے کیوں میری تقدیر مجھے مضطرب اور بے چین رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے ہر لمحے روشنی کی تلاش و جستجو [illegible]

پیداوار ہوں اس کے باوجود میری عادتوں میں برق جیسا رویہ موجود نہیں ہے یعنی میں بجلی اور آگ کی طرح کسی شے کو جلا کر خاکستر میں تبدیل کرنے کی قائل نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ سورج جو طلوع کے بعد ساری دنیا کو اپنے احاطے میں لے لیتا ہے اس کی جانب سے کائنات کے لیے بیداری کا پیغام لے کر آئی ہوں۔

میرا کردار تو اے اقبال یہ ہے کہ جس طرح سرمہ آنکھوں میں روشنی پیدا کرتا ہے اسی طرح میں بھی انسانوں کی آنکھوں میں سرمے کی مانند سما جانا چاہتی ہوں تاکہ ان سب مناظر کو واضح کیا جا سکے جو رات کی تاریکی کے سبب ان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے تاہم تجھ سے بھی ایک سوال ضرور پوچھوں گی کہ اے اقبال! کیا تیرے چاہنے والوں میں کوئی ہوش و خرد کا متلاشی ہے اور کیا ان میں نیند سے بیدار ہونے کی خلش بھی موجود ہے؟

142 عرفی

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے — تصدق جس پہ حیرت خانہ سینا و فارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی — میسر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشک عنابی
مرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی — نہیں ہنگامہ عالم میں اب سامان بیتابی
مزاج اہل عالم میں تغیر آ گیا ایسا — کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی
فغان نیم شب شاعر کی بار گوش ہوتی ہے — نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطف بیخوابی
کسی کا شعلہ فریاد ہو ظلمت ربا کیوں کر — گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی
صدا تربت سے آئی "شکوۂ اہل جہاں کم گو — نوارا تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی"

*

معنی: عرفی: اکبری عہد کا شاعر۔ **تصدق:** قربان۔ **سینا و فارابی:** دو مشہور مسلمان فلسفی۔ **اشک عنابی:** عنابی رنگ کے آنسو۔ **فغان نیم شب:** آدھی رات کو آہ و فغاں کرنا۔ **بار گوش:** کانوں کے لیے بوجھ۔

مطلب: زیر تشریح نظم کا مرکزی کردار "عرفی" فارسی زبان کا بلند پایہ شاعر تھا۔ ایران کے شہر "شیراز" کے ایک خاندان میں پیدا ہوا۔ تلاش روزگار کے سلسلے میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں ہندوستان وارد ہوا اور یہاں عبدالرحیم خان خاناں کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ اس نے صرف چھتیس سال کی عمر پائی لیکن فن شاعری میں یکتا تھا۔ اس مختصر عمر میں ہی عرفی نے انتہائی شہرت حاصل کی۔

چنانچہ اس نظم میں اقبال ایک طرح سے "عرفی" کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے عرفی! تیرے بلند پایہ تخیل نے شاعری اور فلسفے کی ایسی عمارت تعمیر کی ہے جس پر بو علی سینا اور فارابی جیسے عظیم فلسفیوں کے نظریات بھی قربان کیے جا سکتے ہیں۔ اپنے اشعار میں عرفی نے عشق کے تصورات و خیالات وضع کیے جن پر آج بھی اہل درد خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک روز میں اس کی قبر پر گیا اور یوں شکوہ سنج ہوا کہ اب دنیا میں وہ اضطراب اور بے چینی کی کیفیت موجود نہیں ہے۔

لوگوں کی طبیعتوں میں ایسا تغیر پیدا ہو گیا ہے کہ اب وہ بالکل پرسکون ہو چلے ہیں۔ اب تو ان کو شاعر کی فغاں نیم شبی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ ان میں وہ جذب و کیف ہی باقی نہیں ہے کہ جو لوگ تاریکی شب کے پرستار ہوں انہیں صبح کی روشنی بھی گراں گزرتی ہے۔

اس لمحے قبر سے آواز آئی کہ اہل دنیا کا شکوہ نہ کر! اگر شعر و نغمہ کا ذوق لوگوں میں مفقود ہو جائے تو اپنی آواز کو زیادہ تلخ اور دردناک بنا لے تاکہ لوگ تیری طرف متوجہ ہو سکیں کہ اونٹنی کے محمل پر وزن بڑھ جائے تو حدی خوانی اور تیز ہو جانی چاہیے۔

143 ایک خط کے جواب میں

ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمت تگ و تاز — حصول جاہ ہے وابستہ مذاقِ تلاش
ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار مری — ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش
مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز — جہاں میں ہوں میں مثال سحاب دریا پاش
یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں — کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش
ہوائے بزم سلاطیں' دلیل مردہ دلی — کیا ہے حافظ رنگیں نوا نے راز یہ فاش
"گرت ہوا ست کہ با خضر ہم نشیں باشی
نہاں ز چشم سکندر چو آب حیواں باش"

*

معنی: **تگ و تاز:** بھاگ دوڑ۔ **ریزہ کار:** باریک کام کرنے والا۔ **سحاب دریا پاش:** دریا جاری کر دینے والا بادل۔ **ہوائے بزم سلاطیں:** بادشاہوں کی محفل میں بیٹھنے کی خواہش۔

مطلب: جس دوست کے خط کے جواب میں علامہ اقبال نے یہ اشعار لکھ کر بھیجے۔ اس حوالے سے مراسلہ نگار اور اس کے ارسال کردہ خط کے متن کے بارے میں اگرچہ مختلف روایتیں ہیں لیکن علامہ کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دوست نے حصول جاہ کے لئے انہیں تحریص دی تھی جب کہ یہ صورت حال اقبال کے مزاج سے قطعی طور پر یگانگت نہیں رکھتی تھی چنانچہ جوابی اشعار میں وہ فرماتے ہیں۔

اول تو مجھے ہر نوع کی شان و شوکت اور منصب و اقتدار کی خواہش ہی نہیں ہے بالفرض ہو بھی تو ان کے لیے جس بھاگ دوڑ' اور تلاش و جستجو کی ضرورت ہوتی ہے وہ کم از کم اس مقصد کے لیے مجھ میں نہیں ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری فطرت باریک بینی سے ہم آہنگ ہے۔ میں تو اپنی قوت بازو سے ہر شے کے حصول کی خواہش رکھتا ہوں اور یہ بھی باری تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں حصول منصب کے لیے منافقت اور فتنہ انگیزی کا قائل نہیں۔

مجھے تو اپنے تخلیقی علم پر بھروسہ ہے اور اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں کہ میری شاعری سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو متاثر اور شگفتہ کرنے والی ہے۔ میں تو اس دنیا میں ایسے بادل کی مانند ہوں جس کے برسنے سے ادراک و شعور کے دریا بنتے اور بہتے ہیں۔ اے مراسلہ نگار دوست! سیاست کے یہ

عقدے جن کی طرف تو نے مجھے راغب کرنے کی سعی کی ہے۔ تجھے ہی مبارک ہوں اس لیے کہ عشق حقیقی کے فیض سے میرے ناخن ہی سینہ خراشی میں مصروف ہیں۔ مراد یہ کہ میں تو اپنے ضمیر کی چبھن سے ہم کنار رہتا ہوں۔ بادشاہوں اور امراء کے درباروں میں تو مردہ دلی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ حافظ شیرازی نے اسی راز کو فاش کرتے ہوئے اپنے ایک شعر میں فرمایا ہے کہ اگر تیرے دل میں خضر کی رفاقت اور اس کی مصاحبت کی خواہش ہو تو جان لے کہ سکندر کی طرح آب حیات کا چشمہ تیری نظروں سے بھی ہمیشہ پوشیدہ رہے گا۔

144 نانک

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی

آہ! بدقسمت رہے آواز حق سے بےخبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

شمع حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارش رحمت ہوئی، لیکن زمیں قابل نہ تھی

آہ! شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
درد انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نور ابراہیمؑ سے آزر کا گھر روشن ہوا

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

*

جیسا کہ سب کو علم ہے گورو نانک سکھ مذہب کے بانی تھے۔ وہ اہل ہنود کی طرح بت پرستی کے قائل نہ تھے اور وحدانیت پر یقین رکھتے تھے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے گورو نانک کو غالباً اسی وجہ سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ نظم آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ چنانچہ علامہ فرماتے ہیں۔

① سے ④ **معنی:** گوتم: مطلب ہے گوتم بدھ۔ گوہر یک دانہ: بے مثال موتی۔

مطلب: یہ مقام افسوس ہے کہ اہل ہند نے گوتم بدھ جیسے بلند مرتبہ انسان کی تعلیمات کی قطعاً پروانہ کی اور انہیں یکسر نظرانداز کر دیا۔ اہل ہند بدقسمت واقع ہوئے تھے کہ گوتم جیسے انسان کے مرتبے اور مقام کو پہچان نہیں سکے۔ جس طرح اپنے پھل کی مٹھاس سے درخت ناواقف ہوتا ہے اسی طرح اہل ہند بھی گوتم بدھ اور ان کی تعلیمات سے بے بہرہ رہے۔ یہ گوتم بدھ ہی تھے جنہوں نے زندگی کے اسرار کو آشکار کیا جب کہ اہل ہند تو محض اپنے خیالی فلسفے پر نازاں رہا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے گوتم کے پیغام کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ دراصل یہ وہ بزم ہی نہ تھی جو شمع حق کی روشنی سے منور ہو سکتی۔ ہند کی سرزمین پر ابر رحمت برسا تو ضرور! لیکن یہ زمین شور ثابت ہوئی۔

⑤ سے ⑧ **معنی:** شودر: ہندوؤں کی ایک ذات۔ مرد کامل: یہاں گورو نانک مراد ہے۔

مطلب: افسوسناک امر یہ ہے کہ شودر یعنی اچھوت طبقے کے لیے ہندوستان ایک غم کدے کی حیثیت

رکھتا ہے۔ یہاں تو کسی کے دل میں انسانی ہمدردی کا شائبہ تک نہیں ہے جب کہ برہمن کو چونکہ اعلیٰ ذات کا ہندو تصور کیا جاتا ہے اس لیے وہ اسی غرور میں مبتلا رہتا ہے اور گوتم بدھ نے معرفت کی جو شمع جلائی تھی اس سے اب غیر استفادہ کر رہے ہیں۔ لیکن گورو نانک کی آمد سے ہند کا جو بتکدہ تھا اس میں ایک عرصے کے بعد وحدانیت کی شمع جلی۔ بالفاظ دگر حضرت ابراہیمؑ کے نور سے بت تراش آزر کا گھر جگمگا اٹھا۔ چنانچہ توحید کی یہ صدا پنجاب سے اٹھی اور ایک مرد کامل نے اہل ہند کو بیدار کر دیا۔

کفر و اسلام

145

تضمین بر شعر میر رضی دانش

ایک دن اقبال نے پوچھا کلیم طور سے
اے کہ تیرے نقش پا سے وادی سینا چمن
آتش نمرود ہے اب تک جہاں میں شعلہ ریز
ہو گیا آنکھوں سے پنہاں کیوں ترا سوز کہن؟
تھا جواب صاحب سینا کہ مسلم ہے اگر
چھوڑ کر غائب کو تو حاضر کا شیدائی نہ بن
ذوق حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمان خلیلؑ
ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن
ہے اگر دیوانہ غائب تو کچھ پروا نہ کر
منتظر رہ وادی فاراں میں ہو خیمہ زن
عارضی ہے شان حاضر، سطوت غائب مدام
اس صداقت کو محبت سے ہے ربط جان و تن
شعلہ نمرود ہے روشن زمانے میں تو کیا
"شمع خود را می گدازد درمیان انجمن
نور ما چوں آتش سنگ از نظر پنہاں خوش است"

*

معنی: آتش نمرود: نمرود کی آگ۔ **سوز کہن:** پرانا سوز یعنی خدا کی محبت۔ **ایمان خلیلؑ:** حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ایمان۔ **خیمہ زن:** خیمہ نصب کرنا یعنی اسلامی تعلیم کا پابند ہونا۔

مطلب: عرفی کی طرح میر رضی دانش بھی فارسی کے شاعر تھے اور شاہجہان کے دور میں مشہد (ایران) سے آئے تھے۔ انہوں نے ایک مقبرے پر دو ہزار روپے انعام حاصل کیا بعد میں وہ دارا شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ دارا شکوہ کو ان کا ایک شعر اس قدر پسند آیا کہ ایک لاکھ روپے انعام دیا۔ اقبال نے انہی میر رضی دانش کے ایک شعر کی تضمین کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایک روز اقبال نے حضرت موسیٰؑ سے استفسار کیا کہ بے شک آپؑ کے نقش قدم کی بدولت "وادی سینا" گلستان بنی ہوئی ہے۔ لیکن اتنا تو بتائیے کہ ابھی تک دنیا میں آتش نمرود بھڑک رہی ہے۔ آخر آپ کا وہ نور کہاں گیا جو کفر و باطل کو جلا کر خاک کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا؟ میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ اگر تو مسلمان ہے تو غائب کو چھوڑ کر سامنے موجود چیزوں کا عاشق نہ بن کہ غائب وجود تو ذات باری تعالیٰ کا ہے۔ ہر چھوٹی بڑی شے بلکہ دونوں جہان اس کے زیر اقتدار ہیں۔ پھر بھی اگر حاضر اشیاء کا زیادہ ذوق رکھتا ہے تو پھر حضرت ابراہیمؑ جیسے پیغمبر کی صفات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ سطحی نظر سے کسی شے کو دیکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ورنہ تیرا عقیدہ تباہی کا سبب بن جائے گا۔

اے اقبال! اگر تو غائب یعنی خالق حقیقی کا پیروکار ہے تو تجھے ہر شے سے بے نیاز ہو جانا چاہیے بلکہ اسلام کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر حالات کے بدلنے کا انتظار کر۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ کائنات میں موجود اشیا کی شان اور افادیت محض عارضی حیثیت کی حامل ہے اور غائب کی شان مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کا تعلق باری تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ بالفرض زمانے میں شعلہ نمرود روشن ہے یعنی کفر و باطل کا دور دورہ ہے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ باطل بھی شمع کی مانند بقول میر رضی دانش پھیل کر ختم ہو جائے گا جب کہ حق و صداقت کا نور پتھر کی آگ کی طرح نظروں سے اوجھل ہے اور اس کا اوجھل رہنا ہی بہتر ہے۔

146 بلال رضی اللہ عنہ

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے — اہل قلم میں جس کا بہت احترام تھا

جولانگہ سکندر رومی تھا ایشیا — گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا

تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے — دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا

دنیا کے اس شہنشہ انجم سپاہ کو — حیرت سے دیکھتا فلک نیل فام تھا

آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں

تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں

لیکن بلالؓ وہ حبشی زادۂ حقیر — فطرت تھی جس کی نور نبوت سے مستنیر

جس کا امیں ازل سے ہوا سینہ بلالؓ — محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر

ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط — کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر

ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز — صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوش چرخ پیر

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے؟

رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے!

*

پہلا بند معنی: پورس: پنجاب کا ایک مشہور راجہ۔ دارا: ایران کا شہنشاہ۔

مطلب: مغرب کا ایک حقیقت پسند دانشور جو انتہائی قابل احترام گردانا جاتا ہے بقول اقبال کہتا ہے کہ ایشیا روم کے جلیل القدر بادشاہ سکندر ایشیا کو ہمیشہ اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندتا رہا۔ مقدونیہ میں پیدا ہونے والا یہ عظیم سپہ سالار اوائل عمری میں ہی ایشیا کے متعدد ممالک فتح کر چکا تھا۔ بظاہر اس کا مرتبہ آسمان سے بھی بلند تھا۔ تاریخ عالم اس امر کی گواہی دے رہی ہے کہ ہندوستان کے پورس اور ایرانی بادشاہ دارا نے اپنی جراءت و ہمت کے دعوے کیے تھے، وہ غلط تھے۔ سکندر کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ سکندر دنیا میں ایسا بادشاہ گزرا ہے جس کی فوجوں کی تعداد ستاروں جتنی تھی۔ اسی لیے غالباً آسمان بھی اس کو حیرت سے دیکھا کرتا تھا۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس سطوت و جلال کے باوجود ایشیا میں آج کوئی شخص اسے جانتا تک نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مورخ بھی اس کے کارناموں سے واقف نہیں۔

دوسرا بند معنی: مستنیر: روشنی حاصل کرنے والی۔ **اسود و احمر:** کالا۔گورا۔ **اختلاط:** فرق۔

مطلب: لیکن بلال جو ایک معمولی حبشی زادہ تھا جس نے انوار نبوتؐ سے روشنی پائی تھی اور آواز اس کے سینے میں خالق حقیقی کی امانت تھی وہ آج بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب پر حکومت کرتی ہے۔ یہی آواز اذان ہے جس کو سن کر دنیا بھر کے مسلمان سجدے میں جھک جاتے ہیں۔ یہی اذان مسلمانوں میں اخوت اور میل جول پیدا کرتی ہے۔ اور جس کے سبب محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر عبادت خداوندی کرتے ہیں۔ وہ صدیوں سے تازگی کی مظہر ہے اور دلوں کو برماتی رہتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ آواز تو نبوت کا فیضِ عام ہے یعنی سکندر جیسا فاتح فنا ہو گیا جب کہ اسی آواز کے طفیل بلال حبشیؓ کو دائمی زندگی حاصل ہے۔

مسلمان اور تعلیم جدید

147

تضمین بر شعر ملک قمی

مرشد کی یہ تعلیم تھی اے مسلم شوریدہ سر
لازم ہے رہرو کے لیے دنیا میں سامان سفر
بدلی زمانے کی ہوا، ایسا تغیر آ گیا
تھے جو گراں قیمت کبھی، اب ہیں متاع کس مخر
وہ شعلۂ روشن ترا، ظلمت گریزاں جس سے تھی
گھٹ کر ہوا مثل شرر تارے سے بھی کم نور تر
شیدائی غائب نہ رہ، دیوانۂ موجود ہو
غالب ہے اب اقوام پر معبود حاضر کا اثر
ممکن نہیں اس باغ میں کوشش ہو بار آور تری
فرسودہ ہے پھندا ترا، زیرک ہے مرغ تیز پر
اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا
ہے خون فاسد کے لیے تعلیم مثل نیشتر
رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
واجب ہے صحرا گرد پر تعمیل فرمان خضر
لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری
"رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد"

*

ملک قمی بھی فارسی زبان کا بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کا تعلق "قم" (ایران) سے تھا۔ اسی مناسبت سے وہ قمی کہلاتا ہے۔ چودھویں صدی میں وہ ہندوستان آیا اور دکن پہنچ کر "ابراہیم عادل شاہ" والی بیجاپور کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ اقبال نے زیر تشریح اشعار ملک قمی کے ایک شعر پر تضمین کرتے ہوئے کہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

معنی: ملک قمی: ایران کا ایک مشہور شاعر۔ **شوریدہ سر:** دیوانہ۔ **متاع کس مخر:** ایسا مال جسے کوئی نہ خریدے۔ **دیوانہ موجود:** موجودہ چیز کا شیدائی۔ **فرسودہ:** پرانا۔ **زیرک:** ہوشیار، چالاک۔ **خون فاسد:** گندہ خون۔

مطلب: مجھے مرشد نے یہ تعلیم دی تھی کہ اے مسلمان! اس دنیا میں ہر راہرو کے لیے لازم ہے کہ ہر لمحے سامان سفر تیار رکھے۔ مراد یہ ہے کہ کسی لمحے بھی اسے موت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا اپنا رخت

سفر ہمیشہ تیار رکھے۔ لیکن اب زمانے کی ہوا اس طرح بدلی ہے اور ایسا انقلاب آیا ہے کہ دنیا کی نادر و نایاب چیزیں بھی اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھیں۔ تجھ میں جو ایک روشن شعلہ تھا وہ تاریکی کا خاتمہ کر دیتا تھا وہ بتدریج ختم ہوتا رہا۔ اب تو اس میں ستارے سے بھی کم روشنی ہے۔ اب تو قوموں پر موجودہ تہذیب کے اثرات اس طرح سے مسلط ہو گئے ہیں کہ وہ خالق حقیقی سے روگردانی کر کے بت پرستی کی طرف مائل ہیں۔

اے اقبال! لگتا تو یوں ہے کہ اس معاشرے میں تیری انقلابی کوششیں بار آور ہو سکیں اس لیے کہ تیرے نظریات فرسودہ ہیں اور تہذیب جدید زیادہ تیز طرار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عہد میں تمام معاشرتی نقائص کا علاج تعلیم اور صرف تعلیم کا حصول ہے۔ فی الواقع تعلیم ہی خون فاسد کے لیے نشتر کی مانند ہے۔

چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ اپنے مرشد کے ارشاد کے سبب میں نے بھی حصول علم کی خاطر دن رات ایک کر دیے لیکن ہوا یوں کہ میں حقیقی راہ سے بھٹک کر رہ گیا۔ معلوم یہ ہوا کہ جدید تعلیم چھوٹے امراض کا علاج تو ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بڑے مرض میں مبتلا کر دیتی ہے اور انسان حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے۔

148 پھولوں کی شہزادی

کلی سے کہہ رہی تھی ایک دن شبنم گلستاں میں ۔۔۔ رہی میں ایک مدت غنچہ ہائے باغ رضواں میں
تمہارے گلستاں کی کیفیت سرشار ہے ایسی ۔۔۔ نگہ فردوس در دامن ہے میری چشم حیراں میں
سنا ہے کوئی شہزادی ہے حاکم اس گلستاں کی ۔۔۔ کہ جس کے نقش پا سے پھول ہوں پیدا بیاباں میں
کبھی ساتھ اپنے اس کے آستاں تک مجھکو تو لے چل
چھپا کر اپنے دامن میں برنگ موج بو لے چل

کلی بولی سریر آرا ہماری ہے وہ شہزادی ۔۔۔ درخشاں جس کی ٹھوکر سے ہوں پتھر بھی نگیں بن کر
مگر فطرت تری افتندہ اور بیگم کی شان اونچی ۔۔۔ نہیں ممکن کہ تو پہنچے ہماری ہم نشیں بن کر
پہنچ سکتی ہے تو لیکن ہماری شاہزادی تک ۔۔۔ کسی دکھ درد کے مارے کا اشک آتشیں بن کر
نظر اس کی پیام عید ہے اہل محرم کو
بنا دیتی ہے گوہر غمزدوں کے اشک پیہم کو

*

پہلا بند معنی: فردوس در دامن: دامن میں بہشت لیے ہوئے۔

مطلب: یہ نظم دو بند پر مشتمل ہے اس میں شبنم اور کلی کا ایک مکالمہ پیش کیا گیا ہے اس کے مطابق ایک روز باغ میں شبنم کلی سے کہہ رہی تھی کہ میں ایک مدت سے باغوں کے پھولوں کی قربت میں قیام پذیر ہوں لیکن یہ تمہارا جو باغ ہے وہ ایسی مست کر دینے والی اور خوشگوار فضا کا حامل ہے کہ جب اس پر نظر ڈالتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بہشت کے کسی منظر میں داخل ہو رہی ہوں۔ میں نے یہ چیز سنی ہے کہ اس باغ کی سربراہ کوئی ایسی شہزادی ہے کہ اگر وہ کسی ویرانے اور صحرا میں بھی چلی جائے تو اس کے

نازک قدموں کے نشان پھول اگاتے چلے جاتے ہیں۔

اے کلی! ابھی تو اپنے ہمراہ اس شہزادی کے پاس لے چل۔ اگر اس میں کوئی قباحت ہے تو اپنے دامن میں اس طرح چھپا کر لے چل جیسے تو نے خوشبو کو چھپایا ہوتا ہے۔

دوسرا بند معنی: سریر آرا: تخت کو زینت دینے والی۔ **افتندہ:** پست، حقیر۔

مطلب: کلی نے شبنم کی گفتگو سنی تو بولی! کہ اے شبنم! واقعی تیری بات بڑی حد تک درست ہے ہماری پھولوں کی شہزادی میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اگر وہ پتھر کو بھی ٹھوکر مارے تو وہ موتی بن کر چمکنے لگتا ہے لیکن تیری اس تک رسائی یوں ممکن نہیں کہ تو ایک ادنیٰ شے ہے اور شہزادی بڑی عالی مرتبت ہے۔ لیکن صرف ایک ایسا ذریعہ ہے جو تجھے اس شہزادی تک پہنچا سکتا ہے کہ تو اگر کسی مصیبت زدہ کا آنسو بن جائے تو شہزادی تک رسائی ممکن ہے۔

اس لیے کہ غمزدہ لوگوں کے لیے ہماری شہزادی مسرت کا پیغام لاتی ہے اور ان کے آنسوؤں کو موتیوں میں ڈھال دیتی ہے۔

تضمین بر شعر صائب 149

کہاں اقبال تو نے آ بنایا آشیاں اپنا
نوا اس باغ میں بلبل کو ہے سامان رسوائی
شرارے وادی ایمن کے تو بوتا تو ہے لیکن
نہیں ممکن کہ پھوٹے اس زمیں سے تخم سینائی
کلی زور نفس سے بھی وہاں گل ہو نہیں سکتی
جہاں ہر شے ہو محروم تقاضائے خود افزائی
قیامت ہے کہ فطرت سو گئی اہل گلستاں کی
نہ ہے بیدار دل پیری، نہ ہمت خواہ برنائی
دل آگاہ جب خوابیدہ ہو جاتے ہیں سینوں میں
نوا گر کے لیے زہراب ہوتی ہے شکر خائی
نہیں ضبط نوا ممکن تو اڑ جا اس گلستاں سے
کہ اس محفل سے خوشتر ہے کسی صحرا کی تنہائی
"ہماں بہتر کہ لیلیٰ در بیاباں جلوہ گر باشد
ندارد تنگنائے شہر تاب حسن صحرائی"

*

محمد علی صائب فارسی زبان کا نغزگو اور بلند پایہ شاعر تھا۔ تبریز میں پیدا ہوا۔ افغانستان آکر فکر معاش میں کابل کے صوبہ دار ظفر خاں کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ آخری عمر میں اصفہان چلا آیا اور یہیں پر وفات پائی۔ اقبال نے اس کے ایک شعر کی تضمین کرتے ہوئے جو اشعار کہے ہیں ان میں خود سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

معنی: تخم سینائی: کوہ سینا کا بیج۔ **تقاضائے خود افزائی:** ترقی کی آرزو۔ **شکر خائی:** میٹھی چیز کھانا یعنی شیریں بیانی۔ **تنگنائے شہر:** شہر کی تنگ جگہ۔

مطلب: اے اقبال! تو نے نہ جانے کیا سوچ کر اس شہر میں قیام کیا ہے جہاں شعر تو الگ رہا زبان سے کوئی بات نکالنا بھی ذلت کا سبب بن جاتا ہے۔ بے شک تو اس بنجر زمین سے امن و ارتقا کا تقاضا کر رہا ہے لیکن اس زمین سے یہ توقعات وابستہ کرنا بے معنی سی بات ہے جہاں افراد میں خود ترقی کرنے اور عملی

جدوجہد کا جذبہ موجود نہ ہو وہاں یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے سانس کی قوت سے کلی کو پھول بنانے کی سعی کی جائے۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ملت اسلامیہ اپنی کارکردگی اور عمل سے محروم ہو چکی ہے نہ اس کے بوڑھوں میں بیداری رہی ہے نا ہی جوانوں میں ہمت و حوصلہ موجود ہے۔ جب باشعور لوگوں میں جذبہ احساس ختم ہو جاتا ہے تو شاعر کے لیے نغمہ گری کا عمل تلخ نوائی کا سبب بن جاتا ہے۔ تیرے لیے بہتر یہی ہے کہ اس بے حس مقام سے کہیں اور چلا جا کہ یہاں سے تو اجاڑ صحرا ہی بہتر ہے۔

صائب کہتے ہیں کہ مردہ دل قوم کے لیے زندہ قوموں کے ترانے بے معنی ہوتے ہیں۔ یہ ترانے تو زندہ قوموں کو ہی زیب دیتے ہیں۔

150 فردوس میں ایک مکالمہ

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز
حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدی شیراز

اے آنکہ ز نورِ گہرِ نظمِ فلک تاب
دامن بچراغِ مہ و اخترِ زدۂ باز

کچھ کیفیتِ مسلمِ ہندی تو بیاں کر
واماندۂ منزل ہے، کہ مصروفِ تگ و تاز؟

مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اس کی رگوں میں
تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمیِ آواز؟

باتوں سے ہوا شیخ کی حالی متاثر
رو رو کے لگا کہنے کہ اے صاحبِ اعجاز

جب پیرِ فلک نے ورقِ ایام کا الٹا
آئی یہ صدا، پاؤ گے تعلیم سے اعزاز

آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی طائرِ دیں کر گیا پرواز

دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز

مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے، جمعیتِ ملت ہے اگر ساز

بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی
ظاہر ہے کہ انجامِ گلستاں کا ہے آغاز

پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

یہ ذکر حضورِ شہِ یثرب، میں نہ کرنا
سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

٭

① سے ④ **معنی**: **ہاتف**: غیبی فرشتہ۔ **واماندۂ منزل**: چلتے چلتے راستے میں تھک کر بیٹھ جانا۔ **فلک سوز**: آسمان جل جانا۔

مطلب: زیر تشریح نظم ایک تصوراتی مکالمے پر مبنی ہے جس کے دو کردار شیخ سعدی اور مولانا حالی ہیں۔ منظر بہشت ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مجھ سے ہاتف غیبی (غیب سے آواز دینے والا فرشتہ) نے کہا کہ اک روز بہشت میں شیخ سعدی اور مولانا حالی یکجا ہو گئے۔ علیک سلیک کے بعد شیخ سعدی نے استفسار کیا کہ بے شک آپ نے اپنی شاعری سے ہر بلند و پست شے کو منور کر دیا۔ ازراہ کرم مجھے ہندوستان کے مسلمانوں

کے حالات سے آگاہ کیجیے۔ کہ وہ عملی جدوجہد میں مصروف ہیں یا کہیں تھک کر تو نہیں بیٹھ گئے۔ یہ فرمایئے کہ وہ لوگ جن کی صداؤں کی حرارت و تپش سے آسمان کے فرشتے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کیا اب ان کی کیفیت وہی ہے؟ کیا ان میں اپنے مذہب کی حرارت باقی ہے۔ کہ اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہی وہ کامرانی حاصل کر سکتے تھے۔

⑤ سے ⑦ **معنی**: ورقِ ایام: زمانے کی کتاب کا ورق۔ تزلزل: خرابی۔

مطلب: مولانا حالی نے جس وقت شیخ سعدی کی باتیں سنیں تو وہ ان سے متاثر ہو کر حالی کی آنکھوں میں اشک بھر آئے اور جواباً بولے! کہ صاحب اعجاز حقیقت یہ ہے کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوا اور یورپ سے آ کر فرنگی مسلط ہو گئے تو یہ فطری امر ہے کہ اپنی تہذیب، تعلیم اور زبان بھی ہمراہ لے کر آئے۔ تو مسلم زعماء نے سوچا کہ اب اس جدید تعلیم کو اپنائے بغیر ملت کامیابی کے مرحل طے کر سکتی ہے نہ اس معاشرے میں باوقار انداز میں بسر اوقات کر سکتی ہے لیکن اس جدید تعلیم کا ردعمل یہ ہوا کہ مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہو کر رہ گئے چنانچہ صورت یہ ہے کہ دنیاوی عزو جاہ تو کسی حد تک حاصل ہو گیا لیکن مذہب کا تصور دھندلا پڑ گیا۔

⑧ سے ⑨ **معنی**: زمیں گیر: پست۔ زخمہ: مضراب۔ جمعیت: جماعت۔

مطلب: اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے مولانا حالی نے کہا "اگر دین باقی رہا ہو تو پھر مقاصد میں بھی بلندی پیدا ہو جاتی ہے لیکن جب دین ہی باقی نہ رہے تو نوجوانوں سے کسی کارِ خیر کی توقع عبث ہے۔ ان میں الحاد کے تاثرات پیدا ہو جائیں تو یہ ایک فطری امر ہے۔ مذہب کے طفیل ہی ملت کے افراد میں اتفاق و اتحاد برقرار رہ سکتا ہے اور اسی کے سبب ملت عملی جدوجہد کے لیے متحرک رہتی ہے۔

⑩ سے (13) **معنی**: خرما: کھجور۔ دیبا: اون۔ پشم: مخمل یا ریشم۔

مطلب: چنانچہ یہ جان لینا چاہیے کہ کسی عمارت کی بنیاد لرز جائے تو اس عمارت کے انجام کا آغاز ہو چکا ہے یعنی ملت نے اپنے اصولوں کو چھوڑ کر خود اپنے زوال کا سامان پیدا کر لیا ہے۔ ملت کا استحکام تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ اپنے اصولوں اور تعلیمات پر مضبوطی سے قائم رہیں۔

تاہم اب صورت احوال یہ ہے کہ جدید تہذیب کے سبب مسلم نوجوانوں نے اپنی تعلیمات کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے تو ان کا الحاد کی طرف مائل ہو جانا کوئی حیران کن بات نہیں۔ شیخ صاحب! میں نے حقیقت آپ کے روبرو رکھ دی ہے لیکن خدا کے لیے آنحضرتؐ کے دربار میں حاضری دیں تو اس صورت حال کا ذکر نہ کرنا ورنہ ہندی مسلمان مجھے چغل خور سمجھیں گے اور آخر میں آپ کے ہی ایک شعر کے حوالے سے کہتا ہوں کہ ہم نے جو کانٹے بوئے ان سے کھجور حاصل کرنے کی توقع عبث ہے اور جو اون ہم نے تیار کی اس سے حریر و پرنیاں اور ریشم تیار نہیں ہو سکتا۔

151

مذہب

تضمین بر شعر میرزا بیدل

تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستیِ غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام، وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش
"با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش"

*

معنی: پیر: عالم، سائنسدان۔ **ہستیِ غائب:** ذاتِ خداوندی سے مراد ہے۔ **برہمن:** برہمن کی طرح۔ **جنونِ خام:** جنون کی ابتدائی حالت۔ **انتعاش:** بلند ہونا۔ **مرشدِ کامل:** میرزا بیدل کی طرف اشارہ ہے۔

مطلب: یہ تضمین جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے پٹنہ (بہار) کے ممتاز فارسی شاعر اور نثر نگار میرزا عبدالقادر بیدل کے ایک شعر پر اقبال نے تخلیق کی ہے۔ روایت ہے کہ میرزا بیدل انتہائی زود گو شاعر تھے انہوں نے کم و بیش ایک لاکھ شعر تخلیق کیے۔

اقبال کہتے ہیں کہ مغرب کے جدید فلسفیوں نے اپنے اس نقطہ نظر کی تبلیغ میں سر پیر کا زور لگایا دیا ہے کہ وہ لوگ نادان اور احمق ہیں جو اس دنیا میں رہتے ہوئے ایسی ہستی کو حقیقتِ مطلق تصور کرتے ہیں جو ہمیشہ نگاہوں سے غائب رہی ہے اور بظاہر اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ مسلمان زعماء بھی غیر مسلموں کی طرح خدا کے وجود سے غافل ہو کر ظاہری اشیا یعنی بتوں کو سب کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ علومِ جدید کی بنیاد حواسِ خمسہ پر ہے۔ اسی سبب آج دنیا بھر کے مذہبی عقائد ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

مغربی دانشوروں کے نزدیک مذہب ایک ناپختہ جنون کی حیثیت رکھتا ہے۔ بس اسی ناپختہ جنون کی بنیاد پر مذہب پر یقین رکھنے والے لوگوں کے حوصلے بلند رہتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ ان مغربی دانشوروں کے مقابلے پر میرزا بیدل نے اپنے کمالِ علم کی بنیاد پر یہ راز فاش کیا ہے کہ دنیا میں ہر کمال کے لیے تھوڑا سا جنون اور دیوانگی بھی درکار ہوتی ہے۔ خواہ اس کمال کا تعلق عقلِ کل سے ہی ہو۔ جنون کے بغیر تو عقلِ کل بھی بے معنی شے ہے۔

152

جنگِ یرموک کا ایک واقعہ

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند
تھی منتظر حنا کی عروسِ زمینِ شام

اک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب
آ کر ہوا امیرِ عساکر سے ہمکلام
اے بوعبیدہ رخصتِ پیکار دے مجھے
لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام
بیتاب ہو رہا ہوں فراقِ رسولؐ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضورِ رسالتؐ پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
یہ ذوق و شوق دیکھ کے پُرنم ہوئی وہ آنکھ
جس کی نگاہ تھی صفتِ تیغِ بے نیام
بولا امیرِ فوج کہ "وہ نوجواں ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیںؐ میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پہ کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے"

*

میدان یرموک اردن میں شام کے قریب واقع جہاں ایک زمانے میں شام کی حکمرانی ہوا کرتی تھی۔ یہ وہ میدان ہے جہاں پندرھویں ہجری میں حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کی سپہ سالاری میں صرف بیس ہزار مسلمان سپاہیوں کے لشکر نے روم کے ان عساکر کو شکست فاش دی جن کی تعداد دو لاکھ بتائی جاتی ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح نے اس معرکے بعد فاتح شام کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس جنگ کے آغاز میں ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا جس کو اقبال نے ان اشعار میں نظم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

① سے ⑤ **معنی:** حنا: مراد خون ہے۔ **صورت سیماب مضطرب:** شوق شہادت میں بیتاب۔ **امیر عساکر:** سپہ سالار۔ **بوعبیدہ:** ایک صحابیؓ۔

مطلب: میدان جنگ میں رومی افواج کے مقابلے پر عرب افواج کے تیغ و تلوار سے مسلح دستے صف آرا تھے اور شام کی سرزمین پر ہر دو افواج کے سرفروشوں کا خون بہنے والا تھا۔ اس لمحے مسلمان افواج سے ایک نوجوان بڑی تیزی سے اپنی صف سے برآمد ہوا اور امیر لشکر حضرت ابوعبیدہؓ سے دست بستہ درخواست کی کہ میرا صبر و سکوں دشمنوں سے نبرد آزمائی کے لیے رخصت ہو چکا ہے لہٰذا مجھے سب سے پہلے جنگ کی اجازت دیجیے۔ اس لیے کہ میں تو آنحضرتؐ کی جدائی میں بیتاب ہو رہا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ عشق رسولؐ میں ایک لمحے کی زندگی بھی حرام ہے۔ بندہ پرور! میں تو بلا تاخیر آنحضرتؐ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا خواہاں ہوں۔ ہاں اگر آپ ان کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں تو میں بخوشی حضورؐ تک پہنچا دوں گا۔

⑥ سے ⑩ **معنی:** **تیغ بے نیام:** ننگی تلوار۔ **غیور:** غیرت مند۔

مطلب: لشکر اسلام کے امیر ابو عبیدہ ایک لمحے تک خاموش رہے اور اس نوجوان میں راہ حق میں شہادت کا جوش و خروش دیکھ کر شدت جذبات سے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ہرچند کہ ان نگاہوں میں تلوار کی سی کاٹ تھی پھر بھی آنسو بہنے لگے۔ وہ نوجوان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ تیری شہادت کی آرزو رب ذوالجلال پوری کرے تاہم یہ ثابت ہو گی کہ حضورؐ سے تیری محبت کا مقام بہت بلند ہے۔

اے نوجوان! جب تو اپنی مراد پالے اور بارگاہ رسالتؐ میں پیش ہو تو اس غلام کی جانب سے بعد از سلام دست بستہ گذارش کرنا کہ ہم پر رب ذوالجلال نے اپنی رحمتوں کی بارش کر دی ہے اور حضورؐ نے امت مسلمہ سے جو وعدے کیے تھے وہ ایک ایک کر کے پورے ہو رہے ہیں۔

153 مذہب

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

*

معنی: اقوام مغرب: یورپی اقوام۔

مطلب: اس مختصر سی نظم میں اقبال مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے اپنی ملت اور اس کی تعلیمات کا تقابل اقوام مغرب سے نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اپنی ترتیب و تنظیم کے اعتبار سے آنحضرتؐ کی امت دنیا بھر کی دوسری قوموں سے قطعی مختلف واقع ہوئی ہے۔ مغربی اقوام کا دارومدار تو خطہ ارض اور ان کی نسل و خون کی نسبت پر ہے جب کہ اے مسلمان تیری جمعیت کا انحصار اتحاد اور مذہب کی قوت پر ہے انہی کے سبب ملت میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

اے مسلمان! یہ نکتہ ذہن نشین کر لے کہ اگر تو نے دین کو ترک کر کے مغرب کے لوگوں کی طرح مذہب کو ذاتی اور انفرادی معاملہ تصور کر لیا تو تیری جمعیت کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا اور جمعیت کا خاتمہ ہوا تو قوم و ملت کا وجود ختم ہو کر رہ جائے گا۔

154 پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور
خالی ہے جیب گل زر کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوت اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے
شاخ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

*

معنی: سحاب: بادل۔ زر کامل عیار: بالکل کھرا سونا۔ شاخ بریدہ: کٹی ہوئی شاخ۔ قاعدۂ روزگار:

زمانے کا قاعدہ۔ **استوار**: مضبوط۔ **پیوستہ**: چمٹا رہ۔

مطلب: علامہ اقبال کہتے ہیں کہ موسم خزاں سے اگر کوئی شاخ جھڑ کر درخت سے جدا ہو گئی تو بہار کے موسم میں کتنے ہی بادل برسیں وہ شاخ کسی مرحلے پر بھی شاداب و سرسبز نہیں ہو سکتی۔ خزاں کا موسم اس شاخ کے لیے لازوال حیثیت کا مالک ثابت ہو گا اور اس شاخ کا درخت کے دوسرے پتوں اور شاخوں کے ساتھ کوئی ربط و تعلق نہیں رہے گا۔ جب کہ اے مسلمان تیرے گلستان میں بھی ایک طرح سے خزاں کے دور کا تسلط ہے اور ملت ہر نوع کی صلاحیت سے عاری ہو چکی ہے۔ تیری ملت کے زعماء جن کی رہنمائی سے حالات روبہ اصلاح تھے وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

اے مسلمان! درخت کی اس جھڑ جانے والی شاخ سے سبق حاصل کر کہ تو آج بھی زمانے کے دستور سے آگاہ نہیں ہے۔ تیری بہتری اسی میں ہے کہ ملت و قوم کے ساتھ اپنا رابطہ برقرار رکھے اور خزاں کے بعد متوقع موسم بہار سے تعلقات استوار کرے۔

155 شب معراج

اختر شام کی آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

*

معنی: **رہ یک گام**: ایک قدم کا فاصلہ۔ **عرش بریں**: قرب الٰہی سے مراد ہے۔ **معراج**: لغوی معنی سیڑھی۔

مطلب: ہرچند کہ یہ انتہائی مختصر نظم محض دو اشعار پر مشتمل ہے مگر موضوع کو پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اقبال نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ شب معراج کے ساتھ بحیثیت شاعر خود ان کی فکری عظمت کی دلیل ہے۔ فرماتے ہیں کہ

آسمان کی وسعتوں سے ستارہ شام کی آواز آ رہی ہے کہ "شب معراج" ایسی عظمتوں والی رات ہے جس کو سحر بھی سجدہ کرتی ہے یعنی اس کا احترام کرتی ہے۔ یہی "شب معراج" مسلمانوں کو سبق دے رہی ہے کہ ہمت تو زمین سے عرش بریں کا فاصلہ صرف ایک قدم کی راہ ہے۔

156 پھول

تجھے کیوں فکر ہے، اے گل! دل صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے
تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے، پابگل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے
تنک بخشی کو استغنا سے پیغام خجالت دے
نہ رہ منت کش شبنم، نگوں جام و سبو کر لے

نہیں یہ شانِ خودداری، چمن سے توڑ کر تجھکو
کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زیبِ گلو کر لے
چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
مذاقِ جورِ گل چیں ہو، تو پیدا رنگ و بو کر لے
اگر منظور ہو تجھکو خزاں نا آشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے
اسی میں دیکھ! مضمر ہے کمالِ زندگی تیرا
جو تجھکو زینتِ دامن کوئی آئینہ رو کر لے

*

معنی: اے گل: مراد ہے مسلمان۔ پابگل: ایک جگہ گڑا ہے۔ **تنگ بخشی:** معمولی بخشش۔ **استغنا:** بے نیاز۔ **خجالت:** ندامت۔ **نگوں:** اوندھا۔ **جہان رنگ و بو:** دنیا کی گوناگوں دلفریبیاں۔ **آئینہ رو:** یعنی محبوب۔

مطلب: اقبال زیر تشریح نظم میں پھول سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے پھول! بلبل کا دل اگر کسی کے فراق میں ریزہ ریزہ ہوتا ہے تو تجھے اس کی اتنی فکر کیوں ہے کہ تیرے لبادے میں جو چاک ہیں پہلے ان کو رفو کرنے کی فکر کر۔ مراد یہ کہ دوسروں سے ہمدردی جتانے سے پہلے اپنے بریدہ دامن کا جائزہ بھی تو لینا چاہیے۔ اگر اس گلزار ہستی میں آبرو اور عزت و وقار کی خواہش ہو تو اس کے لیے یہ لازم ہے کہ کانٹوں کے مابین زندہ رہنے کی عادت بھی اختیار کر لی جائے۔ مراد یہ ہے کہ زندگی تو بے پناہ مشکلات سے عبارت ہے اس کو باوقار طریقے پر گزارنے کے لیے یہ امر لازم ہے کہ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی عادت ڈال لی جائے۔ یہ کامیابی اور کامرانی کا واحد راستہ ہے۔

صنوبر کا درخت ہر نوع کے پھل سے بے نیاز ہے۔ اسی لیے اس درخت کو آزاد تصور کیا جاتا ہے۔ اس آزادی کے باوجود وہ پابند بھی ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں تو بھی صنوبر کی طرح سے آزادی حاصل کر لے کہ وہ آزاد بھی ہے اور ایک حد تک پابند بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مادر پدر قسم کی آزادی تو کسی مرحلے پر بھی مفید نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شخص تجھے برائے نام فیاضی سے ممنون احسان کرنا چاہے تو تیری انا کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی فیاضی کو قبول نہ کرے کہ میرے ایک دوسرے شعر کے مطابق اگر کسی پیاسے کو سمندر سے شبنم کے محض چند قطرے دستیاب ہوں تو یہ رزاقی اور فیاضی نہیں بلکہ انتہائی کنجوسی کا مظاہرہ ہے۔ اگر تیرے پیانے میں کوئی شراب کے محض چند قطرے ڈالنا چاہے تو ان کو قبول کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنا پیانہ الٹا کر رکھ دے یعنی شراب کے چند قطروں کو قبول کرنے سے بہتر یہ مناسب ہے کہ پیانہ خالی ہی رہے۔

یہاں ایک بار پھر اقبال پھول سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ شان خودداری تو نہیں کہ باغ میں جا کر کوئی تجھ کو شاخ سے توڑ لے اور پھر کوئی اپنی پگڑی میں لگا لے تو کوئی ہار میں پرو کر گلے کی زینت بنا لے۔ شبنم اس راز کو غنچۂ گل پر منکشف کر کے اڑ گئی کہ اگر تجھے پھول توڑنے والے کے ظلم برداشت کرنے کا حوصلہ ہے تو اس کے لیے اپنے دامن میں رنگ و بو پیدا کر لے مراد یہ کہ **گلچیں** تو محض پھول کو اسی وقت توڑنے کا خواہش مند ہوتا ہے جب وہ اس میں رنگ و بو محسوس کر لیتا ہے۔ اے پھول اگر تو چاہتا ہے کہ تجھے کبھی خزاں سے واسطہ نہ پڑے تو پھر رنگ و بو کے حصول سے اجتناب کر۔ بلکہ اس اجتناب سے قبل رنگ و بو کے حصول کی خواہش ترک کر دے۔

اس ساری صورت حال کے برعکس اے پھول! تیری زندگی کا کمال اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ

تجکو کوئی خوبصورت چہرہ اپنے دامن کی زینت بنا لے۔

اس نظم میں اقبال بظاہر پھول سے مکالمہ کرتے ہیں اور اس مکالمے میں کچھ متضاد باتیں بھی آ گئی ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے عارفانہ انداز کلام میں کچھ ایسے نکتوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن کا تعلق حیات انسانی سے ہے۔ ان مرحلوں میں پھول کو محض علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

157 شیکسپئیر

شفق صبح کو دریا کا خرام آئینہ نغمۂ شام کو خاموشی شام آئینہ
برگ گل آئینۂ عارض زیبائے بہار شاہد مے کے لیے حجلۂ جام آئینہ
حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن دل انساں کو ترا حسن کلام آئینہ
ہے ترے فکر فلک رس سے کمال ہستی
کیا تری فطرت روشن تھی مآل ہستی

تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا تاب خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا
چشم عالم سے تو ہستی رہی مستور تری اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا
حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

*

زیر تشریح فرمائشی نظم دو بند پر مشتمل ہے۔ فرمائشی اس لیے کہا گیا ہے کہ ایک روایت کے مطابق شیکسپئیر کے بارے میں دنیا بھر کے بڑے بڑے شعراء سے نظمیں لکھوانے کی تحریک چلی۔ ان نظموں کے انگریزی تراجم بعد میں کتابی شکل میں شائع کیے گئے۔ اقبال نے بھی دنیا کے اس ممتاز ڈرامہ نگار اور شاعر کے بارے میں یہ نظم لکھی۔

پہلا بند معنی: شاہد مے: محبوبہ شراب۔ حجلہ جام: پیالے کی جلوہ گاہ۔

مطلب: اس بند میں اقبال کہتے ہیں کہ علی الصبح جب شفق پھوٹتی ہے اور اس کا سرخ عکس بہتے دریا پر پڑتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شفق کے لیے دریا کا شفاف رواں پانی آئینے کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح شام کے وقت نغمہ ریزی کے لیے اس لمحے کا سکوت آئینے کا کام دیتا ہے۔ بہار کے خوبصورت رخسار کے لیے پھولوں کی پتیاں بھی آئینے کی مثال ہوتی ہیں اور پیمانہ شراب کے لیے آئینے کا کام دیتا ہے۔ اسی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت اور سچائی کے لیے حسن آئینے کی صفت رکھتا ہے۔ اس منظر نامے میں اگر شیکسپئیر کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو وہ قاری کے لیے انسانی نفسیات کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لیے آئینہ ہے۔

اقبال اس شعر میں شیکسپئیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں تیرے بلند فکر کلام نے انسان کو زندگی کے حالات سے روشناس ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ کیا تیری روشن فطرت زندگی کے انجام سے عبارت تھی۔ یا پھر تیرے بعد تجھ سا دوسرا کوئی پیدا نہیں ہوا؟ اس سوال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال

شیکسپیئر کی خلاقانہ صلاحیت کے کس قدر قائل تھے۔

دوسرا بند معنی: مستور: چھپا ہوا۔ حفظ اسرار: بھید چھپانا۔ سودا: جنون۔

مطلب: یہاں اقبال کہتے ہیں کہ اے شیکسپیئر! تو وہ عظیم تخلیق کار ہے کہ جب بھی کسی مداح نے تیرا دیدار کرنا چاہا تو اس طرح محسوس کیا جیسے سورج کی تیز اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی میں سورج کے وجود کو دیکھ رہا ہے۔ ہر چند کہ دنیا کی نگاہوں سے تیرا وجود پوشیدہ رہا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ تیری بصیرت افروز نگاہوں نے ساری کائنات کو عریاں اور بے پردہ دیکھ لیا۔

آخری بات یہ ہے کہ اپنے رازوں کو چھپانے کا فطرت کو ایسا جنون ہے کہ تیرے بعد شاید کوئی شخص تخلیق نہ کیا جا سکے جو تیری طرح فطرت کے رازوں کو افشا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

158 میں اور تو

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا — میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آزری

میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ، رمیدہ بو — میں حکایتِ غمِ آرزو، تو حدیثِ ماتمِ دلبری

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفسِ عدم — ترا دل حرم، گروِ عجم، ترا دیں خریدۂ کافری

دمِ زندگی رمِ زندگی، غمِ زندگی سمِ زندگی — غمِ رم نہ کر، سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے "مدارِ قوتِ حیدری"

کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا — کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے — کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے — وہی فطرتِ اسد اللہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

*

یہ نظم علامہ اقبال کے مخصوص طرزِ فکر کی آئینہ دار ہے جس میں انہوں نے اپنی ذات اور ملت کے جملہ افراد کے کردار کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اقبال کو دراصل مسلمانوں کے سیاسی اور اخلاقی زوال کا جو دکھ تھا اسے وہ اپنے شاندار ماضی کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ ان کے عہد میں مسلمانوں کی جو صورت حال تھی اس کے پیشِ نظر ان کے کرب میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کرب کا اظہار ان کی بیشتر نظموں اور اشعار میں ہوتا ہے اس ساری کیفیت کے باوجود وہ بہت کم مایوس نظر آتے ہیں۔ رجائیت کی ایک واضح لہر اقبال کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔ چنانچہ زیرِ تشریح نظم میں وہ یوں گویا ہوتے ہیں۔

①② **معنی:** شیوۂ آزری: آزر کا طریقہ مراد بت پرستی۔ در گلو: حلق میں۔ حدیثِ ماتم: ماتم کا افسانہ۔

مطلب: اے عصرِ جدید کے مسلمان! میں دیکھتا ہوں کہ اپنی تمام تر سخنوری کے باوجود مجھ میں حضرت موسیٰؑ کی کلیمی کا کوئی عنصر موجود نہیں ہے اور جہاں تک تیری ذات اور کردار کا تعلق ہے تو بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی کسی ایک سنت سے بھی بہرہ ور نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں کلیم ہونے کی بجائے

میں بھی سامری جیسے ساحر کے زیر اثر آ گیا ہوں۔ اور تو بھی اپنے صحیح راستے سے ہٹ کر آزر کی مانند بت گری اور بت فروشی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہوں۔ میری مثال دیکھا جائے تو اس بلبل کے مانند ہے جس کی آواز اس کے گلے میں تحلیل ہو کر رہ گئی ہو۔ اور تیری کیفیت اس پھول کی سی ہے جس کا رنگ بھی اڑ چکا ہے اور خوشبو بھی اس کو داغ مفارقت دے گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں خصوصیات کے بغیر پھول ایک مجہول و مفلوج وجود بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تو اپنی آرزوؤں کے غم کی حکایت بن چکا ہوں اور تو محبوبیت کے ماتم کا مظہر بن چکا ہے۔

③④ **معنی**: سم: زہر۔

مطلب: ان حالات میں عیش و مسرت میرے لیے غم و اندوہ کا روپ دھار چکے ہیں۔ میرے لیے اب شہد بھی زہر کی مانند تلخ ہو چکا ہے۔ اس لمحے میرا وجود' عدم وجود' زندگی اور موت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح تیرا دل جو حرم کعبہ کی مانند پاکیزہ تھا اب غیر اسلامی عقائد و تصورات کے پاس رہن رکھا ہوا ہے جب کہ تو نے اپنے دین کو کافرانہ خیالات کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ زندگی کا ایک ایک سانس جو گزر رہا ہے زندگی کو کم کر رہا ہے۔ اور اسے خاتمے کی طرف لے جا رہا ہے اور یہ ساری صورت حال ہمیں غم زدہ کر رہی ہے۔ یہ غم فی الواقع ایک زہر کی مانند ہے جو آخر کار ہماری زندگیوں کا خاتمہ کر کے رکھ دے گا۔ لیکن ہمیں زندگی کے گزارنے اور اس غم کے زہر کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ قلندروں کی شان یہی تو ہے۔

⑤⑥ **معنی**: نان شعیر: جو کی روٹی۔

مطلب: اے مسلمان! اگر تیرے وجود میں غیرت اور حمیت کی کوئی چنگاری باقی رہ گئی ہے تو تجھ افلاس و امارت کا خیال ہی نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ شیر خدا حضرت علیؓ کی تمام تر قوت کا انحصار جو کی روٹی پر تھا۔ یہی ان کی خوراک جو کی روٹی ہی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے خیبر کا در اکھاڑ پھینکا۔ اے چراغ حرم! میں تیرے گرد طواف تو کر رہا ہوں لیکن کوئی ایسا طریقہ بتا دے کہ تیرے دیوانے اور شیدائی کو مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا کوئی گر حاصل ہو جائے۔

⑦ سے ⑨ **معنی**: ہری ہری: خدا خدا۔ **ستیزہ گاہ**: جنگ کا میدان۔ **پنجہ فگن**: پنجہ آزمانے والے۔ **مرحبی**: ایک یہودی۔ یہاں مراد ہے اسلام دشمن۔

مطلب: دنیا بھر کے مسلمانوں سے کعبے کو جو شکایت ہے اگر میں اس کا اظہار کسی بت کدے میں کروں تو وہاں رکھے ہوئے بت بھی اظہار ہمدردی کے طور پر توبہ توبہ کرنے لگ جائیں کہ حرم کعبہ جو دین کی عظمت کی علامت ہے ہم نے اس کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے اور مخالف قوتوں کے ہمنوا بن گئے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں بے شمار انقلابات آئے جنہوں نے بے شمار تہذیبوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اس کے باوجود دیکھا جائے تو صورت حال میں کوئی بنیادی اور واضح تبدیلی رونما نہیں ہوئی کہ آج بھی معاشرتی سطح پر ساری دنیا میں حق و باطل کے مابین آویزش جاری ہے۔ ایک جانب مرحب و عنتر جیسے لوگ باطل کو فروغ دینے کی سعی میں مبتلا ہیں۔ دوسری جانب شیر خدا حضرت علیؓ مرتضیٰ حق کی حمایت میں تیغ بکف ہیں۔

آخری شعر میں اقبال آنحضرتؐ سے رجوع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے عرب و عجم کے مالک ہم پر کرم کر۔ کہ ہم اگرچہ بھکاری ہیں لیکن تیری تعلیمات نے ہمارے مزاج میں سکندر جیسی مملکت پیدا کردی ہے۔

159 اسیری

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند

مشک اذفر چیز کیا ہے، اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

"شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند"

*

یہ نظم اپنے پس منظر کے اعتبار سے ان نظموں میں سے ایک ہے جو اقبال نے خالصتاً سیاسی موضوعات کے حوالے سے کہیں اور مختلف سیاسی اجتماعات میں پڑھیں۔ ہرچند کہ یہ نظم تحریک خلافت کے دوران مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی گرفتاری اور رہائی کے بعد امرتسر کے ایک جلسہ عام میں سنائی گئی لیکن موضوع اور چویشن کے اعتبار سے یہ آج بھی اسی قدر تر و تازہ ہے جتنی کہ 1919ء میں تھی۔ اس لیے کہ حکومتوں کے خلاف احتجاج اور گرفتاریوں کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہا ہے اور ان کی نوعیت میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اقبال نے اسیری اور زنداں کو کس رخ سے دیکھا ہے۔ ان اشعار سے اندازہ ہو سکے گا۔ فرماتے ہیں کہ:

معنی: **اعتبار افزا:** قدر و منزلت بڑھانا۔ **قطرۂ نیساں:** سیپی میں ابر بہار کی بوند۔ **مشک اذفر:** خالص مشک۔ **نافہ آہو:** ہرن کی ناف۔ **شہپر:** بال و پر۔ **زاغ و زغن:** کوا اور چیل۔

مطلب: اگر فطرت بلند ہو تو اسیری اور نظربندی انسانی وقار میں اضافے کا سبب بنتی ہے اس کی مثال وہ بارش کے ایک معمولی قطرے سے دیتے ہیں جو سیپی میں بند ہو کر ایک نایاب موتی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح وہ مشک کے حوالے سے یک دوسری مثال بھی پیش کرتے ہیں کہ خالص مشک خون کا ایک قطرہ ہی تو ہے جو ہرن کی ناف میں منجمد ہو کر خالص مشک کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور نایاب شے بن جاتا ہے۔ لیکن قدرت اس انداز میں ہر کسی کی تربیت نہیں کرتی۔ دنیا میں کم ہی ایسے پرندے ہیں جنہیں جال اور پنجرے میں رکھا جاتا ہے۔ بقول حافظ شیرازی اگرچہ کوے اور چیل بلند پرواز ہیں لیکن انہیں کوئی پنجرے میں بند نہیں کرتا۔ یہ امتیاز تو محض شاہین اور عقاب کو حاصل ہے۔

160 دریوزۂ خلافت

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی
مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

*

معنی: گدائی: بھیک مانگنا۔

مطلب: گذشتہ نظم "اسیری" میں تحریک خلافت کے ضمن میں اقبال نے جو گول مول رویہ اختیار کیا ہے اس کی توجیح زیر تشریح نظم سے ہو جاتی ہے۔ اقبال تحریک خلافت کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ اقتدار کوئی بھیک میں نہیں دیتا بلکہ قوت بازو سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی واضح مثال پہلی عالمی جنگ میں ترکی پر انگریزوں کا تسلط اور ہندوستانی مسلمانوں سے ان کی بدعہدی تاریخی شواہد کے طور پر علامہ کے سامنے تھیں۔ بعد میں حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ ترکی کے ضمن میں اقبال کی سوچ صدفی صد درست تھی اور ہندوستانی مسلمانوں کی جانب سے چلائی ہوئی تحریک خلافت بے جواز تھی۔ بعد میں ترک جرنیلوں نے ہی انگریزوں سے لڑ کر اپنے وطن کو آزاد کرایا۔

زیر تشریح نظم میں اقبال کہتے ہیں کہ اے ملت اسلامیہ کے فرزندو! بے شک یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ تمہارے ملک پر دوسرے لوگ مسلط ہو جائیں لیکن اگر ملک ہاتھوں سے چلا بھی گیا ہے تو احکام حق سے بے وفائی کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ وہ استفسار کرتے ہیں کہ آج تم لوگ خلافت کی گدائی کرنے لگے ہو۔ تو کیا تمہیں تاریخ سے واقفیت حاصل نہیں ہے۔ تاریخ تو واضح طور پر اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ حکومت اور سلطنت مانگنے سے نہیں ملا کرتی بلکہ قوت بازو سے حاصل ہوتی ہے اور یہ کہ جس بادشاہی کو اپنے لہو سے نہ خریدا جائے وہ تو مسلمانوں کے لیے باعث ننگ ہے۔ اقبال کہتے ہیں میرے نزدیک اپنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے علاج کی خاطر غیروں سے مرہم حاصل کرنا بے غیرتی کی بات ہے۔

161 ہمایوں

(مسٹر جسٹس شاہ دین مرحوم)

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی
تیری چنگاری چراغ انجمن افروز تھی
گرچہ تھا تیرا تن خاکی نزار و درد مند
تھی ستارے کی طرح روشن تری طبع بلند
کس قدر بیباک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلہ گردوں نورد اک مشت خاکستر میں تھا

شب کی خاموشی میں جز ہنگامہ فردا نہیں موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

*

میاں دین محمد کا شمار پنجاب کے ان زعماء میں کیا جاتا ہے جو بیسویں صدی کے اوائل میں اس خطہ ارض کی عزت و تکریم کا سبب تھے۔ وہ اقبال کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ 1918ء میں وفات پائی تو اقبال نے یہ تعزیتی اشعار لکھے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جسٹس دین محمد شاعر بھی تھے اور "ہمایوں" تخلص کرتے تھے۔ مرحوم کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میاں بشیر احمد نے اپنے والد کے نام پر ہی بلند پایہ ادبی رسالہ "ہمایوں" جاری کیا۔ خود اقبال کی بیشتر نظمیں اسی جریدے میں شائع ہوتیں۔

معنی: نزار: نحیف، کمزور۔ **شعلہ گردوں نورد:** آسمان کو لپیٹ میں لینے والا شعلہ۔ **مشتِ خاکستر:** خاک کی ایک مٹھی۔

مطلب: زیرِ تشریح اشعار میں اقبال فرماتے ہیں۔ اے ہمایوں! تیری زندگی تو ملت کے لیے سراپا سوز کی حیثیت رکھتی تھی۔ تیری ذات ایک ایسے چراغ کے مانند تھی جو ساری محفل کے لیے روشنی کا سبب بنتا ہے۔ ہرچند کہ تیرا جسم ناتواں خاک کا ایک مختصر سا تودہ تھا لیکن تیری روشن طبع تو ستاروں کی طرح سے منور تھی۔

اے ہمایوں! جو لوگ تیری شخصیت سے آشنا تھے وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ تیرے ناتواں جسم میں کس قدر بیباک اور نڈر دل موجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس مٹھی بھر مٹی میں ایک ایسا شعلہ موجود تھا جس کی لپک آسمان تک جاتی تھی۔

لیکن دانشمند لوگ موت کی قطعی پروا نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ رات کے سکوت میں آنے والی کل کے ہنگامے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ موت کو احمق لوگ زندگی کے خاتمے سے تعبیر کرتے ہیں جب کہ یہ زندگی کی شام تو انسان کو ہمیشگی بخشنے والی صبح کے مانند ہے۔

162

خضرِ راہ

شاعر

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر گوشہ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر انجم کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگِ شباب

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرار ازل
چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامہ محشر ہوا
میں شہید جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

اے تری چشم جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش

"کشتی مسکین" و "جان پاک" و "دیوار یتیم"
علم موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقہ دیرینہ چاک
نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

گرچہ اسکندر رہا محروم آب زندگی
فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

آگ ہے، اولاد ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

163

جواب خضر

صحرانوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے؟
یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اے رہین خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں، وہ سفر بے سنگ و میل

وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیلؑ

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیلؑ

اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں
اہل ایماں جس طرح جنت میں گرد سلسبیل

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

زندگی

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے

سوئے گردوں نالہ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیہ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقہ گردن میں ساز دلبری

خون اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی، صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک
نغمہ بیداری جمہور ہے سامان عیش
قصہ خواب آور اسکندر و جم کب تلک
آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
دوری جنت سے روتی چشم آدم کب تلک
باغبان چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک

کرمک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

دنیائے اسلام

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبور نیاز
لے رہا ہے مے فروشان فرنگستاں سے پارس
وہ مے سرکش، حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند؟

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
حق ترا چشمے عطا کر دست غافل در نگر
مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مور بے پر! حاجتے پیش سلیمانے مبر

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات | ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو | ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے | نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا | ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی | اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار | لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی | اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج | موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے | اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود | مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں | آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس | سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر **لا یخلف المیعاد** دار

*

زیر تشریح نظم اقبال کی طویل نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم کی تشکیل حضرت خضر علیہ السلام اور ایک شاعر کے مابین مکالمے سے ہوئی ہے۔ حضرت خضرؑ کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے تاہم ان کے بارے میں جو مختلف روایات مشہور ہیں۔ ان کے مطابق وہ ایک ایسے پیغمبر ہیں۔ حق تعالیٰ نے جن کو طویل عمر عطا کی ہے۔ بالفاظ دگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ازل سے ابد تک دنیا میں موجود رہیں گے۔ اور بھٹکے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ اقبال نے اپنے اشعار میں بے شمار مقامات پر حضرت خضرؑ اور ان کے خصوصی کردار کا ذکر کیا ہے۔ اس مکالمے سے بھی اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت خضرؑ کی رہنمائی کو اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ نظم کا آغاز شاعر کے مکالمے سے ہوتا ہے۔ جس میں وہ شاعر کی زبان سے یوں گویا ہوتے ہیں۔

پہلا بند معنی: **سکوت افزا:** خاموشی کو بڑھانے والی۔ **گہوارے:** پنگھوڑا۔ **افسوں:** جادو۔ **انجم کم ضو:** کم روشنی والے ستارے۔ **طلسم:** جادو۔ **پیک جہاں پیما:** دنیا کی سیر کرنے والا قاصد۔ **جویائے اسرار:** راز کے متلاشی۔

مطلب: شاعر کہتا ہے کہ ایک شاعر رات میں ساحل دریا پر سرگرداں پھر رہا تھا۔ ان لمحات میں نہ جانے میرا دل کس لیے اضطراب اور بے چینی میں مبتلا تھا۔ وہ رات انتہائی سکوت آمیز تھی۔ ساحل پر خوشگوار ہوا کا دور دورہ تھا اور اسی مناسبت کے ساتھ دریا بھی بڑی آہستگی اور نرم روی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ اس لمحے دریا کا نظارہ کرتے ہوئے مجھے حیرانی اس امر کی تھی کہ یہ دریا ہے یا پھر پانی کی تصویر

ہے۔ دریا کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے گہوارے میں کوئی شیر خوار بچہ خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہو۔ یا پھر پانی کی مضطرب موج تھک تھکا کر محو خراب ہو۔ ان لمحات میں پرندے اپنے آشیانوں میں رات کے سحر میں گرفتار ہو کر سو رہے تھے۔ اور کم روشنی والے ستارے غالباً چاند کے طلسم میں گرفتار تھے۔

اس لمحے سامنے نظر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ساری دنیا کی رہنمائی کرنے والا حضرؑ روبرو کھڑا ہے اور اس کی ضعیفی میں بھی صبح کی طرح عالم شباب کا رنگ موجود ہے۔ چند لمحے تک خاموش رہنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر یوں گویا ہوا کہ اے شاعر! تو جو ابتدائے آفرینش سے کائنات کے تمام رازوں سے آگاہی رکھنے والا ہے۔ اس حقیقت کو بھی پوری طرح جان لے کہ دل کی آنکھیں روشن ہوں تو پوری کائنات کی تقدیر اور اس کے بارے میں تفصیلات واضح ہو کر پردے سے باہر آ جاتی ہیں۔

حضرت خضرؑ کی زبان سے یہ نکتہ میری سماعت سے ٹکرایا تو دل میں ایک محشر سا بپا ہو گیا۔ میں تو ابتداء سے ہی حقیقت کی تلاش و جستجو میں مگن رہا تھا۔ حضرت خضرؑ سے مخاطب ہو کر بولا۔

دوسرا بند : معنی : چشم جہاں بیں: دنیا کو دیکھنے والی آنکھ۔ **کشتی مسکین، جان پاک، دیوار یتیم:** یہ تینوں تلمیحات ہیں۔ **آب زندگی:** (تلمیح) آب حیات۔ **ہاشمی:** ترکوں کی طرف سے مکہ میں شریف مکہ مقرر ہوا۔ **اولاد ابراہیم:** مراد ہے مسلمان۔

مطلب: اے خضرؑ! بے شک تو وہ صاحب بصیرت انسان ہے جس کی نگاہیں ان طوفانوں سے بھی آگاہی رکھتی ہیں جو ابھی خاموشی کے ساتھ دریا میں محو خواب ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تو ان انقلابات سے بھی واقف ہے جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ اگلے شعر میں اقبال "سورہ کہف" میں بیان کردہ ایک واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک یتیم و مسکین کی کشتی کو خراب کرنے، ایک بے گناہ بچے کا قتل اور ضیافت سے انکار کر دینے کے باوجود یتیم بچے کی دیوار کو از سر نو تعمیر کرنا اور ان کے بارے میں حضرت موسیٰؑ کے اعتراضات اور سوالات سے اس امر کی غمازی ہوتی ہے کہ نبیؑ ہونے کے باوجود حضرت موسیٰؑ جیسے پیغمبر کا علم بھی تیرے سامنے حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اے خضرؑ! آخر یہ کیا تماشا ہے کہ تو آبادیوں کو چھوڑ کر صحرا نوردی میں مبتلا رہتا ہے اور تیری زندگی دیکھا جائے تو رات دن کے علاوہ آج اور کل یعنی ماضی و مستقبل کے تصورات سے قطعی آزاد ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیری ذات ہر نوع کے سرد و گرم سے بے نیاز واقع ہوئی ہے لیکن اتنا بتا دے کہ یہ جو انسان کی زندگی ہے اس کا حقیقی بھید کیا ہے؟ سلطنت و حکومت کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ جو سرمایہ و محنت کے مابین آویزش ہے اس کی بنیاد کیا ہے؟ یعنی سرمایہ دار اور محنت کش کے مابین تصادم کی فضا کیوں قائم ہے۔

اے خضرؑ دانا! آج صورت حال یہ ہے کہ ایشیائی ممالک کی تہذیب و ثقافت دم توڑ رہی ہے اور نئی نئی اقوام ہیں کہ اقتدار حاصل کر رہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ نئی نسلیں ان تازہ ترقی پذیر قوموں کے انداز و اطوار اپنا رہی ہیں۔ ہر چند کہ سکندر جیسا اولوالعزم فاتح پوری کوشش اور جدوجہد کے باوجود آب حیات سے محروم رہا اور ہمیشگی کی زندگی نہ اپنا سکا اس کے باوجود آج بھی سکندر کی مانند جنگ و جدل اور فتح و شکست کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ ہاشمی جن کے طفیل ساری دنیا میں اسلام وسعت پذیر ہوا آج ناموس رسولؐ مقبول کو داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں اور ترک جو ایک عرصے تک اسلام کے مخالف رہے، اب اس کی بقا کے لیے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں۔

ماضی کی طرح حضرت ابراہیمؑ کی اولاد اور نمرود کے مابین آویزش جاری ہے یعنی حق و باطل میں بدستور تصادم ہے اتا جاتا کہ کیا اب بھی مسلمان امتحان کے مراحل سے گزر رہے ہیں؟

جوابِ خضر

صحرانوردی

تیسرا بند : معنی : تگاپوئے : دوڑ دھوپ۔ **دمادم** : مسلسل۔ **رہین خانہ** : خانہ نشیں۔ **بانگ رحیل** : قافلے کی رحلت کی صدا۔ **حضر** : قیام' پڑاؤ۔ **سنگ و میل** : راستہ کا نشان۔ **نمود اختر سیماب** : تیز رفتار ستارہ۔ **خلیلؑ** : حضرت ابراہیمؑ کا لقب۔ **سلسبیل** : جنت کی ایک نہر۔ **زنجیری** : قیدی' اسیر۔ **کشت و نخیل** : کھیت اور باغات۔

مطلب : شاعر کے استفسارات کے جواب میں خضرؑ یوں گویا ہوتے ہیں کہ اے شاعر! میں جو صحرانوردی کے شغل سے دوچار ہوں تو تجھے آخر میرے اس عمل پر تعجب کس لیے ہے کہ میری یہ مسلسل بھاگ دوڑ اور جدوجہد عملاً زندگی کی دلیل ہے۔ اے گھر کی چار دیواری تک محدود رہنے والے شاعر! تو نے وہ منظر نہیں دیکھا جب صحرا میں قافلے رواں دواں ہوتے ہیں اور ان کے اونٹوں کی گھنٹیاں عالم سکوت میں نغمے بکھیرتی ہیں۔ ریت کے ٹیلے پر ہرن بڑی بے نیازی کے ساتھ چوکڑیاں بھر رہا ہوتا ہے اور قافلے بغیر سامان کے کسی سنگ میل کی رہنمائی کے بغیر سفر کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ ہر نوع کی پابندیوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور صبح کے وقت جب سیمابی فطرت رکھنے والے ستارے طلوع ہوتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان کی بلندی سے حضرت جبرئیلؑ کی پیشانی نمودار ہو رہی ہے۔

اے شاعر! تو اس منظر سے کیسے آشنا ہو سکتا ہے جب کہ شام کے سمے صحرا کے سکوت میں سورج غروب ہو رہا ہو یہی منظر حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی وسعت نظر میں اضافے کا سبب بنا۔ پھر جب قافلے تھک کر پانی کے چشمے پر قیام کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جنت میں سلسبیل کے گرد اہل ایمان جمع ہوں جو لوگ عشق و محبت کے جویا ہوتے ہیں وہ تو نئے نئے صحراؤں کی جستجو میں رہتے ہیں جب کہ تیری ذات محض آبادی تک محدود رہتی ہے۔

اے شاعر! حقیقت یہ ہے کہ مسلسل گردش اور صحرانوردی ہی حرکت اور عمل کی دلیل ہوتے ہیں چنانچہ حقیقی زندگی کا راز یہی ہے۔

زندگی

چوتھا بند : معنی : اندیشہ : فکر۔ **سود و زیاں** : نفع نقصان۔ **تسلیم جاں** : جان قربان کرنا۔ **امروز و فردا** : آج اور کل۔ **سر آدم** : آدم کی تخلیق کا راز۔ **کوہکن** : پہاڑ کھودنے والا (مراد فرہاد)۔ **جوئے شیر** : دودھ کی نہر۔ **بحر بیکراں** : بے کنارا سمندر۔ **تسخیر** : فتح۔ **مانند حباب** : بلبلے کی مانند۔ **شمشیر بے زنہار** : پناہ نہ دینے والی

تلوار۔

مطلب: آغاز نظم میں اقبال نے شاعر کی وساطت سے صحرا نوردی‘ زندگی‘ سلطنت اور بعض دوسرے عوامل کے ضمن میں جو سوالات اٹھائے تھے ان کا فرداً فرداً جواب دیتے ہوئے صحرا نوردی کے بعد اس بند میں خضرؑ اس طرح سے زندگی کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار کرتے ہیں کہ اے شاعر! زندگی تو ایک ایسا عمل ہے جو نفع نقصان کے تصور سے بلند ہوتا ہے۔ کہ زندگی کا صحیح مفہوم اس حقیقت میں ہی مضمر ہے کہ زندگی کو اس کے حقیقی تناظر میں دیکھا جائے اس لیے کہ کسی مرحلے پر تو زندگی جان و مال کے تحفظ کا نام ہے اور کسی مرحلے پر راہ حق میں جان و مال قربان کرنے کا نام زندگی ہے۔

اے شاعر! تو زندگی کو آج اور کل کے پیمانے سے کیوں ماپ رہا ہے۔ یہ تو ہر دم موجود رہنے والی ہے اور ہر دم جوان و زندہ شے ہے۔ اگر تجھ زندہ رہنے والے لوگوں میں شامل ہونے کا شوق ہے تو اس کے لازم ہے کہ دوسروں کی جدوجہد پر قناعت کرنے کی بجائے اپنی دنیا خود پیدا کر۔ اسی صورت میں تو یہ جان سکے گا کہ تخلیق آدم کا راز اور دنیا میں ہر شے کے وجود کا کرشمہ زندگی کے عمل سے ہی عبارت ہے۔

اے شاعر! اگر تو فی الواقع زندگی کی حقیقت جاننے کا خواہاں ہے تو اس ضمن میں فرہاد سے رجوع کر جس نے اپنے مقصد عشق کو حاصل کرنے کے لیے پہاڑ کاٹ کر وہاں سے دودھ کی نہر جاری کرنے کا کام کیا تھا۔ اس سے خود بخود اندازہ ہو سکے گا کہ زندگی عیش و عشرت کا نام نہیں بلکہ عمل اور سخت کوشی کا نام ہے۔ یہ بھی جان لے کہ زندگی کا عمل غلامی میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے جب کہ آزادی میں یہی زندگی وسعت پذیر ہو کر بحر بے کنار کی مانند ہو جاتی ہے۔ ہرچند کہ یہ اس کا تعلق خاک کے عنصر سے ہے لیکن اس میں دوسروں کو تسخیر کرنے کی بے پناہ صلاحیت بھی موجود ہے۔

اے شاعر! اگر ہستی کو ایک سمندر تسلیم کر لیا جائے تو تیرا وجود اس میں ایک بلبلے کی مانند ہے اور سچ پوچھیے تو یہاں یہ زندگی تیرے لیے ایک آزمائش اور امتحان کی حیثیت کی حامل ہے۔

یہ جان لے کہ جب تک تیری زندگی کا عمل ناپختہ ہے تو تیرا وجود محض ایک مٹی کے ڈھیر کی مانند ہے لیکن جب پختہ ہوا تو پھر شمشیر آبدار کی طرح ہے۔

پانچواں بند : **معنی** : **مستعار**: مانگے ہوئے۔ **خاکستر**: راکھ۔ **لعل گراں**: قیمتی پتھر۔ **نالہ شبگیر**: رات کو گھیرے میں لینے والی فریاد۔ **عرصہ محشر**: محشر کا میدان۔

مطلب: خضرؑ کہتا ہے کہ اے شاعر! اس حقیقت کا ادراک بھی تیرے لیے لازم ہے کہ جس دل میں سچائی کے لیے مرنے کی تڑپ موجود ہوتی ہے تو اس کے لیے عمل ناگزیر ہے کہ پہلے وہ اپنے خاکی جسم میں قوت عمل پیدا کرے۔ یہ زمین و آسمان تو ایک طرح سے بنے بنائے ہیں۔ قوت عمل تو اس امر کا نام ہے کہ انسان اپنا زمین و آسمان خود تخلیق کرے۔ مراد یہ ہے کہ مستعار لی ہوئی کوئی شے اتنی کار آمد نہیں ہوتی بلکہ نفسیاتی سطح پر اس کے اچھے اثرات مرتب نہیں ہوتے اس لیے انسان پر لازم ہے کہ جو کچھ حاصل کرے وہ اپنی محنت اور قوت بازو سے حاصل کرے۔ زندگی میں جو قوت پوشیدہ ہے اس کو آشکار کرنا بھی ضروری ہے کہ یہی قوت ابدی حیثیت کی حامل ہتوی ہے۔ کامیابی و کامرانی کے لیے مشرق میں سورج کی مانند چمکنا بھی ناگزیر ہے۔ یہی عمل ماضی کی مثبت کارکردگی کی طرف لے جا سکتا ہے اور یہاں پہلے کی طرح ممتاز دانشور‘ فلاسفر اور صاحب فن پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ تیری آسمان تک رسائی ہو تیری

گرفت ستاروں پر بھی ہونی چاہیے۔

اے شاعر! یہ نہ بھول کہ تیرا عہد قیامت کی طرح ابتلاء کا عہد ہے جس کے لیے فرد پر لازم ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی اچھا کام اعمال نامے میں موجود ہے تو اسے پیش کیا جائے۔ مراد یہ کہ محض ترقی پانے کی خالی خولی خواہش سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ کامیابی کے لیے قوت عمل درکار ہوتی ہے۔

سلطنت

چھٹا بند : معنی : آیہ ان الملوک: سورۂ نمل کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہی فساد برپا کر دیتے ہیں۔ **سلطنت**: یہاں مراد توسیع ملک سے ہے۔ **ساحری**: جادوگری۔ **خون اسرائیل**: حضرت موسیٰ جو بنی اسرائیل سے تھے۔ **طلسم سامری**: سامری کا جادو۔ **سروری**: سرداری۔ **ذات بے ہمتا**: ذات بے مثال۔ **مکن**: نہ کر۔ **خواجہ**: آقا۔ **برہمن**: بت پرست۔ **نوائے قیصری**: شہنشاہیت کی صدا۔ **استبداد**: ظلم۔ **پائے کوب**: ناچنے والا۔ **اعضائے مجالس**: قانون ساز اسمبلی کے ایوان عام اور ایوان خاص۔ **الاماں**: خدا محفوظ رکھے۔ **سراب**: دھوکہ۔

مطلب: شاعر نے چونکہ خضرؑ سے استفسارات میں سلطنت کے بارے میں بھی سوال کیا تھا کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ چنانچہ اس کے جواب میں خضرؑ نے کہا کہ اے شاعر! آ میں تجھے اس حوالے سے قرآن پاک کی ایک سورۃ کی معنویت بتاتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ سلطنت صرف اور صرف طاقتور لوگوں کی طرف سے کمزور لوگوں کا استحصال کرنے اور ان پر حکمرانی کرنے کا نام ہے۔ مراد یہ کہ جو قوم طاقتور ہو گی وہ کمزور قوموں پر حکمرانی کر کے ان کا استحصال کرتی رہے گی۔ یہ عمل تو ایک ایسے طلسم کے مانند ہے کہ اگر کوئی کمزور قوم یا فرد اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور استحصالی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے تو طاقتور حکمران اپنے سحرانگیز حربوں سے ان کی قوت مدافعت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس طرح اپنا جابرانہ نظام مسلط کیے رکھتے ہیں۔ اے شاعر! جان لے کہ ایسے حکمران جب غلام قوموں پر اپنا طلسم بکھیرتے ہیں تو وہ طوق غلامی پر بھی فخر کرنے لگ جاتے ہیں۔ محمود و ایاز اور اسی نوعیت کی مثالیں ایک واضح کیفیت کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن یہ صورت حال ایک حد تک قائم رہتی ہے کہ جب غلام قوموں پر حقیقت حال واضح ہوتی ہے تو ان کی غیرت و حمیت جاگ اٹھتی ہے اور جس طرح حضرت موسیٰؑ نے سامری کے طلسم کا توڑ کر کے اپنی قوم کو حقیقت حال سے باخبر کر کے بیدار کر دیا تھا اسی طرح کوئی بھی غلام اٹھ کر استحصالی قوتوں کو ختم کر دیتا ہے اور اپنی قوم کو آزادی کی نعمت سے مالامال کر دیتا ہے۔

اے شاعر! یہ ایک حقیقت ہے کہ حکمرانی تو صرف رب ذوالجلال کی ذات تک محدود ہے۔ صرف خدا ہی حقیقی حکمران ہے باقی سب لوگ مصنوعی حیثیت کے حامل ہیں۔ کہ یہ ان کی حکومتیں عارضی ہوتی ہیں جو کبھی بنتی ہیں اور کبھی ٹوٹ جاتی ہیں۔ لہٰذا تجھے چاہیے کہ اپنی آزاد فطرت کو غلامی سے رسوا اور بدنام نہ کرے۔ اس کے برعکس اگر تو خدائے واحد کے سوا کسی اور کو اپنا آقا تصور کرے گا تو جان لے کہ تو برہمن سے بھی بڑا کافر ہے۔ مغرب کا نیا نظام جسے دنیا بھر کے سیاستدان اور دانشور جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں فی الواقعہ وہی پرانا نظام ہے جو بادشاہت اور قیصریت سے ہم آہنگ رہا ہے۔ جمہوریت تو ایک

ایسے دیو کے مانند ہے ظلم و ستم جس کا شعار ہے۔ بد قسمتی سے تو اسے انفرادی آزادی کا پیغام لانے والا تصور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ جمہوری نظام میں عوام کی زندگی کو منظم کرنے' ان کی فلاح کے لیے ادارے قائم کرنے اور لوگوں کو رعایتیں اور حقوق دینے کے لیے جو ادارے قائم کیے گئے ہیں وہ مغربی استعماریت کا ایسا نسخہ ہے جس کے اثرات بظاہر شیریں ہیں لیکن لوگوں کو اپنے حقوق سے غافل کر دیتا ہے اور یہ اسمبلیاں اور ان کے ارکان کی پر جوش تقریروں سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ عوامی مسائل چشم زدن میں حل ہو جائیں گے لیکن غور کیجیے تو یہ سرمایہ داروں کی طرف سے مزید دولت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

اے شاعر! یہ جمہوریت کا نظام تو ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں جب کہ تو اسے ملک و ملت کے مفاد کے لیے بہترین طرز عمل سمجھے بیٹھا ہے۔ دیکھا جائے تو اس سراب کو رنگ و بو سے مزین گلستان سمجھا ہوا ہے بلکہ اس قدر نادان ہے کہ قفس کو بھی اپنے آشیاں سے تعبیر کر رہا ہے۔

سرمایہ و محنت

ساتواں بند : معنی : **پیام کائنات** : کائنات کے دل کی آواز۔ **شاخ آہو** : ہرن کا سینگ۔ **برات** : حصہ (مراد ہے رزق)۔ **دست دولت آفریں** : دولت پیدا کرنے والا ہاتھ۔ **مزد** : مزدوری۔ **اہل ثروت** : امیر لوگ۔ **زکات** : مراد بخشش۔ **ساحر الموط** : الموط کا جادوگر (مراد سرمایہ دار)۔ **مسکرات** : وہ چیزیں جو نشہ پیدا کرتی ہیں۔ **سکر** : نشہ۔

مطلب : خضرؑ پہلے سوالات کے جوابات کے بعد سرمایہ و محنت کے بارے میں شاعر نے جو سوال کیا تھا اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اے شاعر! تو سرمایہ محنت کے حوالے سے بندۂ مزدور کو جا کر یہ پیغام سنا دے اور یہ امر خود بھی ذہن نشین کر لے کہ یہ پیغام صرف میرا ہی نہیں بلکہ پوری کائنات کا پیغام ہے چونکہ ذرا غور سے دیکھا جائے تو مختلف مسائل پر ساری کائنات پیغام دیتی نظر آتی ہے کہ مزدور یہ حقیقت ہے کہ تیری محنت کا پھل بہانے بہانے سے سرمایہ دار کھا جاتے ہیں۔ تیری محنت سے سرمایہ دار ہی فائدہ اٹھاتا ہے اور تجھے اس کا برائے نام معاوضہ حاصل ہوتا ہے۔ تو دولت اپنی محنت سے پیدا کرتا ہے لیکن اس کا معمولی سا معاوضہ سرمایہ دار اس انداز سے دیتا ہے جیسے تجھے زکوٰۃ کی رقم دے رہا ہو۔ یعنی محنت کش کو اس کی محنت کا پھل اس طرح دیا جاتا ہے جیسے اس پر احسان کیا جا رہا ہو۔

فی الواقعہ دیکھا جائے تو سرمایہ دار حسن بن صباح کی مانند ہے۔ حسن بن صباح اپنے معتقدین کو بھنگ پلا کر مدہوش کر دیتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انہیں دنیا کی بہت بڑی دولت مل رہی ہے۔ سرمایہ دار بھی مزدوروں کو ان ۔ ، حقوق سے غافل کرنے کے لیے اسی طرح سے جل دیتا ہے اور بے چارہ محنت کش اپنی ناعاقبت اندیشی کے سبب ہر کو بھی مصری کی ڈلی سمجھ کر نگل لیتا ہے۔ سرمایہ داروں نے نسل' قومیت' عبادت گاہیں' سلطنت' تہذیب اور رنگ کے ایسے ایسے نشے ایجاد کر رکھے ہیں اور محنت کش انہی کو سب کچھ سمجھتے ہوئے سرمست و سرشار ہو جاتا ہے حالانکہ یہ سب عناصر سرمایہ دار کے استحصالی نظام کے ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کہ عام مزدور انہی عناصر کے نشے کے سبب اپنے ذاتی اثاثے سے بھی

محروم ہو جاتا ہے حالانکہ بغور دیکھا جائے تو مکر و فریب کی چالوں کے سبب سرمایہ دار محنت کشوں کا سب کچھ سمیٹ کر لے جاتے ہیں اور غریب مزدور اپنی سادگی کی بنا پر ہمیشہ مار کھا جاتا ہے۔

لیکن اے مزدور اس خواب غفلت سے بیدار ہو کہ یہ استحصالی نظام اب زیادہ دیر جاری نہیں رہنا چاہیے۔ کائنات کی فضا بدل چکی ہے اور اب تو مغرب ہو یا مشرق، ہر جگہ بہر حال ساری دنیا میں تیرے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ مراد یہ کہ حالات ایسے پیدا ہو رہے ہیں جب مروجہ استحصالی نظام بدلے گا اور سرمایہ دار، مزدور کے حقوق غصب نہیں کر سکیں گے۔

اے شاعر! اگر انسان میں بلند ہمتی اور حوصلہ ہو تو وہ شبنم کا قطرہ تو الگ رہا اسے دریا بھی بخش دیا جائے تو وہ اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ جب کہ معمولی مراعات سے اب بھی دھوکہ دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ آخر تو ان پر کب تک قناعت کرے گا ذرا بغور دیکھ کہ اصل حقیقت تو عوام کی بیداری میں پوشیدہ ہے۔ آخر سکندر و جمشید جیسے بادشاہوں کے مبہوت کرنے والے واقعات کب تک سنے گا۔ دیکھ کہ زمین کے بطن سے ایک نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ آخر ان ستاروں کا ماتم کب تک کرے گا جو عرصہ ہوئے ڈوب چکے ہیں۔ انسانی فطرت نے آج ان تمام زنجیروں کو توڑ ڈالا ہے جو استعماری نظام نے مسلط کی تھیں۔ یہ درست ہے کہ آدم کا جنت سے نکلنا ایک بڑا سانحہ تھا لیکن اب اس سانحہ کو یاد کر کے کیوں ذہنی کرب کا شکار ہوا جائے جس طرح پھولوں کا کھلنا ایک فطری امر ہے اسی طرح محنت کشوں کی بیداری بھی ایک فطری امر ہے۔ اب اس میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

اس شعر میں خضرؑ ایک بار پھر محنت کشوں کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کراتا ہے کہ اپنے معمولی معمولی مفاد کے لیے سرمایہ داروں کے گرد طواف کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا بلکہ اپنی عظمت کا احساس کرو اور اپنے حقوق جس طرح بھی ممکن ہیں حاصل کر لو۔

دنیائے اسلام

آٹھواں بند : معنی : پنہاں: چھپا ہوا۔ **تثلیث**: باپ، بیٹا اور روح یعنی عیسائی۔ **میراث خلیلؑ**: مسلمانوں کا ورثہ۔ **خشت**: اینٹ۔ **کلاہ لالہ رنگ**: سرخ ٹوپی۔ **پارس**: ایران۔ **مے سرکش**: تند و تیز شراب۔ **مینا گداز**: صراحی کو پگھلا دینے والی۔ **گاز**: سونا کاٹنے کی قینچی۔ **ارزاں**: سستا۔ **بنائے کہنہ**: پرانی بنیاد۔

مطلب: زیر تشریح نظم میں اقبال نے شاعر کے کردار کے توسط سے مختلف موضوعات کے بارے میں خضرؑ سے جو استفسارات کیے ہیں یہ آٹھواں بند "دنیائے اسلام" کے حوالے سے ہے۔ تئیس اشعار پر مشتمل اس نظم کا یہ آخری اور سب سے طویل بند ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس نظم میں آغاز سے انجام تک ایک ایسی کیفیت موجود ہے جو قاری کو نہ صرف یہ کہ متاثر کرتی ہے بلکہ ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے اور شروع سے ہی جس طرح نظم آگے بڑھتی جاتی ہے اس میں زیادہ روانی اور زور پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ طویل نظم ایک طرح سے "بانگ درا" ہی نہیں بلکہ اقبال کی پوری شاعری میں بے حد اہم نظموں میں سے ایک ہے۔

مزید براں اس نظم کے موضوعات اور ان کی تفہیم کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ ان کو اقبال کے فلسفے کے تناظر میں ہی دیکھا جائے۔ اقبال نے یہاں اظہار کے لیے جو موضوعات منتخب کیے ہیں ان میں "صحرا نوردی' زندگی' سلطنت' سرمایہ و محنت اور اسلام کو بطور خاص پیش نظر رکھا ہے اور جس فنی مہارت' نفسیاتی اپچ اور فکری حوالوں کے ساتھ ایسے مباحث کو شامل کیا گیا ہے جن کا اظہار کم از کم شاعری میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ان مباحث سے اس امر کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں رہتا کہ شاعری کے ابتدائی دور میں (بانگ درا کی تکمیل تک) اقبال کے نظریات کیا تھے۔

اقبال "زندگی" کو اول و آخر ہمیشہ مثبت انداز میں دیکھتے اور پرکھتے رہے ہیں۔ سلطنت کے حوالے سے وہ نہ آمریت کے قائل تھے (خواہ وہ کسی شکل میں بھی ہو) نا ہی جمہوریت پر یقین رکھتے تھے۔ سلطنت و جمہوریت والے بند میں انہوں نے جس انداز سے یہ موضوع زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے اس سے اختلاف کی گنجائش تو بے شک ہو سکتی ہے لیکن پاکستان کا مروجہ جمہوری نظام' اسمبلیاں اور انتخابات پھر ملکی معیشت اور عوام کے مسائل کے پیش نظر ان کی باتیں بڑی حد تک درست نظر آتی ہیں۔

بہر حال یہ طے ہے کہ "خضر راہ" ایک ایسی نظم ہے جو ہمارے مروجہ نظام کے لیے ایک آئینے کی حیثیت رکھتی ہے۔ "محنت و سرمایہ" کی آویزش کے ساتھ محنت کش اور سرمایہ دار کا کردار اقبال نے جس مہارت سے پیش کیا ہے۔ اس پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ نظم کا آخری طویل حصہ اسلام کے بارے میں ہے۔ اس موضوع پر اقبال نے نظم اور نثر میں بہت کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مذہب کو وسیع النظری کے حوالے سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیر' ملا' واعظ اور اسی نوعیت کے دوسرے کردار ان کی شاعری میں کسی مرحلے پر بھی مثبت تاثر پیدا نہیں کر سکے۔ بہر حال ان مختصر سی گزارشات کے ساتھ اب نظم کی طرف آیئے۔ وہ فرماتے ہیں:

خضر عالم اسلام کے بارے میں استفسار پر شاعر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے شاعر! تو مجھے ترک و عرب یعنی عالم اسلام کی داستان کیا سناتا ہے؟ کہ میں اس سے پوری طرح سے آگاہ ہوں اور اس ضمن میں مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا ورثہ تو اب مسلمانوں کی بجائے عیسائیوں نے حاصل کر لیا اور حجاز کی جو خاک تھی وہ اب کلیسا کی تعمیر میں کام آ رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مغرب کی سیاست نے ملت مسلمہ کی شان و شوکت کو زیر و زبر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترک جیسی اولوالعزم قوم کی سرخ ٹوپی جو ساری دنیا میں باعث افتخار سمجھی جاتی تھی اب بدنام اور رسوا ہو کر رہ گئے ہیں۔ دوسری طرف اہل ایران اپنی تہذیب و تمدن اور اس کے تشخص سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور مغرب کی نقالی میں مصروف ہیں۔ یہی اسباب ہیں کہ اہل یورپ کی سیاست اور عیاری کے سبب ملت مسلمہ اس طرح پارہ پارہ ہو چکی ہے جیسی قینچی سونے کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتی ہے۔ آج تمام دنیا میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح سے بہہ رہا ہے اور اے شاعر تو اس صورت حال پر مضطرب اور بے چین ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے حالات کا پوری طرح تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اے شاعر! مولانا رومی کا قول ہے کہ کسی عمارت کو از سر نو تعمیر کرنا ہو تو پہلے اس کو بنیاد سے اکھاڑ دیتے ہیں اس کے بعد ہی وہ نئے سرے سے بنائی جا سکتی ہے۔

اے شاعر! اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک اور سلطنت پر غیروں نے تسلط جما لیا اور ملت اسلامیہ

اقتدار سے محروم ہو گئی۔ یہ صریحاً ناقابل تلافی نقصان تھا پھر بھی اس نقصان سے یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور اب ان کو اپنے نفع نقصان کا احساس ہونے لگا ہے کہ خدا نے اسے بصارت کے ساتھ بصیرت بھی بخشی ہے۔ اس صورت میں بغور حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انسانی تعمیر کے لیے مانگی ہوئی دواؤں کے حصول سے یہ امر زیادہ بہتر ہے کہ انسان ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے اور عارضی سطح پر شکست کو قبول کر لے۔ اس لیے کہ اگر تیرا وجود ایک معمولی چیونٹی کی مانند بھی ہو پھر بھی تجھے حضرت سلیمان جیسے عظیم فرمانروا کے روبرو حاجت روائی کے لیے دست طلب دراز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ امر تیری اناء کی توہین کے مترادف ہے اور تیری حمیت کی نفی کرتا ہے۔ مشرق کی نجات اسی نکتے میں مضمر ہے کہ ملت بیضا میں ہر چہار جانب اتحاد و یگانگت اور باہمی ارتباط کا سلسلہ از سر نو قائم ہو جائے لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ ایشیا کے لوگ ابھی تک اس نکتے سے آگاہی نہیں رکھتے۔

اے شاعر! میری بات غور سے سن کہ ملت کی نجات اسی عمل میں پوشیدہ ہے کہ سیاست کو ترک کر کے مسلمان از سر نو اپنے دین کی طرف رجوع کریں۔ اس لیے ملک و دولت کا بنیادی مقصد تو صرف اسی قدر ہے کہ حرم یعنی مذہب اور اپنی اقتدار کا تحفظ کیا جا سکے۔ چنانچہ یہ امر ناگزیر ہے کہ حرم اور دین کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ دریائے نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک مسلمان متحد ہو کر صف آرا ہوں یعنی افریقہ سے لے کر ترکی تک مسلمان اپنے تمام اختلاف بھلا کر ایک ہو جائیں اسی اتحاد میں ملت اسلامیہ کی نجات ہے۔

اے شاعر! یہ بھی گوش ہوش سن لے کہ اگر ملت میں اختلافات باقی رہے تو وہ ہمیشہ کے لیے مٹ کر رہ جائے گی اس ضمن میں کوئی تخصیص نہیں کہ اختلاف کرنے والے خواہ شاہی خیموں میں رہنے والے ترک ہوں یا بلند مرتبہ خاندان سے تعلق رکھنے والے عرب ہوں کہ رنگ و نسل کا امتیاز ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتا ہے اور یہ امتیاز برقرار رہا تو ملت کا زوال ناگزیر ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ امتیازات کو ختم کر کے دین کی حقیقی بنیاد پر پیروی کی جائے کہ دنیا میں یہی عمل کامیابی و کامرانی کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ بھی جان لے کہ رنگ و نسل کی لعنت اگر دین پر مغربی اقوام کی طرح مسلط ہو گئی تو ملت اسلامیہ اس طرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہ جائے گی جس طرح راہ میں پڑا ہوا غبار باد سموم کے جھونکوں سے اڑ کر اپنا وجود کھو دیتا ہے۔

اے شاعر! یاد رکھ کہ ملت اسلامیہ اسی وقت اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر برسر اقتدار آ سکتی ہے جب کہ وہ ہر معاملے میں دین کی پیروی کرے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے اسلاف جیسی ہمت اور حوصلہ پیدا کیا جائے۔ یاد رکھ! کہ اسی صورت میں ساری دنیا میں خلافت کا نظام از سر نو قائم کیا جا سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اسلاف جیسے حوصلے' جراءت' وسیع المشربی اور قوت فیصلہ کے بغیر یہ اہم کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔

اس شعر میں مسلمانوں کے مابین فرقہ بندی کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگ ابوبکرؓ و علیؓ کی بڑائیاں ثابت کرنے کے چکر میں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو اور فرقہ پرستی کو ہوا دے کر اپنی صفوں میں انتشار پیدا کر رہے ہو۔ تمہیں ہوش و خرد کا دامن ہاتھوں سے تھامنا چاہیے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تم پوشیدہ اور ظاہری باتوں میں امتیاز پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس لیے

تمہیں خبردار ہو جانا چاہیے۔ یہاں اس امر کی بطور خاص نشاندہی کی گئی ہے کہ مسلمان اپنے درپیش مسائل کا حل تلاش کرنے کی بجائے چھوٹے چھوٹے باہمی اختلاف کی بنیاد پر نفاق کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ یوں اپنی قوت اور توانائیاں ضائع کر رہے ہیں۔

اب آخری مرحلے پر خضرؑ یوں کہتا ہے کہ اے شاعر! ملت پر متوقع مصائب کے بارے میں خدائے ذوالجلال کے حضور جو فریاد کی جانی چاہیے تھی عشق حقیقی کے طفیل وہ فریاد بھی ہو چکی۔ اب اس کے بعد یہی مناسب ہے کہ اس فریاد کے اثرات کا جائزہ لیا جائے کہ بارگاہ ایزدی میں اس فریاد کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ تو نے ابھی تک دریا' اس کی عظمت اور رفتار کی تیزی ہی دیکھی ہے اب ذرا یہ دیکھ کہ دریا کی تیز اور مضطرب موج خود اس کے لیے زنجیر کس طرح سے بنتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے مسلمانوں کو بے شک تہذیبی اور سیاسی سطح پر تو مفلوج کر کے رکھ دیا لیکن اس تہذیب کا اپنا کیا حشر ہو گا یہ حقیقت بھی عنقریب سامنے آ جائے گی۔

تمام دنیا کے لیے جو آزادی اور حریت فکر کا خواب اسلام نے دیکھا تھا وہ اب تعبیر کے مراحل میں داخل ہونے والا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آج بے شک مسلمان زوال سے دوچار سہی لیکن جس طرح ان کا ماضی شان و شوکت والا تھا بے شک آج وہ شاندار ماضی ایک خواب کی مانند ہے تاہم وقت آ گیا ہے کہ یہ خواب پھر سے شرمندۂ تعبیر ہو گا۔ اس کی مثال "سمندر" کی سی ہے۔ سمندر وہ کیڑہ جو آگ میں پیدا ہوتا ہے پھر اسی میں جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنی راکھ سے خود ہی جنم لیتا ہے۔ مراد یہ کہ سمندر کا آگ میں جل کر خاک ہو جانا اس کی حیات نو کے لیے ایک پیغام ہے۔ مسلمانوں کی مثال بھی سمندر کے مانند ہے کہ ملت کی نشاۃ ثانیہ کا دور پھر سے متوقع ہے۔ مراد یہ کہ عالم اسلام اپنے انتہائی زوال کے بعد اب ترقی کی راہ پر از سر نو گامزن ہو گا۔

خضرؑ کہتا ہے کہ اے شاعر! میری گفتگو میں تجھے آنے والے دور کی تصویر یقیناً نظر آئے گی ہر چند کہ یہ تصویر فی الحال قدرے دھندلی ہے تاہم رفتہ رفتہ یہ تصویر واضح ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن اس حقیقت کو نہ بھولیو کہ فلک کج رفتار کے پاس ایک آزمودہ فتنہ بھی ہے جس کا نام تقدیر ہے۔ جان لے کہ تقدیر وہ شے ہے جس کے بالمقابل تدبیر کے سارے حربے ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔

زیر تشریح نظم کے اس آخری شعر میں آل عمران کی ایک سورۃ سے اقتباس شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ خضرؑ شاعر سے کہتا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس امر پر یقین رکھ کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کی بجائے اپنی امیدوں اور خوش آئند توقعات سے دل کو آباد رکھ۔ کہ ملت مسلمہ ایک بار پھر عروج سے دوچار ہو گی۔

164 طلوع اسلام

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا' گیا دور گراں خوابی

عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
"نوارا تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی"
تڑپ صحن چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی
وہ چشم پاک بیں کیوں زینت برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مرد غازی کی جگر تابی

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
ربود آں ترک شیرازی دل تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہانبانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینے میں ہے پوشیدہ راز زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیث سوز و ساز زندگی کہہ دے

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمار جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہان آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی، وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتان رنگ خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
میان شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی
گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زور حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدق سلمانیؓ
ہوئے احرار ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگاف در سے ہیں صدیوں کے زندانی

ثبات زندگی ایمان محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ، تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے

غبارِ رہگذر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے، ادھر نکلے، ادھر ڈوبے، ادھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
ہوس کے پنجہ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خروش آموز بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے باد بہاری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہ اطلس قبایان تتاری ہے

بیا پیدا خریدار است جان ناتوانے را
"پس از مدت گذار افتاد برما کاروانے را"

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد
بہار آمد' نگار آمد' نگار آمد' قرار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فراز کوہسار آمد
سرت گردم توہم قانون پیشیں سازدہ ساقی
کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخ کہن بانگ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخ خلیل از خون ما نمناک میگردد
ببازار محبت نقد ما کامل عیار آمد
سر خاک شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش بانہال ملت ما سازگار آمد

"بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک راسقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم"

*

تعارف: اس حقیقت سے تو ہر صاحب ذوق اور اقبال شناس پوری طرح سے آگاہ ہے کہ "بانگ درا" علامہ اقبال کا اولین شعری مجموعہ ہے اور اب تک لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔ اشاعتی رفتار اور تعداد کے حوالے سے اردو زبان شاید ہی اس کے بالمقابل دوسری کوئی کتاب ہو۔

زیر تشریح نظم کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل اس امر کی نشاندہی غیر ضروری نہ ہو گی کہ "بانگ درا" میں نظموں اور غزلوں کی تعداد یوں تو سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے تاہم ان کی انتہائی اہم نظموں میں آٹھ طویل نظمیں شامل ہیں جو بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان میں علی الترتیب "تصویر درد' گورستان شاہی' شکوہ' جواب شکوہ' شمع اور شاعر' والدۂ مرحومہ کی یاد میں' خضر راہ اور طلوع اسلام نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ اقبال کا تفصیلی مطالعہ کیجیے تو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ان طویل نظموں میں دوسرے کلام کی نسبت زیادہ زور اور بہاؤ ہے۔ اس سلسلے کی آخری نظم "طلوع اسلام" نو بند پر مشتمل ہے۔

پہلا بند : معنی : تنک تابی: مدھم روشنی۔ **گراں خوابی:** گہری نیند۔ **عروق مردہ:** مردہ رگیں۔ **سینا:** شیخ بو علی سینا۔ **نطق اعرابی:** عربوں جیسی قوت گفتار۔ **چشم پاک بیں:** پاکیزہ نظر۔ **برگستواں:** سپاہی اور گھوڑے کا لباس۔

مرکزی خیال: زیر تشریح نظم نو بندوں اور بہتر اشعار پر مشتمل ہے۔ اس امر کی وضاحت قدرے ضروری ہے کہ اقبال ایک دانشور کی حیثیت سے دل دردمند رکھتے تھے۔ وہ دنیا کے مختلف حصوں میں ملت

اسلامیہ کے عروج و زوال کو نہ صرف یہ کہ حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھتے ہیں بلکہ اس کے اثرات بھی قبول کرتے ہیں۔ بانگ درا کی اس آخری طویل نظم میں وہ نسبتاً رجائیت کے حوالے سے سامنے آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس وقت اس نظم کی تخلیق عمل میں آئی تو ساری دنیا کے مسلمانوں‘ بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری کی دوڑ رہی تھی جو اقبال کی افتاد طبع اور خواہشات کے عین مطابق تھی۔ چنانچہ پوری نظم اسی قسم کے تاثرات کی آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں۔

مطلب: شب کے آخری لحات میں ستاروں کی روشنی جس طرح سے ماند پڑ رہی ہے اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ صبح نمودار ہونے والی ہے۔ جلد ہی افق سے سورج طلوع ہو گا اور پوری کائنات اپنی گہری نیند سے بیدار ہو جائے گی۔ چنانچہ مشرق کی مردہ رگوں میں اسی سبب زندگی کا گرم لہو دوڑنے لگا ہے تاہم یہ صورت حال ایک ایسے راز سے ہم آہنگ ہے جسے بو علی سینا اور فارابی جیسے دانشور اور فلسفی بھی نہیں سمجھ سکتے۔ مغرب میں جو تہذیب و تمدن کو فروغ ہوا ہے اور وہاں کے استعمار نے جس طرح کمزور ملکوں خصوصیت سے مسلم حکومتوں کو زیر نگیں کر لیا ہے اس کا ردعمل بالآخر دنیا بھر کے مسلمانوں میں رونما ہونے لگا ہے۔ اس صورت حال نے انہیں پھر سے اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع ہونے کی ترغیب دی ہے۔ اس لیے کہ موجوں کے تند و تیز تھپیڑے ہی ایک معمولی قطرۂ آب کو قیمتی گوہر میں ڈھال دیتے ہیں۔

اقبال پرامید ہو کر اس توقع کا اظہار کرتے ہیں کہ اب وقت آ پہنچا ہے کہ مرد مسلمان کو ایک بار پھر ترکوں جیسی شان و شوکت‘ ہندوستانیوں جیسی فکر اور عربوں جیسی تہذیب اور فصاحت و بلاغت کے جوہر عطا ہوں۔ اس کے باوجود اگر مسلمانوں میں ذہنی سطح پر زوال کے کچھ اثرات باقی ہیں تو یہ اب شاعروں اور دانشوروں کی ذمے داری ہے کہ وہ انہیں زیادہ بلند آواز کے ساتھ خواب غفلت سے بیدار کریں۔ خواہ اس آواز میں تلخی بھی شامل کرنا پڑے۔ ان کے لیے لازم ہے کہ ہر مقام پر قیام بیداری بن جائیں۔ یہ امر پیش نظر رکھتے ہوئے کہ پارے کی فطرت میں جو اضطرابی کیفیت ہے وہ کسی طور پر بھی نہیں بدل سکتی۔

اہل ایمان کے روبرو تو انتہائی زریں اور بلند پایہ اصول موجود ہیں پھر ان پر کب لازم آتا ہے کہ ان کی توجہ دوسروں کی تہذیب و تعلیمات پر مرکوز ہیں خصوصاً اس لیے کہ جب انہیں اپنے اسلاف کی فتحمندانہ فطرت اور دلیری سے بھی آگاہی ہو۔

سو اے شاعر! یہ تیری ذمے داری ہے کہ مسلمانوں کے پژدہ دلوں میں پھر سے زندگی کی تڑپ بھر دے۔ آرزوؤں اور امیدوں کے چراغ روشن کر دے یہی نہیں بلکہ تیرے پیغام میں اتنی شدت ہو کہ ملت کا ایک ایک فرد تحقیق و جستجو کا والہ و شیدا بن جائے۔

دوسرا بند : معنی : **سرشک:** آنسو۔ **نیساں:** ایسی بارش کے قطرے جو سیپیوں میں پڑ کر موتی بن جاتے ہیں۔ **ربود:** چھیننا۔ **جہانبانی:** حکومت۔ **جہاں بینی:** دنیا کا مشاہدہ کرنا۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح موسم بہار کے بادلوں سے تازگی اور قوت تخلیق کے اثرات نمودار ہوتے ہیں یہی کیفیت اب مسلمانوں کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں موجود دکھائی دیتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی اولاد میں پھر سے وہ قوت عمل بیدار ہونے لگی ہے جو کبھی ان کے اسلاف کا ورثہ ہوا کرتی تھی اور جس کے سبب انہوں نے اپنی قلیل

تعداد کے باوجود دنیا بھر میں فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ ملت مسلمہ ایک بار پھر سے یکجا و متحد ہو کر باطل کے خلاف صف آرا ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں امت محمدیؐ اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہونے کو ہے۔ ترکی کے عظیم سپوت مصطفیٰ کمال پاشا اور اس کے رفقاء نے اپنی جراءت و ہمت کے طفیل ایران اور افغانستان کے مسلمانوں کے دل جیت لیے اور جس طرح صباء پھولوں کی خوشبو کو اپنا ہم سفر بنا لیتی ہے اسی طرح دوسرے علاقوں کے مسلمان بھی ترکوں کی طرح بیدار ہو گئے ہیں۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اس عمل میں ترکوں کو بے حد قربانیاں دینی پڑیں اور بے حد دکھ اٹھانے پڑے لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ لاکھوں ستاروں کی موت ہی نمود سحر کا میاب بنتی ہے یعنی قربانیوں کے بغیر کامیابی اور کامرانی ممکن نہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ گرد و پیش کے معاملات اور ان کے بارے میں حقیقت تک رسائی کا عمل کسی ملک پر حکمرانی سے زیادہ مشکل امر ہے۔ اس لیے کہ دل خون ہو کر بہ جائے تو چشم بصیرت وا ہوتی ہے۔ اپنے استدلال کی حمایت میں اقبال نرگس کے حوالے سے ایک تمثیل اس طرح پیش کرتے ہیں کہ نرگس کا پھول جو آنکھ سے مشابہت رکھتا ہے وہ ہزارہا سال بینائی سے محرومی کے کرب میں مبتلا رہتا ہے اس کے باوجود بصارت پھر بھی اس کا مقدر نہیں بنتی کہ اس کا حصول بے حد مشکل ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان آنکھیں رکھنے کے باوجود بصیرت حاصل کرنے کے لیے بڑے مرحلوں سے گزرتا ہے۔

اے شاعر! اب تجھ پر یہ امر پھر سے لازم ہو گیا ہے کہ افراد ملت جو ایک عرصے سے بے عملی کا شکار رہے ہیں۔ تیرے پر جوش نغموں سے ان کے خون میں حدت پیدا ہو جائے اور وہ ماضی کی طرح جراءت و ہمت سے کام لے کر صف آرائی کے لیے تیار ہو سکیں۔

اس مقصد کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ اے شاعر! تیرے سینے میں زندگی کا جو راز پوشیدہ ہے وہ منکشف کر دے اور مسلمانوں کو زندگی کے ان تمام نشیب اور فراز سے آگاہ کر دے جو ان کی نظروں سے بوجوہ پوشیدہ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ملت کے افراد اپنی بے حسی کے سبب ماضی کے اصولوں اور تعلیمات کو جس طرح بھلائے بیٹھے ہیں تو ان کو آگاہ کر دے۔

تیسرا بند : معنی : خدائے لم یزل: لازوال خدا۔ **چرخ نیلی فام**: نیلا آسمان۔ **حنا بند**: مہندی لگانے والے۔ **عروس**: دلہن۔ **معمار جہاں**: حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تھا۔ **ممکنات زندگانی**: زندگی کی ترقی کے امکانات۔ **جوہر مضمر**: چھپی ہوئی صلاحیتیں۔ **ارمغان**: تحفہ۔ **نکتہ**: باریکی۔ **ملت بیضا**: ملت اسلامیہ۔

مطلب: اے شاعر! اب وقت آ گیا ہے کہ مرد مسلمان کو اس حقیقت سے آشنا کر دے کہ اس دنیا میں تو ہی ازل سے ابد تک رب ذوالجلال کا نائب ہے تو ہی اس کی زبان اور قدرت کاملہ کا مظہر ہے۔ البتہ یہ ہے تو بے اعتمادی کا شکار ہے چنانچہ اپنی حقیقت کو پوری طرح سے جاننے کے لیے یقین و اعتماد حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ تیرا دل شکوک و شبہات کا خزینہ بنا ہوا ہے جس کے سبب تو حقائق کی آگاہی سے محروم رہتا ہے۔ لہٰذا تجھ پر لازم ہے کہ خود میں یقین و اعتماد پیدا کرے۔

اے مسلمان! ذرا غور کر کہ تیری منزل مقصود تو آسمان سے بھی کہیں آگے ہے۔ تیرے بلند مقاصد کے سامنے ستارے بھی گرد کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ قدرت نے تیرے مقام کو جو رفعت عطا کی ہے وہ کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ

عالم امکاں فانی ہے اور اس میں موجود باشندے بھی فانی ہیں۔ ان کی ذات آنی جانی ہے صرف ایک تو ہی ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ ازل سے ابد تک جس کی زندگی باقی رہے گی اس لیے کہ ایک تو ہی رب ذوالجلال کا آخری پیغام ہے اسی باعث اے مسلمان تو ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔ تیرا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے ہے جنہوں نے خدا کا گھر تعمیر کیا تھا لیکن تیری ذمے داری کچھ اور زیادہ ہے یعنی یہ کہ ساری دنیا کی تعمیر کرے اس کو منظم کرے۔ زندگی کے جس قدر امکانات بھی موجود ہیں دیکھا جائے تو تو ان کا امانت دار ہے اس اعتبار سے یہ پوشیدہ امکانات تیری وساطت سے ہی اہل عالم پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس عالم فانی سے جو پانی اور مٹی جیسے عناصر سے بنا ہوا ہے جب نبوت ہمیشہ کے لیے عالم جاوداں کے لیے رخصت ہوئی تو صرف اور صرف تیرا وجود ہی اس کے ہمراہ تھا۔

اے مسلمان! سن کہ یہ نکتہ بھی اب کسی سے پوشیدہ نہیں رہا کہ ملت مسلمہ کی تاریخ اس امر کی مظہر ہے کہ وہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے ہمیشہ ایشیائی اقوام کا تحفظ کیا۔ اس صورت حال میں تیرے لیے لازم ہے کہ پھر سے اپنے اسلاف کی تعلیمات کو یاد کرے یعنی سچائی' انصاف اور شجاعت کو اپنائے جو تیرے اجداد کی خصوصیات تھیں اس لیے کہ یہ تو طے ہے اور قدرت نے اس مرتبے کا تجھے اہل قرار دیا ہے کہ بالآخر مستقبل میں دنیا بھر کی رہنمائی اور قیادت کا ذمہ دار تو ہی ہے۔

چوتھا بند : معنی : مقصود فطرت : فطرت کی مرضی۔ **رمز**: حقیقت۔ **جہانگیری**: حکومت۔ **مرغ**: پرندہ۔ **قہستانی**: ایک علاقہ کا نام۔ **قیصر**: روم کے بادشاہوں کا لقب۔ **کسریٰ**: ایران کے بادشاہوں کا لقب۔ **جادہ پیما**: راستہ طے کرنے والا۔ **المانی**: جرمنی باشندہ۔ **انگارۂ خاکی**: مراد انسان۔ **روح الامیں**: حضرت جبرئیل علیہ السلام کا لقب۔

مطلب: ملت مسلمہ کے جملہ افراد کو مخاطب کرتے ہوئے زیر تشریح اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ اے مرد مسلمان! تیرے لیے لازم ہے کہ تو محبت اور بھائی چارے کے رویے کو ساری دنیا میں عام کر دے۔ بغور جائزہ لیا جائے تو فطرت کا مقصود بھی یہی ہے اور اسلام کی تعلیمات میں بھی انہی رویوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ یہ جو رنگ اور نسل کے بت ہیں ان کو توڑ کر ہی تو ملت کا ایک جزو بن سکتا ہے۔ یہ رنگ و نسل تو اخوت اور محبت کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں ہیں۔ اتحاد و اتفاق کے لیے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ تیری شناخت تورانی' ایرانی اور افغانستانی باشندے کے حوالے سے نہیں بلکہ ملت کے فرد کے طور پر ہو۔ ملت واحدہ کا تصور اسی صورت میں عام ہو سکتا ہے کہ علاقائی حدود کو یکسر مسترد کر دیا جائے۔

اے مرد مسلمان! تو غیروں کے درمیان کب تک اپنی انفرادیت کو گم کرتا رہے گا جب کہ تیرے بازو میں ایسی قوت ہے کہ تو اپنا جہاں آپ تعمیر کر سکتا ہے تیری ذات تو شاہین جیسی ہے جو دوسرے پرندوں کا مارا ہوا اور پس خوردہ کھانے سے گریز کرتا ہے اور بلند پروازی کے ذریعے اپنے لیے خود ہی شکار کرتا ہے۔ یوں بھی تیری ذات میں یقین و اعتماد کا جو عنصر ہے وہ اس اعتماد و یقین سے خالی دنیا میں ایک روشن چراغ کے مانند ہے اور اس روشن چراغ کی ہیئت اس انداز کی ہے جیسے صحرا کی اندھیری رات میں کوئی دیا جگمگا رہا ہو۔

تو اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ ہو گا کہ ایران و روم کے قیصر و کسریٰ کی ہیبت و سطوت کو حضرت علی مرتضیٰؓ کی قوت و شجاعت' ابو ذر غفاریؓ کے فقر اور درویشی کے علاوہ حضرت سلمان فارسیؓ کی صداقت نے

ہی تہ و بالا کر رکھ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ تو بھی انہی خصوصیات کا امین اور وارث ہے۔ گویا علیؓ جیسی بے لوث قوت و شجاعت' ابوذر غفاریؓ جیسا بے ریا فقر اور سلمان فارسیؓ جیسی بیباک صداقت ہی ملت اسلامیہ کو کفر و باطل کے ظلم و ستم کے خلاف صف آرائی کا اہل بنا سکتے ہیں۔

اے مرد مسلمان! تیرے بزرگوں کی تاریخ اس امر کی غماز ہے کہ تیرے جراءت مند و بہادر اسلاف کس شان و شوکت سے اپنے دشمنوں کے خلف صف آرا' ہوئے تھے اور ان کو شکست فاش دی۔ یہ مناظر ابھی تک تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہ بھی جان لے کہ ایمان محکم ہی وہ خصوصیت ہے جس کے طفیل زندگی پائیدار و استوار ہو سکتی ہے۔ اس کی مثال جرمن اور ترک ہیں کہ جرمن ہر طرح کے اسلحہ سے لیس ہونے کے باوجود بے وسیلہ ترکوں کے جذبہ حریت سے شکست کھا گئے۔

جان لے کہ مسلمان میں جب یقین و اعتماد جنم لیتا ہے تو اسے بے سرو سامانی میں بھی حضرت جبرئیلؑ جیسی قوت پرواز حاصل ہو جاتی ہے۔

پانچواں بند : معنی : ذوق یقین: ایمان کی قوت۔ حذر: ڈر' خوف۔ چیرہ دستاں: ظالم۔ تعزیریں: سزائیں۔ ناب: خالص۔

مطلب: یہ بند اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اقبال نے یہاں یقین و اعتماد کے موضوع کو نسبتاً زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ غلامی کے دور میں اسلحہ اور تدابیر عملاً اس وقت تک مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں جب تک کہ متعلقہ قوم کے افراد یقین و اعتماد کی منزل تک نہ پہنچ جائیں۔ یہی وہ صورت ہے جو غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ اگلے شعر میں یوں گویا ہیں کہ جو مرد مومن یقین کامل کا اہل ہو اس کے زور بازو کا اندازہ کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں کہ اس کی نگاہ ہی قوموں کی تقدیر بدلنے کی صلاحیت کی حامل ہوتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ سلطنت' حکومت اور علمی سائنس جس کے ذریعے انسان ہر نوع کی مادی ترقی حاصل کرتا ہے یہ سب ایمان کے ایک نکتے کی توضیح و تشریح سے ہم آہنگ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اگر ایمان پختہ ہو تو جملہ عناصر فطری طور پر انسان کے زیر ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسا یقین کامل اور پراعتماد نظر عام انسان میں پیدا ہونا ناممکنات سے نہیں تو یہ عمل اتنا سہل بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ انسانی ہوس اور خواہشات اپنے لیے ایسی راہ متعین کرتی ہیں جو ذاتی مفادات کی آئینہ دار ہو۔

قدرت نے تمام انسانوں کو اگرچہ مادی حقوق کا اہل قرار دیا ہے لیکن مفاد پرست اور خود غرض لوگوں نے انہیں آقا اور غلاموں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے اور یہی تفریق خلق خدا کے مابین فساد کا سبب بنی ہے لیکن اس تفریق و امتیاز کے ذمے دار لوگوں کو خبردار رہنا چاہیے کہ وہ باز نہ آئے تو قدرت ان کو سخت سزا بھی دے سکتی ہے ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہر شے خواہ وہ مٹی سے پیدا ہوئی ہو یا نور سے وجود میں آئی ہو ان سب کی حقیقت ایک جیسی ہی ہے یعنی اگر ذرے کا دل چیرا جائے تو اس میں سے سورج کا لہو ٹپکنے کا امکان ہے۔ اقبال نے ذرے اور سورج کے حوالے سے اس مصرعہ میں جو تمثیل پیش کی ہے۔ انتہائی خوبصورت اور زوردار ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مٹی کا ایک ذرہ اور سورج جو منور ہے عملاً ایک جیسے خواص کے حامل ہیں اس کا حوالہ تابکار ذرات بھی بن سکتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کی جدوجہد اور اس کی تسخیر میں یقین کامل، مسلسل جدوجہد اور سب سے محبت و شفقت ایسے اسلحہ کی مانند ہیں جو مرد مومن کی فتح کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

ایک مرد کامل کو طبع بلند، مشرب و ملک میں خلوص، دل زندہ حرارت لیے ہو، نگاہ پاکیزہ اور پھر روح مضطرب و بے چین ہو ان سب عوامل کے سوا زندگی میں اور کیا چاہیے۔ مراد یہ کہ مذکورہ خصوصیات ہی ایک فرد کو مرد کامل بنا سکتی ہیں۔

چھٹا بند : معنی: **خون شفق**: شام کے وقت جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو آسمان پر سرخی چھا جاتی ہے۔ **کیمیا**: اکسیر (فن کیمسٹری)۔ **پیر حرم**: مکہ کا محافظ۔ **نوریان آسمان**: مراد فرشتے۔ **پاینده تر**: بہت مضبوط۔

مطلب: اقبال اپنے عہد کی سیاست اور مستقبل کے تجزیہ نگار کے طور پر کس قدر بالغ نظر اور دور رس نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ان امور کا اندازہ زیر تشریح بند کے اشعار سے ہوتا ہے۔ یہاں ان کا اشارہ جنگ عظیم اول کے دوران ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے والی اقوام کی جانب بھی ہے۔ اور ساتھ ہی وہ مسلمانوں کے کردار کا جائزہ بھی لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو قوم اپنے بے شمار سامان جنگ کے ساتھ اپنے حریفوں کے خلاف نبرد آزما ہوئی اس قدر قوت رکھنے کے باوجود شکست کھا گئی اور یوں لگا کہ وہ تو ایک بے بس قوم کے مانند تھی۔ (اقبال کا اشارہ جرمنی کی طرف ہے) جب کہ وہ قوم جس کے پاس بظاہر وسائل نہ ہونے کے برابر تھے اپنی جنگ آزادی میں بالآخر کامیاب و کامران ٹھہری۔ (اس مصرعہ میں اشارہ ترکی کی جانب ہے) ہرچند کہ اہل جرمنی فنون حرب میں مہارت کے سبب سمندروں کی تہہ میں بھی تیرنے کی صلاحیت رکھتے تھے پھر بھی وہ آخر کار وہیں غرق ہو کر رہ گئے۔ اس کے برعکس ترک جو وسائل اور مہارت کی کمی کے سبب موجوں کے تھپیڑے کھا رہے تھے وہ بالآخر سمندر کی تہوں سے کامیاب و کامران بن کر برآمد ہوئے۔ جن لوگوں کو اپنی سائنسی اور مادی ترقی پر ناز تھا ان کو شکست کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا اور وہ ترک جو زمین پر بڑی عاجزی و انکساری کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے تھے وہ دشمن کے بالمقابل قد آور ثابت ہوئے اور ان کا غرور خاک میں ملا گئے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بے معنی نہ ہوگی کہ جنگ عظیم اول میں انگریز کے خلاف اگرچہ ترکی جرمنی کا اتحادی تھا جنگ میں شکست تو دونوں نے کھائی۔ جرمنی تباہ و برباد ہوگی جب کہ ترکی اپنی سیاسی بصیرت کے سبب وجود کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس جنگ کے دوران شریف مکہ نے ترکوں کے ساتھ غداری کی جس کے نتیجے میں وہ بدنام و رسوا ہوا جب کہ ترکوں نے عالم اسلام میں بھی سرخروئی حاصل کی۔ اقبال نے یہاں اس واقعہ کی نشاندہی کی ہے۔ فرشتے بھی ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ ترک تو زیادہ زندہ دل، زیادہ عزم محکم رکھنے والے اور زیادہ روشن دماغ ثابت ہوئے۔ فی الواقع اہل ایمان دنیا میں اسی طرح سے زندگی کا سفر طے کرتے ہیں جس طرح آسمان پر سورج کہ مشرق میں طلوع ہوتا ہے تو مغرب میں ڈوب جاتا ہے اور مغرب میں طلوع ہوتا ہے تو مشرق میں غروب ہو جاتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ فی الواقع کسی قوم کے افراد میں یقین کی دولت ہی اس قوم کا سرمایہ ہوتی ہے یہی قوت ہے جس سے ملت کی تعمیر و تنظیم ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ یقین کامل کے بغیر کسی قوم کی تعمیر و عروج ممکن نہیں۔

ساتواں بند : معنی: کن فکاں: خدا نے کن کہا اور دنیا وجود میں آئی۔ **رنگ و نسب:** ذات پات۔ **مرغ حرم:** مراد مسلمان۔ **حلقہ شام و سحر:** صبح و شام کا چکر۔ **حریر و پرنیاں:** ریشم و مخمل۔ **جوئے:** ندی۔

مطلب: طویل نظموں میں خصوصیت کے ساتھ موضوع کے علاوہ تکنیک پر اقبال کی گرفت اس قدر مستحکم ہوتی ہے کہ وہ جہاں سے چاہیں اور جس طرح چاہیں بات کا رخ موڑ دینے پر قادر ہوتے ہیں۔ زیر تشریح نظم میں بھی انہوں نے ایک سے زیادہ دفعہ اس عمل کا مظاہرہ کیا ہے چنانچہ نظم کے اس بند میں بھی وہ ایک بار پھر مسلمانوں سے مخاطبت اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اے مرد مسلماں! تیری حیثیت اس عالم رنگ و بو میں قدرت کے ایک راز کی سی ہے۔ تیرے لیے یہ امر لازم ہے کہ اپنی حقیقت سے آگہی حاصل کر لے اور خدائے ذوالجلال کے احکامات کی ترجمانی کرتے ہوئے خودی کی حکمت سے آشنائی حاصل کرے۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ لالچ اور خواہشات نے بنی نوع انسان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ تجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بھائی چارے اور محبت کے رشتوں میں پرو کر ایک بار پھر انسانی برادری کو گروہی تقسیم سے نجات دلائے اور ان میں اتفاق و اتحاد کی ایسی فضا قائم کر دے کہ وہ ہر طرح کی نفرتوں اور رقابتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ یہ ہندوستانی ہے وہ خراسانی ہے۔ یہ افغانی ہے اور وہ تورانی۔ غرض لوگ مختلف فرقوں اور ذاتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کی مثال ایک سمندر کی موجوں کی طرح ہے جو بے شک الگ الگ اپنا عمل جاری رکھتی ہیں لیکن ایک نقطے پر پہنچ کر آپس میں مربوط ہو جاتی ہیں اور کسی طور پر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں کہ اسی میں ان کی عافیت ہے۔

اے مرد مومن! تو خود اس نوع کے امتیازات میں الجھا ہوا ہے حالانکہ تیرا تعلق حرم کعبہ سے ہے جو اتحاد و یگانگت کی علامت ہے تیرے لیے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد اور عمل ناگزیر ہے تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ گروہی سیاست اور نفاق کی پالیسی کو ختم کر دے۔ اے غفلت شعار اگر تو اپنی حیثیت ہمیشہ کے لیے مستحکم کرنے کا خواہاں ہے تو پھر صبح و شام کے مخمصوں سے نکل کر اپنی خودی میں ڈوب جا کہ یہی حقیقی زندگی کا راز ہے۔ عملی جدوجہد کے مابین جہاں حریفوں سے معرکے درپیش ہوں وہاں تیرا وجود فولاد کی طرح سخت ہونا چاہیے اور جہاں تو اپنوں میں ہو وہاں محبت و شفقت درکار ہے ایسے مقامات پر نرم روی سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب پہاڑوں اور صحراؤں کو عبور کرنا ہو تو سیلاب کی سی تندی و تیزی اختیار کر اور راہ میں کوئی گلستاں آ جائے تو پھر اس ندی کی طرح رواں رہ جو نغمے گاتی ہوئی بہتی چلی جاتی ہے اس شعر کا مضمون بھی گذشتہ شعر کی مانند ہے کہ دوستوں سے محبت و شفقت اختیار کر اور دشمنوں سے سختی۔

اے مرد مسلماں! اس امر میں کس شک کی گنجائش نہیں ہے کہ تیرا علم اور تیرا جذبہ محبت دونوں بیکراں ہیں یعنی انتہا پر پہنچے ہوئے ہیں اور مظاہر کائنات میں بھی تیرا وجود سب سے اعلیٰ اور بلند ہے۔

علامہ اقبال نے اس بند کے تمام اشعار میں ملت مسلمہ کو اسکا صحیح مقام یاد دلانے کی کوشش کی ہے اور زیادہ زور ایک طرف تو نفرت و نفاق کو چھوڑ کر اتحاد و یگانگت کی فضا قائم کرنے پر دیا ہے دوسری جانب یہ بھی تلقین کی ہے کہ دنیا میں بلند مقام حاصل کرنے کے لیے عملی جدوجہد ناگزیر ہے۔

آٹھواں بند : معنی: [illegible]

جواہرات جڑنا۔ **فسوں کاری**: جادوگری۔ **نوری**: نور سے بنا ہوا فرشتہ۔ **جولانگہ**: میدان۔ **اطلس**: ریشم۔

مطلب: اقبال یہاں طبقاتی صورت حال کے حوالے سے کہتے ہیں کہ دنیا ترقی کر کے کہیں سے کہیں جا چکی ہے لیکن آج بھی ایک عام انسان ملوکیت اور آمریت کے روبرو انتہائی ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر المیہ اور کیا ہو گا کہ انسان خود ہی آج بھی انسان کا استحصال کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ہرچند کہ عصر حاضر کی تہذیب بظاہر چمک دمک اور تزئین و آرائش کے اعتبار سے نگاہوں کو چندھیا دیتی ہے اس کے باوجود بغور جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مصنوعی تہذیب جھوٹے موتیوں کی مانند ہے جو چمک تو دیتے ہیں لیکن قدر و قیمت کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

اقبال اگلے شعر میں کہتے ہیں کہ وہ حکمت و دانش جس پر مغربی دنیا کے فلسفیوں اور دانشوروں کو ناز رہا ہے دیکھا جائے تو ایک ایسی تلوار کی طرح ہے جس سے اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے خون بہانے کا کام لیا جاتا ہے یعنی اس حکمت و دانش کو محض اپنے ذاتی مفاد اور کمزور قوموں کے استحصال کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ جان لینا چاہیے کہ جس نظام کی بنیاد سرمایہ داری پر مبنی ہے اسے فکر و تدبر مستحکم نہیں کر سکتے کہ اس نوع کے تمدن زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوتا خواہ اس کو کتنا ہی استحکام بخشنے کی کوشش کی جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف عمل اور جدوجہد ہی ہے جو زندگی کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ انہی کے سبب انسانی زندگی جنت بھی بن سکتی ہے اور اگر عمل درست نہ ہوں تو جہنم کا نمونہ بھی بن سکتی ہے۔ اس لیے کہ پیدائشی سطح پر انسان نہ تو جنتی ہے نا دوزخی۔ بلکہ اس کے اچھے برے اعمال ہی ہر طرح کی برائی بھلائی کے ذمے دار ہیں۔

اے مسلمان دانشور! یہ قدرت نے تجھ میں ہی صلاحیت پیدا کی ہے کہ ملت مسلمہ کی صحیح رہنمائی کر سکے اور اس کے پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرے تاکہ وہ کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو۔

زیر تشریح شعر میں اقبال ایک بار پھر یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ پھر ایک بار ایشیائی باشندے صورت حال کو سمجھنے لگے ہیں۔ اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ باہمی اتحاد و محبت ہی پرسکون اور خوشحال زندگی کے لیے ناگزیر ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے زمین پر ان ترکوں کے وہ گھوڑے دوڑ رہے ہیں جنہوں نے اطلسی لباس زیب تن کیا ہوا ہے۔

زیر تشریح بند کا یہ آخری شعر معمولی سی ترمیم کے ساتھ نظیری کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آ کہ میرے کمزور و ناتواں جسم کا خریدار آ گیا ہے اور ایک مدت کے بعد قافلہ ہمارے قریب سے گزر رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ملت کی بہبودی کے دن نزدیک آ گئے ہیں اور افراد قوم اب متحد و متفق ہو کر اپنی منزل مقصود کی جانب چل پڑے ہیں۔

نواں بند : معنی : بیا : آ۔ **نگار آمد** : معشوق۔ **از فراز** : بلندی۔ **سرت گردم** : میں تجھ پر قربان ہو جاؤں۔ **خیل** : گروہ۔ **بانگ ہزار آمد** : بلبل کی آواز۔ **خواجۂ بدر و حنین** : حضور سرور کائنات ﷺ جنہوں نے بدر و حنین کے غزوات میں کافروں کو شکست دی۔ **دگر شاخ خلیلؑ** : حضرت ابراہیم کی اولاد یعنی مسلمان۔ **سقف** : چھت۔ **طرح** : بنیاد۔

مطلب : نظم کو تمام کرتے ہوئے زیر تشریح بند میں اقبال نے امید و رجائیت کا انداز اختیار کیا ہے۔ وہ

اور اپنے لحن میں نغمے گا رہے ہیں۔ آمد بہار کے ساتھ ہمارا محبوب بھی آ گیا ہے اور اس کی آمد کے ساتھ دل کو سکون و اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔ موسم بہار کے بادلوں نے ہر وادی اور صحرا میں اپنے خیمے نصب کر لیے ہیں۔ پہاڑوں کی بلندیوں سے آبشاروں نے نغمہ ریزی شروع کر دی ہے۔

اے ساقی! میری زندگی تجھ پر نثار ہو۔ آ اور اپنے انعام و اکرام کا سلسلہ بحال کر دے کہ اب تو نغمہ گروں کے گروہ قطار در قطار چلے آ رہے ہیں۔ تو ان عبادت گزاروں سے کنارہ کر لے کہ جو شراب کے مخالف ہیں اور بے جھجک پینا پلانا شروع کر دے کہ ایک عرصے کے بعد ہمارے اپنے چمن کی شاخوں سے بلبل کی نغمہ ریز صدائیں بلند ہونے لگی ہیں۔

اے ساقی آ! اور بدر و حنین کے آقا آنحضرتؐ کا ذکر خیر ان کے عشاق کو سنا۔ آنحضرتؐ نے جو رازہائے دروں محفوظ رکھے تھے وہ اب مجھ (اقبال) پر ظاہر ہو گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم یعنی ملت اسلامیہ ایک بار پھر ہماری جدوجہد اور قربانیوں کے سبب تر و تازہ ہو گئی ہے اور بازار محبت میں ہماری پونجی کھری ثابت ہوئی ہے میں شہید کی قبر پر لالے کے پھول چڑھا رہا ہوں کہ اس کا خون ملت اسلامیہ کے پودے کو بے حد راس آیا ہے۔ یہاں اقبال کا اشارہ یقیناً واقعات کربلا اور شہادت عظمیٰ کی جانب ہے۔

نظم کو تمام کرتے ہوئے اقبال حافظ شیرازی کے اس شعر کی تضمین کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ

"آ کہ ہم پھول برسائیں اور اپنے پیالوں میں شراب ڈالیں آسمان کی چھت میں سوراخ کر دیں اور نئے دور کی بنیاد رکھ دیں"۔

(حصہ سوم)

غزلیات اور ظریفانہ کلام

اس حصے میں بانگ درا کی وہ غزلیں اور ظریفانہ کلام ہے جو اقبال نے 1908ء کے بعد تخلیق کیا۔ ہرچند کہ غزلوں کا انداز بڑی حد تک کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ ہے اس کے باوجود ان کے متعدد اشعار میں اقبال کا عہد اور ان کی فکر کا پتہ چلتا ہے۔ اس اعتبار سے ان غزلوں کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ رہا ظریفانہ کلام کا مسئلہ تو اس ضمن میں بات آگے چل کر ہو گی۔

غزلیات

165

①

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

یہ موج پریشاں خاطر کو پیغام لب ساحل نے دیا
ہے دور وصال بحر ابھی، تو دریا میں گھبرا بھی گئی

عزت ہے محبت کی قائم اے قیس! حجاب محمل سے
محمل جو گیا، عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی، لیلا بھی گئی

کی ترک تگ و دو قطرے نے، تو آبروئے گوہر بھی ملی
آوارگی فطرت بھی گئی، اور کشمکش دریا بھی گئی

نکلی تو لب اقبال سے ہے، کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغام سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

*

معنی: **بادِ صبا:** صبح کی ہوا۔ **موج پریشان:** بیقرار موج۔ **حجاب محمل:** محمل کا پردہ۔ **تگ و دو:** بھاگ دوڑ۔

① اس غزل کے اولین شعر میں اقبال بادِ صبا سے مخاطب ہو کر نہایت یاسیت کے لہجے میں کہتے ہیں کہ اے بادِ صبا! آنحضرتؐ کو جن کو کملی والے سے موسوم کیا جاتا ہے ازراہ کرم یہ پیغام پہنچا دینا کہ حضورؐ کی امت کے ہاتھوں دین تو خیر گیا ہی تھا اب دنیا بھی چلی گئی یعنی امت مسلمہ کی بے عملی کے سبب اس پر ہر شعبے میں زوال کی کیفیت ظاہر ہے۔

② غزل کے دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ دریا میں جو ایک موج مضطرب تھی اس کو ساحل نے یہ پیغام دیا کہ ابھی سمندر تو بہت دور ہے اور تو اس معمولی سے دریا میں ہی پریشانی سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان آزمائش کی ابتدائی گھڑی میں ہی پریشان ہو جائے تو پھر وہ منزل تک کیسے پہنچ سکے گا۔

③ اے قیس! تیری محبت کا بھرم محض اس لیے قائم ہے کہ حسن پردہ نشین ہے اور اگر یہ پردہ ہی نہ تھا تو پھر تیری عزت و غیرت اور لیلا کا ٹھکانہ کہاں ہو گا؟ مراد یہ ہے کہ عشق میں جو کشش ہوتی ہے وہ محض حجاب کے سبب ہی ہوتی ہے اگر یہ حجاب ختم ہو کر رہ جائے تو پھر عشق کی تمام تر کشش بھی ختم ہو جاتی ہے۔

④ پانی کا قطرہ اپنی تمام تر جدوجہد کے بعد جب ایک مقام پر ساکن ہو گیا تو گوہر آبدار بننا اس کا مقدر ہوا یوں ایک معمولی بلبلہ جدوجہد کے بعد بلند مرتبے پر فائز ہو گیا چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس کی فطرت میں آوارگی کا جو عنصر موجود تھا وہ بھی ختم ہو گیا اور دریا کے ساتھ جو کشمکش تھی وہ بھی اختتام کو پہنچی۔

⑤ ہرچند کہ اقبال کے لبوں سے یہ امید افزا صدا بلند ہوئی ہے تاہم نہ جانے اس کا محرک کون ہے پھر بھی یہ صدا محفل کو تڑپا گئی اور سننے والے بھی بے سکون ہو گئے

166

②

یہ سرود قمری و بلبل فریب گوش ہے
باطن ہنگامہ آباد چمن خاموش ہے

تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مے مغرب اثر
خندہ زن ساقی ہے' ساری انجمن بیہوش ہے

دہر کے غم خانے میں تیرا پتا ملتا نہیں
جرم تھا کیا آفرینش بھی کہ تو روپوش ہے

آہ دنیا دل سمجھتی ہے جسے' وہ دل نہیں
پہلوئے انساں میں اک ہنگامہ خاموش ہے

زندگی کی رہ میں چل' لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے

جس کے دم سے دلی و لاہور ہم پہلو ہوئے
آہ! اے اقبال' وہ بلبل بھی اب خاموش ہے

*

معنی: سرود: نغمہ گیت۔ **فریب گوش**: کان کو دھوکہ دینے والا۔ **آفرینش**: پیدائش۔ **مینا خانہ**: صراحی۔

① اس غزل کے ابتدائی دو شعر جو پس منظر رکھتے ہیں وہ اقبال کے عہد اور اس عہد کی سیاسی صورت حال کے حوالے سے کہے گئے ہیں۔ پہلے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو قمری اور بلبل کی نغمہ گری ہے وہ دیکھا جائے تو سراسر فریب اور دھوکا ہے اس لیے کہ ان نغموں کے پس منظر میں بظاہر ہنگاموں سے بھرا ہوا چمن اور اس کا باطن خامشی اور بے زبانی کا منظر نظر آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مغربی حکمرانوں کی دل خوش کن باتوں سے فریب نہیں کھانا چاہیے۔ اس کے بجائے ملک و قوم کی بدحالی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا تدارک کرنا چاہیے۔

② دوسرے شعر کا اشارہ بھی مغربی حکمرانوں کی طرف ہے کہ ان حکمرانوں نے ہندوستان میں جو تہذیب و تمدن مسلط کیے ہیں وہ ہمارے لیے کسی طرح پر بھی سودمند نہیں۔ اس کے باوجود اہل ہند اس تہذیب کے سبب خود کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ جب کہ انگریز ہمیں اس طرح احمق بنانے پر اظہار مسرت کر رہا ہے۔

③ انسان اس دنیا میں آ کر اس قدر بے عمل ہو گیا ہے کہ اپنا وجود کھو بیٹھا ہے گویا فطرت نے اس کو پیدا کر کے کوئی جرم کیا تھا جو انسان یوں غائب ہو گیا ہے۔

④ اور یہ دنیا جس چیز کو دل تصور کرتی ہے وہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے دل محسوس نہیں ہوتا بلکہ یہ تو انسان کے پہلو میں ایک عضو معطل کے مانند ہے۔

⑤ زندگی کا سفر طے تو ضرور کرنا ہے لیکن اس سفر کے دوران احتیاط لازم ہے کہ انسان کو بے شمار ذمے داریوں سے عہدہ برا ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ ذمے داریاں بڑی نازک ہوتی ہیں۔

⑥ جس شخص کی وجہ سے دلی اور لاہور کے مابین رابطہ قائم ہوا وہ بھی وفات پا گیا۔ یہاں اقبال کا اشارہ میرزا ارشد گورگانی کی موت کی طرف ہے۔

③

167

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی — اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل — عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل — عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی
شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی — تو ہے زناریِ بت خانۂ ایام ابھی
عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی — ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی
سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات — تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی
ابرِ نیساں! یہ تنک بخشیِ شبنم کب تک؟ — مرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی
بادہ گردانِ عجم وہ، عربی میری شراب — مرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

*

معنی : بلبلِ شوریدہ: دیوانی بلبل۔ **مصلحت اندیش:** اچھا برا سوچنے والا۔ **فرمودۂ قاصد:** قاصد کی ہدایت۔ **سبک گامِ عمل:** تیزی سے عمل۔ **دہر آشوبی:** دنیا بھر میں قیامت کا ہنگامہ۔ **سعیِ پیہم:** لگاتار کوشش۔ **کم و کیفِ حیات:** زندگی کی مقدار اور کیفیت۔ **تنک بخشی:** کنجوسوں کی طرح بہت تھوڑی چیز دینا۔ **جھجکتے ہیں:** بدکتے ہیں۔

① اے شاعر! تو جس طرح عصری صورت حال میں ناآسودگی کے سبب یوں آہ و زاری کر رہا ہے تو امر واقع یہ ہے کہ اس عمل میں سوزِ دروں شامل نہیں جس کے سبب تیرے نالے ناپختہ ہیں۔ لہٰذا تجھ پر لازم ہے کہ ان میں مزید سوز اور درد پیدا کر۔

② اس شعر میں اقبال ایک حکیمانہ نکتہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقل اگر مصلحت اندیشی کی قائل ہو جائے تو یہ اس کی پختگی کی دلیل ہے۔ اس کے برعکس عشق میں مصلحت اندیشی جذبے کی خامی کی مظہر ہے۔

③ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ عشقِ الٰہی کے طفیل انجام کی پروا کیے بغیر نمرود کی آگ میں کود پڑے۔ اس کے برعکس اگر یہ عمل عقل و دانش تک محدود ہوتا تو وہ پہلے تمام حالات کا احتیاط سے جائزہ لیتے اور فوری عمل سے گریز کرتے۔

④ محبوب کی جانب سے پیغام ملتے ہی عشق تو بے دریغ اس پر عمل کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے جب کہ اپنی تمام تر تیزی و طراری کے باوجود عقل اس پیغام کو بروئے کار لانے میں تذبذب کا شکار رہتی ہے۔

⑤ عشق کا طرزِ عمل تو آزادی اور انقلاب سے ہم آہنگ ہے جب کہ تو دعویٰ عشق کرنے کے باوجود ابھی تک اپنے آپ میں گم ہے۔

⑥ اے شخص! تو جو عمل کے سلسلے میں حیل و حجت سے کام لے رہا ہے تو اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ تجھے اس عمل اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج پر یقین نہیں ہے۔

⑦ زندگی کی تمام کیفیات کا دارومدار جدوجہد اور عمل پر ہے جب کہ تو ابھی تک صبح و شام کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔
⑧ اس شعر کا مفہوم یہی ہے کہ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم۔ بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے۔
⑨ میرے نقطہ نظر کو قبول کرنے سے لوگ اس لیے **جھجکتے** ہیں کہ یہ ان کی فطرت اور افتاد طبع کے منافی ہے۔
⑩ گلستان میں صبح کی تازہ ہوا یہ خبر لے کر آئی ہے کہ نیا نیا گرفتار ہونے والا یہ شخص اپنے قفس میں مضطرب ہے اور آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔

④

168

پردہ چہرے سے اٹھا، انجمن آرائی کر — چشم مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کب تک — بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
نفس گرم کی تاثیر ہے اعجاز حیات — تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر
کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم — اپنی ہستی سے عیاں شعلہ سینائی کر
ہو تری خاک کے ہر ذرے سے تعمیر حرم — دل کو بیگانہ انداز کلیسائی کر
اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا — ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر
پہلے خوددار تو مانند سکندر ہو لے — پھر جہاں میں ہوس شوکت دارائی کر

مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

*

معنی: **چشمک پنہاں:** چھپ چھپ کر آنکھوں سے اشارے کرنا۔ **دریوزہ گری:** بھیک مانگنا۔ **باندازۂ رعنائی:** حسن و جمال کا اندازہ۔ **بادیہ پیمائی:** جنگل جنگل پھرنا۔

① یہ غزل آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ جس کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ اے میرے محبوب! اپنے چہرے سے پردہ اٹھا کر اس طرح دیکھنے والوں کو جلوہ دکھا کہ وہ مبہوت ہو کر رہ جائیں حتیٰ کہ سورج، چاند اور ستارے بھی تیرا جلوہ دیکھنے پر مجبور ہو جائیں۔
② اگر تو بجلی کے مانند رخشندہ ہے تو میں اپنے وجود کو چھپاتا کیا؟ اے محبوب! اس صورت میں لازم ہے کہ کسی حجاب کے بغیر میرے دل میں جاگزیں ہو جا۔
③ حیات انسانی میں سانس کی حرارت ایک معجزے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر تیرے میں یہ حرارت موجود ہے تو تجھے بھی حضرت عیسیٰؑ کی مانند مسیحائی کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔
④ حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر رب ذوالجلال سے جلوہ دکھانے کی جو درخواست کی تھی بے شک وہ تو ایک طرح سے بھیک مانگنے کی حیثیت رکھتی تھی لیکن تیرے لیے لازم ہے کہ اس نوعیت کی درخواست کی بجائے اپنے ہی وجود سے کوہ طور جیسے جلوے کو برآمد کر۔

⑤ اس شعر میں اقبال براہ راست مرد مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیری خاک کے ہر ذرے میں ایسی بھرپور صلاحیت ہونی چاہیے کہ اس سے کعبے کی تعمیر ممکن ہو سکے لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ تو کلیسا کی تہذیب سے چھٹکارا حاصل کرلے اور اپنے ماضی کی طرف لوٹ آئے۔

⑥ اے محبوب! اس عالم رنگ و بو میں حد سے گزرنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں کہ تو نے اپنے ناز بھی دکھانے ہیں تو اپنی بساط کے مطابق دکھا۔

⑦ پہلے سکندر کی مانند خوددار تو بن جا اس کے بعد ہی دارا جیسے بادشاہ کی شان و شوکت کی تمنا درست ثابت ہو سکتی ہے۔ ورنہ خودداری اور غیرت مندی کے بغیر اس نوع کی کامرانی ممکن نہیں۔

⑧ اے اقبال آخرکار ایک روز تجھے تیری منزل مقصود ہاتھ آ ہی جائے گی تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ ابھی کچھ مزید جدوجہد کر۔

⑤

169

پھر بادِ بہار آئی، اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو! گل ہے، تو گلستاں ہو

تو خاک کی مٹھی ہے، اجزا کی حرارت سے
برہم ہو، پریشاں ہو، وسعت میں بیاباں ہو

تو جنسِ محبت ہے، قیمت ہے گراں تیری
کم مایہ ہیں سوداگر، اس دیس میں ارزاں ہو

کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری
تو نغمۂ رنگیں ہے، ہر گوش پہ عریاں ہو

اے رہروِ فرزانہ، رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل، غارت گرِ ساماں ہو

*

معنی: کم مایہ: کم سرمایہ۔ رہروِ فرزانہ: عقلمند مسافر۔

① زیرِ تشریح غزل کے مطلع میں اقبال خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ آمد موسم بہار کے ساتھ مست و سرشار ہوائیں چلنے لگی ہیں لہٰذا تجھ پر غزلخوانی لازم ٹھہرتی ہے۔ اگر تو غنچہ ہے تو پھول بن جا اور پھول ہے تو گلستان میں تبدیل ہو جا۔ مراد یہ کہ موسم بہار کی رنگ آمیز فضا میں اپنے وجود کو بھی عمل ارتقاء سے ہم آہنگ کرلینا چاہیے۔

② ہرچند کہ تو مشتِ خاک کے مانند ہے اس کے باوجود جملہ عناصر کی حرارت کا منبع ہے اور اگر یہ عناصر منتشر ہو جائیں تو صحرا جیسی وسعت اختیار کرسکتے ہیں۔ مراد یہ کہ جبر کی فضا میں بھی انسان اختیار کا اہل ہوتا ہے۔

③ اے اقبال! تیرا وجود تو جنس محبت کا ہم پلہ ہے اس اعتبار سے تیری ذات انتہائی گراں قیمت رکھتی ہے لیکن تو جس سرزمین کا باشندہ ہے وہاں تو خریداری کرنے والے سوداگر ہی بہت کم مایہ اور بے وسیلہ ہیں جو تجھے موجودہ قیمت میں خریدنے کی اہلیت نہیں رکھتے لہٰذا اگر تجھے ان کا پاس ہے تو خود کو ارزاں کرلے اس صورت میں شاید وہ تیرے خریدار بن سکیں۔

④ تیری آواز آخر کار کسی ساز کے پردے میں کس لیے پوشیدہ رہے کہ تو تو ایسا رنگیں نغمہ ہے جس کی رسائی ہر فرد کے کانوں تک ہونی چاہیے۔

⑤ بے شک تو ایک دانشمند مسافر کی طرح سے ہے کہ جس کے دوران سفر راہ میں کوئی باغ ہو جائے تو تو اس کے لیے شبنم بن جائے اور اگر صحرا آجائے تو طوفان کا روپ دھار لے۔

⑥ اے اقبال! اگر تو مسافرت کے دوران ساز و سامان کا آرزومند ہے تو یہ رویہ تن آسانی کے مصداق ٹھہرتا ہے اور اگر مقصد حصول منزل ہو تو پھر کسی طرح کے زاد راہ کی ضرورت نہیں بلکہ اگر سفر کا کوئی سامان تیرے پاس موجود ہے تو اسے اٹھا کر پھینک دے کہ باہمت لوگوں کو منزل مقصود تک رسائی کے لیے کسی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اگر اس کے پاس کوئی مددگار شے بھی ہے تو وہ ہمت، جراءت اور بلند حوصلگی ہوتی ہے۔

⑥

170

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

*

معنی: حقیقتِ منتظر: حقیقت جس کا انتظار کیا جائے۔ **طرب آشنائے خروش:** شور و غل اور ہنگامے سے خوشی حاصل کرنے والا۔ **دمِ طوف:** چکر لگانا۔ **کرمکِ شمع:** چراغ کا پتنگا، پروانہ۔ **عفوِ بندہ نواز:** ایسی معافی جس میں بندے پر لطف و کرم کیا گیا ہو۔

① زیر تشریح غزل کے مطلع میں رب ذوالجلال کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اے مالک حقیقی! تو نے خود کو ابتدائے آفرینش سے حجاب میں چھپا رکھا ہے لیکن تیرے بندے دیدار کے لیے ترس رہے ہیں لہٰذا اب ضروری ہو گیا ہے کہ حجاب سے نکل کر مادی شکل اختیار کر لے کہ میری عجز و انکسار میں ڈوبی پیشانی میں ہزارہا سجدے مضطرب و منتظر ہیں کہ کب تو سامنے ہو اور ہم سجدہ ریز ہو جائیں۔

② تجھے تو اس عالم رنگ و بو کے ہنگاموں سے لطف اندوز ہونا چاہیے کہ تیرا وجود ایک ایسی صدا کے مانند ہے جس کی رسائی عام لوگوں کی سماعت تک ہو۔ یوں بھی ایسے نغمے کی کیا حیثیت ہے جو ساز کے پردے کی خامشی میں گم ہو کر رہ جائے۔ اس شعر کا مفہوم بھی مطلع سے ملتا جلتا ہے۔

③ اے محبوب! تیرا دل بے شک ایک آئینے کی مانند ہے یہ بھی فطری امر ہے کہ تو اسے ٹوٹنے سے

بچا رہا ہے لیکن یہ عمل شاید مفید نہ ہو کہ جب دل ٹوٹ جاتا ہے تو باری تعالیٰ کی نگاہوں میں زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔

④ شمع کے گرد طواف کرتے ہوئے پروانے نے کہا کہ اے شمع! کہ ماضی کی وہ تاثیر نہ تو تیرے جلنے میں موجود ہے نا ہی میرے جل مرنے کے عمل میں باقی ہے۔ اس لیے کہ اب ہمارے عمل میں خلوص موجود نہیں رہا۔

⑤ اے مولائے کائنات! میرے گناہ گار وجود کو ساری دنیا میں کسی مقام پر بھی پناہ نہیں مل سکی جب کہ اس گناہ نے مجھے برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ پناہ ملی بھی تو محض تیرے دامن رحمت میں۔ جہاں میرے گناہ کو نہ صرف یہ کہ چھپا لیا بلکہ معاف کر دیا۔

⑥ اب تو صورت حال ایسی ہو گئی ہے یعنی زمانے میں اس طرح کا انقلاب رونما ہوا ہے کہ عشق میں بھی پہل کی طرح حرارت نہیں رہی نا ہی حسن میں وہ شوخیاں باقی رہیں اس کی وجہ سے نہ تو غزنوی میں وہ تڑپ ہے نا ہی ایاز کی زلفوں میں وہ پیچ و خم باقی ہیں جو کشش کے آئینہ دار تھے۔ مراد یہ ہے کہ عاشق اور محبوب دونوں اپنی صفات سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔

⑦ غزل کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اپنی بے عملی کے باوجود میں اگر کبھی سجدہ ریز ہوا تو زمین سے یہ آواز آتی سنائی دی کہ دل تو تیرا بتوں کا پرستار ہے پھر تجھے اس نماز میں آخر کیا ملے گا کہ خلوص کے بغیر کوئی عمل درست نہیں ہوتا۔

⑦

171

تہ دام بھی غزل آشنا رہے طائران چمن تو کیا
جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیر لبی رہی

ترا جلوہ کچھ بھی تسلی دل ناصبور نہ کر سکا
وہی گریہ سحری رہا' وہی آہ نیم شبی رہی

نہ خدا رہا نہ صنم رہے' نہ رقیب دیر و حرم رہے
نہ رہی کہیں اسد اللہی' نہ کہیں ابولہبی رہی

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

*

معنی: **طائران چمن**: باغ کے پرندے۔ **زیر لبی**: ہونٹوں کے نیچے۔ **ناصبور**: بے صبر دل۔ **اسد اللہی**: حضرت علیؓ کی شان۔ **ابولہبی**: حضرت رسول کریم ﷺ کے چچا کی کنیت جو حضورؐ کے سخت مخالف تھے۔ **ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم**: عجم کے مضرابوں کے ظلم و ستم۔ **نوا مری عربی**: مراد ہے اسلام کا پیغام۔

① غلامی کے دور میں بھی اگر اہل وطن نغمہ ریزی کرتے رہے تو اس سے کیا فائدہ۔ اس لیے کہ حصول آزادی کے لیے دل میں جو تڑپ تھی اس کا اظہار بھی کسی طور پر ممکن نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں نغمہ ریزی محض ایک منافقانہ عمل ہے۔

② اے میرے محبوب! تو نے بے شک اپنا جلوہ دکھایا لیکن اس سے مجھے اطمینان قلب حاصل نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ اب بھی پہلے کی طرح میں تیرے فراق میں صبحدم گریہ و زاری کرتا رہا اور وہی نصف

شب کے وقت آہیں بھرتا رہا۔

③ اب تو وہ دور آ گیا ہے کہ لوگ خدا سے تو الگ رہے بتوں کے تصور سے بھی بے نیاز ہو گئے ہیں نہ وہ حق اور سچائی کو اہمیت دینے کے لیے تیار ہیں نا ہی جھوٹ اور باطل کے پرستار رہے۔ مراد یہ ہے کہ عہد موجود کا انسان کسی بھی عقیدے کا قائل نہیں رہا جس کا سبب ہر طرح کا انتشار ہے۔

④ اقبال کہتے ہیں کہ ہر چند شاعری میں میرا اظہار اور اسلوب مغربی اثرات سے نجات نہ پا سکا اس کے باوجود یہ ملت سے وفاداری کا تقاضا ہی تھا کہ میں نے خود کو ہمیشہ اسلام سے وابستہ رکھا۔

⑧

172

گرچہ تو زندانی اسباب ہے قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اے مسلماں ہر گھڑی پیش نظر آیہ **لا یخلف المیعاد** رکھ
یہ "لسان العصر" کا پیغام ہے
"ان وعد اللہ حق یاد رکھ"

*

معنی: زندانی اسباب: ظاہری وسیلوں کا پابند۔ لسان العصر: زمانے کی زبان۔

① اس حصے کی آخری غزل چار اشعار پر مشتمل ہے۔ مطلع میں کہا گیا ہے کہ ہر چند اے شخص تو حالات کا مارا ہوا ہے۔ اس کے باوجود تجھ پر لازم ہے کہ اپنے دل کو اس قید سے ضرور آزاد رکھنے کی کوشش کر۔

② عقل و دانش تو ہمہ وقت تنقید و اعتراضات میں الجھی رہتی ہے چنانچہ اگر زندگی میں کچھ حاصل کرنے کا جذبہ ہے تو اپنے عمل کی بنیاد عشق کے جذبے پر رکھ۔ کہ یہی جذبہ جدوجہد اور کامیابی سے عبارت ہے۔

③ اے مسلماں! تیرے روبرو ہر گھڑی قرآن کی یہ آیت ہونی چاہیے کہ اللہ کے وعدے جھوٹے نہیں ہوتے۔ ہمیشہ سچے ہوتے ہیں۔ آخری مصرعہ اکبر الہ آبادی کا ہے۔ اقبال نے اس پر تضمین کی ہے۔

بانگ درا کا ظریفانہ کلام

اس مجموعے کے آخری چند صفحات میں اقبال کا ظریفانہ کلام شامل کیا گیا ہے جس کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال اپنے طور پر اکبر الٰہ آبادی سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ ان کا یہ ظریفانہ کلام بھی شاید اسی سلسلے کی کڑی ہے تاہم شاعری کو ظرافت سے ہم آہنگ کرنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس میں تو وہی تخلیق کار کامیاب ہو سکتے ہیں ظرافت جن کی فطرت میں رچی بسی ہو۔ اقبال ایک سنجیدہ شاعر تھے۔ چنانچہ وہ اس سلسلے کو جاری نہ رکھ سکے۔ ملاحظہ ہو۔

ظریفانہ

①

173

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں
مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں

رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے
واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

*

معنی: مشین بن جاتے ہیں: مشین کی طرح عمل ہوتا ہے۔

① ظریفانہ کلام کے اس قطعہ میں اقبال کہتے ہیں کہ مشرقی ممالک کے لوگ اس قدر سادہ اور قدامت پرست ہیں کہ زندگی کے عام اصولوں کو بھی دین کا درجہ دے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مغربی ممالک میں سب جانتے ہیں کہ صنعتی ترقی اس نہج پر پہنچی ہوئی ہے کہ یہی اصول میکانکی عمل کا حصہ بن جاتے ہیں۔ نتیجہ بالعموم یہ برآمد ہوتا ہے کہ مشرقی ممالک سے جو نوجوان حصول تعلیم کے لیے مغربی ممالک میں جاتے ہیں وہ عام طور پر وہاں عیسائیت سے متاثر ہو کر تثلیث کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ بھی برآمد ہو سکتا ہے کہ مذکورہ نوجوان مغربی تہذیب میں اس طرح سے گھل مل جاتے ہیں کہ مقامی لڑکیوں سے شادی رچا لیتے ہیں اور جب ان سے اولاد پیدا ہوتی ہے تو وہ وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ یہاں اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

②

174

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

روشِ مغربی ہے مدِ نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

*

معنی: فلاح کی راہ: بہتری کا راستہ۔ روشِ مغربی: یورپ کی طرزِ معاشرت۔ وضعِ مشرق: مشرق کے طور طریقے۔

① یہ قطعہ ایک طرح سے خالص اکبر الٰہ آبادی کے رنگ میں ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ ہندوستان میں اب لڑکیوں میں بھی انگریزی پڑھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ان کے لیے خصوصی کالجوں کا اجراء ہو رہا ہے۔ اقبال ایسی تعلیم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ یوں لگتا ہے لڑکیوں کو انگریزی پڑھا کر قوم فلاح پا جائے گی لیکن ہوا یوں ہے کہ لوگوں نے اس طرح سے مغرب کی تہذیب اپنائی ہے کہ وہ اپنی وضع کو عملی سطح پر گناہ سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ اگر اس صورت حال کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہ ہو گا کہ لڑکیوں میں جو انگریزی زبان عام کرنے کا عمل اپنایا گیا ہے

وہ ایک ڈرامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہو سکے گا جب لوگوں کے سامنے نتائج آئیں گے۔

③

175

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں — مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف — "پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے"

*

معنی حامی: حمایت کرنا۔ بدظن: ناراض۔

تشریح: اس قطعہ میں کہا گیا ہے کہ ایک عالم دین کی حیثیت سے اگرچہ شیخ صاحب آئے دن پردے کی حمایت میں تقریر کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں کالج کے طلباء انہیں قدامت پرست اور جدید اقدار کا دشمن سمجھتے ہوئے شیخ صاحب کے خلاف ہو گئے ہیں حالانکہ اس مخالفت کی ضرورت نہ تھی جب کہ کل انہوں نے اپنے ایک وعظ میں یہ بات صاف صاف کہہ دی ہے کہ اب پردے کی قطعاً ضرورت نہیں رہی اس لیے کہ بناؤ سنگھار کے ذریعے جب نوجوانوں نے ہی خواتین کی سی وضع قطع اختیار کر لی تو پردہ پھر کس سے کیا جائے؟ اس قطعہ کا آخری مصرعہ مردوں پر ایک بلیغ طنز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

④

176

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوشمند — غیرت نہ تجھ میں ہو گی، نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور، کہ اولاد کے عوض — کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

*

زیر تشریح کے پہلے شعر میں اقبال نے جو مضمون پیش کیا ہے وہ اس سے پہلے قطعے کے مضمون سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ یہاں وہ مضمون قدرے مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ اے ہوش مند انسان! وہ دن اب زیادہ دور نہیں بلکہ بہت قریب ہے جب کہ نہ تجھ میں غیرت باقی رہے گی نا ہی عورت پردے میں مستور رہنا پسند کرے گی اور تو اس بے پردگی پر قطعی طور پر معترض نہ ہو گا۔ اس لیے کہ مستقبل میں وہ دور آنے والا ہے جب عورت کو اولاد کی قطعاً پروا نہ ہو گی بلکہ اس کی بجائے کونسل کی رکنیت کے لیے الیکشن میں حصہ لے گی اور لوگوں سے ووٹ مانگتی پھرے گی۔

دراصل اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی بھی مہذب معاشرے میں مرد کی طرح عورت کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا تو گھر اور معاشرے کا نظام ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ہے۔

⑤

177

تعلیم مغربی ہے بہت جراءت آفریں
پہلا سبق ہے، بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ

بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط
آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ

میرا یہ حال، بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں
ان کا یہ حکم، دیکھ! مرے فرش پر نہ رینگ

کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور
اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ

*

معنی: **جراءت آفریں:** بہادر بناتی ہے۔ **مار ڈینگ:** شیخی بگھارنا۔ **آغا بھی:** مراد ہے افغانستان جیسے پس ماندہ ملک کے خان صاحب بھی۔

① یہ چار غیر مربوط اشعار ایک طرح سے غزل کے ہیں ایسی غزل جو اپنے مزاج کے اعتبار سے ظرافت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ پہلے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ مغرب کی تعلیم انتہائی جراءت انگیز ہوتی ہے اور پہلا سبق جو کسی طالب علم کو کالج میں داخلے کے بعد ملتا ہے وہ ڈینگ مارنے اور شیخی بگھارنے کا ہوتا ہے۔

② دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ ہندوستان تو ایک منڈی کی طرح ہے جہاں بیرونجات سے اشیائے ضرورت آکر فروخت ہوتی ہیں۔ اس ملک میں خود اتنی صلاحیت نہیں کہ صنعتی سطح پر اپنے لیے کوئی سامان ضرورت تیار کرے یہاں کی حالت تو اتنی گئی گزری ہے کہ اگر ہینگ جیسی معمولی شے بھی درکار ہو تو وہ کابل جیسے پسماندہ علاقے کے لوگ یہاں لے کر آتے ہیں۔

③ تیسرے شعر میں اقبال اہل ہند کی غلامانہ ذہنیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے آقاؤں کی خوشامد میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے کہ ان کے بوٹ کی ٹو تک چاٹنے سے نہیں شرماتے اور ہمارے آقا (انگریز) اس قدر خوشامد کے باوجود ہم سے انتہائی متکبرانہ سلوک کرتے ہیں اور بوٹ چاٹتے ہوئے اپنا فرش خراب ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ غزل کے چوتھے اور آخری شعر میں اقبال نے اونٹ اور گائے، دو کردار پیش کیے ہیں۔ اونٹ سے مراد مسلمان ہیں اور گائے سے ہندو۔ انگریز ہندوستان میں قیام کے دوران مسلمانوں کی ہمیشہ تضحیک کرتے رہے۔ اس کا بنیادی سبب یہی تھا کہ ہندوستان میں مقیم مسلمانوں نے ان کے اقتدار کے خلاف ہمیشہ نبرد آزمائی کی جب کہ ہندوؤں نے ان کا ساتھ دیا۔ چنانچہ انگریز اس حوالے سے کہ مسلمان عرب سے آئے تھے اور اونٹ وہاں کا کار آمد ہونے کے باوجود بھدا سا جانور ہے اس کے برعکس ہندو چونکہ گائے کی پرستش کرتے ہیں اس لئے انہیں گائے سے تشبیہ دی ہے۔

⑥

178

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگدست
تہذیب نو کے سامنے سر اپنا خم کریں

رد جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا
تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

*

معنی: **تہذیب نو:** نئی تہذیب۔ **خم:** جھکانا۔

تشریح: اس قطعہ میں اقبال نے ان مفاد پرست واعظوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو محض چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے دین کے بنیادی اصولوں کی تردید سے بھی نہیں چوکتے۔ سو اقبال کہتے ہیں کہ اگر حضرت واعظ ان دنوں معاشی طور پر پریشان ہیں تو انہیں اس کی زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے لیے وہ بڑے طنزیہ انداز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اسلام میں اصول جہاد تو بعض واعظوں نے غیروں کو خوش کرنے اور مال بنانے کے لیے بہت کچھ لکھا اب اس مقصد کے لیے مناسب موقعہ ہے کہ واعظ حضرت اصول حج کے خلاف بھی کوئی رسالہ لکھ ڈالیں۔

179 ⑦

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ دفعِ مرض کے واسطے پِل پیش کیجیے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجیے"

*

نئی تہذیب کے مارے ہوئے کسی مریض کو اگر ڈاکٹر دوا دیتا ہے اور وہ مریض سے کہتا ہے کہ یہ گولی کھالیجیے تو وہ اس سے متاثر ہونے کی بجائے دفع مرض کے لیے "پل" (گولی) پیش کرنے پر اظہار مسرت کرتا ہے۔ ایک دور وہ بھی تھا کہ تعلیمی اداروں میں اساتذہ جس شفقت کے ساتھ درس دیتے تھے تو ان کی اس عنایت پر دل پیش کرنے کو جی چاہتا تھا۔ جب کہ اب اس طرح سے زمانہ اور اس کی تہذیب بدل چکی ہے کہ طالب علم استاد سے سبق لینے سے قبل اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ یہ فرمائیے آپ کا "بل" (معاوضہ) کتنا ہے۔

ان اشعار میں اقبال نے اپنے عہد کے تضادات کو ظریفانہ انداز میں بعض علامتوں اور کرداروں کے حوالوں سے بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی زبان و تہذیب نے افراد کو اس طرح اندھی تقلید پر مجبور کر دیا ہے کہ بات اپنی زبان میں کی جائے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن یہی بات اگر انگریزی زبان میں کی جائے تو ان پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ یوں انگریزی زبان پر فخر کیا جاتا ہے۔

180 ⑧

انتہا بھی اس کی ہے؟ آخر خریدیں کب تلک چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی آئیں گے غسال کابل سے، کفن جاپان سے

*

معنی: غسال: غسل دینے والے۔

زیر تشریح قطعہ اور بعض دوسرے اشعار کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ کوئی ملک اس وقت نہ صحیح معنوں میں ترقی کر سکتا ہے نا ہی حقیقی معنوں میں دوسرے ممالک کے اثرات سے آزاد ہو سکتا ہے تاوقتیکہ وہ معاشی اور صنعتی میدان میں

خود کفیل نہ ہو۔ اسی حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ آخر کسی چیز کی انتہا بھی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں صورت حال یہ ہے کہ وہ دوسرے ممالک کی اشیاء کی منڈی بنا ہوا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ چھتریاں، رومال، مفلر اور لباس جیسی معمولی اشیا بھی جاپان سے درآمد کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔

اقبال آگے چل کر کہتے ہیں کہ ہماری غفلت اور بے عملی کا یہی عالم رہا تو اس امر سے کچھ بعید نہیں کہ اگر یہاں کوئی شخص وفات بھی پا گیا تو ہم اس قدر مجبور و معذور ہیں کہ اس کی میت کو نہلانے کے لیے غسال کابل سے اور اس کے لیے کفن بھی جاپان سے منگوانا پڑے گا۔

181 ⑨

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

اس دور میں سب مٹ جائیں گے، ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

اے شیخ و برہمن! سنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں؟
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے

یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستور محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے

*

معنی: اہل بصیرت: دل کی آنکھوں سے دیکھنے والے۔

زیر تشریح چار اشعار ظرافت کی بجائے طنزیہ انداز کے حامل ہیں چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ ہم مشرق کے لوگ اب مغربی تہذیب کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی تہذیب میں جو چمک دمک ہے وہ مشرق کی قدیم تہذیب میں نہیں ہے۔ مغرب میں بڑی تیزی کے ساتھ نظریات اور فکر میں تبدیلی آ رہی ہے جب کہ مشرق کے لوگ اپنی پرانی ڈگر سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ مغربی تہذیب کے اثر و نفوذ سے اگر چھٹکارا حاصل نہیں کیا جا سکتا تو یہ عمل تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے اب تو صرف وہی لوگ زندہ رہنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم رہیں گے۔

اس شعر میں اقبال شیخ و برہمن یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سنو اہل بصیرت کیا کہتے ہیں کہ جو قومیں باہم دست و گریبان رہیں اور آپس میں اتحاد و اتفاق قائم نہ رکھ سکیں وہ انتشار و زوال کا شکار ہوئیں اور پستی کی تہہ میں گرتی چلی گئیں۔ وہ زمانہ بھی تھا جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے مل کر محفلیں سجاتے تھے لیکن اب ان میں نفرت اور نفاق کا یہ عالم ہے کہ کبھی مل بیٹھنے کا موقعہ بھی ملا تو ان میں یا تو اردو ہندی کی بحث چھڑ جاتی ہے یا قربانی اور جھٹکے کے معاملات پر تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ ان میں قطعی طور پر قوت برداشت نہیں رہی اور چھوٹی چھوٹی باتیں ان کے مابین سر پھٹول کا سبب بن جاتی ہیں۔

⑩

182

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکر غیر کیا

کیوں اے جناب شیخ سنا آپ نے بھی کچھ
کہتے تھے کعبے والوں سے کل اہل دیر کیا

ہم پوچھتے ہیں مسلم عاشق مزاج سے
الفت بتوں سے ہے تو برہمن سے بیر کیا

*

معنی: شہود: کسی چیز کا ظاہر ہونا۔ شاہد: دیکھنے والا۔ مشہود: دیکھا گیا۔ بیر: دشمنی۔

زیر تشریح تین اشعار بھی اقبال نے طنزیہ انداز میں لکھے ہیں وہ کہتے ہیں کہ غالب نے اپنے مصرعہ میں کہا ہے کہ خدا کی ذات' اس کی ذات دیکھنے والوں اور اس کی ذات کی گواہی دینے والوں میں 'یعنی ان تینوں میں بظاہر کوئی فرق نہیں۔ وحدت الوجود کے عقیدے کے مطابق انسان' کائنات اور خدا در حقیقت ایک ہی وجود کی ظاہری شکلیں ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر غالب کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے تو پھر ان مسلمانوں کو جو بتوں سے تو عشق کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ اس صورت میں برہمن سے دشمنی کا مظاہرہ کیوں ہو؟ ان اشعار میں اہل کعبہ سے مسلمان اور اہل دیر سے ہندو مراد ہیں۔ غالب کے قول کے حوالے سے اقبال کہتے ہیں کہ انسان جب ایک عمل کرتا ہے تو اس سے متعلق دوسرے عمل کو بھی اپنانا پڑتا ہے۔ اس صورت میں ایک جانب تو ہندو دیویوں سے محبت کا اظہار اور دوسری جانب برہمن سے نفرت یہ امر کچھ مناسب معلوم نہیں دیتا۔

(11)

183

ہاتھوں سے اپنے دامن دنیا نکل گیا
رخصت ہوا دلوں سے خیال معاد بھی

قانون وقف کے لیے لڑتے تھے شیخ جی
پوچھو تو وقف کے لیے ہے جائداد بھی

*

معنی: خیال معاد: آخرت کا خیال۔

اس قطعے میں اقبال مسلمانوں کی ایک مخصوص صورت حال پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب دنیا ہی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تو سمجھ لو کہ ہم نے دین کو بھی بڑی حد تک نظرانداز کر دیا۔ اور ہمارے دلوں میں بے دینی نے راہ پالی۔ ان حالات میں شیخ صاحب قانون وقف علی الاولاد کے لیے آئینی جنگ تو بے شک لڑ رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس نوع کے وقف کے لیے جائیداد بھی موجود ہے یا نہیں کہ وہ تو ہم نے اپنی عیاشیوں میں اڑا دی۔

(12)

184

وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے
مہذب ہے تو اے عاشق' قدم باہر نہ دھر حد سے

نہ جرات ہے' نہ خنجر ہے' تو قصد خودکشی کیسا
یہ مانا درد ناکامی گیا تیرا گذر حد سے

کہا میں نے کہ "اے جان جہاں کچھ نقد دلوا دو
کرائے پر منگا لوں گا کوئی افغان سرحد سے

*

زیر تشریح اشعار میں اقبال نے مغرب اور مشرق کے مابین محبت کے نفسیات کے بارے میں جو رویہ ہے اس کا ظریفانہ انداز میں تجزیہ کیا یہ اشعار دراصل ایک انگریز دوشیزہ اور ہندوستانی عاشق کے مابین مکالمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ نوجوان عاشق کہتا ہے کہ جب اپنی انگریز محبوبہ سے مایوس ہو کر میں نے اس پر خودکشی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ محبوبہ بولی کہ اے مجھے چاہنے والے! تو تو انتہائی مہذب ہونے کا دعویدار ہے پھر اس طرح خودکشی کا ارادہ کرکے آپے سے باہر کس لیے ہو رہا ہے کہ خودکشی تو بزدل اور غیر مہذب لوگ کیا کرتے ہیں۔ یوں بھی اے عاشق نامراد! نہ تو تیرے پاس خودکشی کرنے کے لیے کوئی خنجر یا پستول ہے نا ہی اتنی جراءت اور حوصلہ کہ یہ قدم اٹھا سکے۔ ہرچند کہ محبت میں ناکامی کے سبب تیری مایوسی حد سے بڑھ چکی ہے پھر بھی خودکشی تیرے بس کا روگ نہیں۔ انگریز محبوبہ کا یہ جواب سن کر میں نے کہا۔ اے دل و جان سے عزیز دوشیزہ! یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کے لیے تو اجرت پر کسی پٹھان کو سرحد سے بلوالوں گا تم تو بس یہ کرو کہ اس مقصد کے لیے کچھ نقد رقم دلوا دو۔

(13) 185

ناداں تھے اس قدر کہ نہ جانی عرب کی قدر
حاصل ہوا یہی، نہ بچے مار پیٹ سے
مغرب میں ہے جہاز بیاباں شتر کا نام
ترکوں نے کام کچھ نہ لیا اس فلیٹ سے

*

معنی: جہاز بیاباں: صحرا کا جہاز۔ شتر: اونٹ۔

اس قطعے میں اقبال نے ایک جنگ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں ترکی کو محض اس لیے شکست ہو گئی کہ میدان جنگ تک اسلحہ اور رسد نہ پہنچ سکے۔ اس وقت ترکی کے پاس کوئی بحری بیڑہ نہ تھا۔ عربوں سے بھی شدید اختلافات تھے۔ حالانکہ ان کی مدد اور اونٹوں کے ذریعے سامان رسد میدان جنگ تک پہنچ سکتا تھا۔ جب کہ انہیں اس امر کا علم بھی تھا کہ اہل مغرب اونٹ کو صحرا کا جہاز کہا کرتے ہیں۔

(14) 186

ہندوستاں میں جزو حکومت ہیں کونسلیں
آغاز ہے ہمارے سیاسی کمال کا
ہم تو فقیر تھے ہی، ہمارا تو کام تھا
سیکھیں سلیقہ اب امرا بھی "سوال" کا

*

معنی: امرا: جمع امیر کی۔

اس قطعے میں کونسلوں اور اقتدار کے حوالے سے امراء کے اس طبقے پر بڑا خوبصورت اور بلیغ طنز کیا ہے جو اس مقصد کے لیے انتخابات میں حصہ لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اب ہندوستان میں کونسل کا وجود حکومت کا جزو تصور کیا جانے لگا ہے۔ یوں سیاست میں ہم ہندوستانیوں کے انتہائی عروج کا یہ نقطہ آغاز ہے۔ ہم عام ہندوستانی تو خیر فقیر کی مانند اپنے مسائل کے سلسلے میں

تھے تاہم اب یہ امراء پر بھی لازم ہو گیا ہے کہ وہ کونسل کے رکن کی حیثیت سے یہاں اپنے مطالبات منوانے کے لیے دست طلب دراز کرنے کا سلیقہ سیکھ لیں کہ اس کے بغیر تو ان کی شنوائی نہ ہو سکے گی۔
اقبال چونکہ ہمیشہ اس طرح کے نظام حکومت کے مخالف رہے اس لیے یہاں بھی وہ امراء کے طبقے پر طنز کرتے نظر آتے ہیں اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اقتدار تک عام آدمی کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔

187 (15)

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں — ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا؟
میرزا غالب خدا بخشے' بجا فرما گئے — ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں' کھائیں گے کیا؟

*

اس قطعہ میں اقبال نے انتخابات کے ضمن میں ایک ایسی لعنت کی طرف اشارہ کیا ہے جو بیسویں صدی کے آغاز میں بھی موجود تھی اور یہ سلسلہ آج تک رائج چلا آتا ہے۔ اسمبلی اور کونسلوں کے انتخابات میں اس وقت بھی سرمایہ دار طبقہ ہی حصہ لینے کا اہل سمجھا جاتا تھا اور اسی نوے سال گزرانے کے بعد جب ہم اپنی قومی جمہوریت کے مراحل میں داخل ہو چکے ہیں یہ سلسلہ ماضی کی طرح جاری و ساری ہے یعنی امیدوار سرمایہ دار ہوتا تھا جو اپنے اقتدار کے لیے ووٹروں کو خریدتا تھا۔ ظاہر ہے کہ آج بھی صورت حال پہلے سے بھی زیادہ بدتر ہو چکی ہے۔
چنانچہ اس قطعے میں اقبال نے متذکرہ قسم کے ایک امیدوار اور ووٹر کے مابین مکالمہ نظم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت بے شک آپ پوری کونسل کی رکنیت کے اہل بھی ہیں اور اپنی انتخابی مہم میں کامیاب ہو کر کونسل میں پہنچ بھی جائیں گے۔ اور انگریز بر سر اقتدار حکومت سے اپنے مفادات بھی حاصل کر لیں گے چنانچہ ہم اس مقصد کے لیے آپ کو ووٹ دینے کے لیے بھی بے شک تیار ہیں لیکن یہ تو فرمایئے کہ اس کا معاوضہ ہمیں کیا دلوائیں گے۔ اگلے شعر میں علامہ نے غالب کے ایک مصرعہ سے استفادہ کرتے ہوئے ووٹر کی زبان سے یہ مکالمہ دوہرایا ہے کہ حضرت! آپ نے ممتاز شاعر حضرت غالب کا یہ مصرعہ تو ضرور سنا ہوگا کہ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ بے شک ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ دہلی میں قیام کرنا اپنی جگہ۔ تاہم گذر بسر اور کھانے پینے کے لیے کچھ ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے سو اس کا اہتمام بھی کر دیجیے۔

188 (16)

دلیل مہر و وفا اس سے بڑھ کے کیا ہو گی — نہ ہو حضور سے الفت' تو یہ ستم نہ سہیں
مصر ہے حلقہ' کمیٹی میں کچھ کہیں ہم بھی — مگر رضائے کلکٹر کو بھانپ لیں تو کہیں
سند تو لیجیے لڑکوں کے کام آئے گی — وہ مہربان ہیں اب' پھر رہیں' رہیں نہ رہیں
زمین پر تو نہیں ہندیوں کو جا ملتی — مگر جہاں میں ہیں خالی سمندروں کی تہیں
مثال کشتی بے حس مطیع فرماں ہیں — کہو تو بستہ ساحل رہیں' کہو تو نہیں

*

معنی: دلیل: ثبوت۔ مصر: اصرار۔ کشتی بےحس: بے حس کشتی۔ مطیع فرماں: فرمانبردار۔ بستہ ساحل:

ساحل سے چمٹے رہنا۔

زیر تشریح پانچ اشعار میں انتخابات اور اس سے متعلقہ مسائل کے حوالے سے ہی کہے گئے ہیں لیکن ان میں کسی کونسل کی بجائے کمیٹی کی رکنیت کے انتخاب کا تذکرہ ہے۔ تاہم ان اشعار میں مزاح کی جگہ بالعموم طنز سے کام لیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک خوشامدی شخص نے انگریز افسر سے کہا۔ ہمیں حضور سے جس قدر محبت ہے اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ہمارے اپنے بھائی آپ سے محبت و نا داری کی بنا پر ہمیں طعن و تشنیع اور ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہی بات حضور سے ہماری وفاداری کی دلیل ہے۔

② دوسرے شعر میں یہی بات قدرے مختلف انداز میں کہی گئی ہے کہ جس حلقے سے ہم کمیٹی کا انتخاب لڑ رہے ہیں وہاں کے لوگ جو ہمارے رائے دہندگان بھی ہیں یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کے حقوق کی بات بھی کریں جب کہ ہم اس امر کا اندازہ لگا رہے ہیں کہ ضلع کے حاکم اعلیٰ یعنی کلکٹر کا ان معاملات میں کیا نقطہ نظر ہے اور اس کی مرضی کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی ہاں میں ہاں ملانا ہماری مجبوری ہے۔ مراد یہ ہے کہ کمیٹی کے منتخب ہونے والے کونسلر اپنے رائے دہندگان کے حقوق کے ضمن میں حاکم ضلع کا عندیہ معلوم کیے بغیر کوئی بات کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

③ اس شعر میں ایک ایسے مسئلے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو انگریزی دور میں عام روایت بن گیا تھا یعنی متعدد لوگ انگریز افسروں کی خوشامدوں کی بدولت خوشنودی کی سند حاصل کر لیتے اور بعد میں اسی سند کو دکھا کر اس افسر یا اس کے بعد آنے والے افسروں سے اپنے کام نکلواتے۔ بیٹے بھتیجوں کو ملازمتیں دلواتے۔ چنانچہ ایسا ہی ایک خوشامدی شخص کہتا ہے کہ میں اس افسر سے سند تو حاصل کر لوں۔ تاکہ اپنے کام نکلوائے جا سکیں بعد میں کیا پتہ کہ یہ لوگ اسی طرح مہربان رہیں یا نہ رہیں کہ ہوا کا رخ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ آج سالہا سال گزرنے کے باوجود انگریز کی یہ بدعت آج بھی بدستور قائم ہے۔ انتخابات ہوں، رائے دہندگان کے ووٹ خریدنے اور ملازمتوں کے حصول میں ایسی ہی قباحتیں موجود ہیں۔

④ اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ انگریزی غلامی کے دور میں یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی باشندوں کے لیے زمین تنگ کر دی گئی ہے اور کسی جگہ پر بھی انہیں عزت و وقار سے نہیں دیکھا جاتا چنانچہ غیرت مندی کا تقاضا تو یہی ہے کہ سمندروں میں کود کر خودکشی کر لیں کہ ان کی تہوں میں لاشوں کو پناہ تو بہرحال مل ہی جائے گی کہ غلامی میں دکھوں اور تکلیفوں کا علاج موت کے سوا اور کچھ نہیں۔

⑤ ہم ہندوستانی تو اس دور غلامی میں ایک ایسی کشتی کی مانند ہیں جو ساحل پر بندھی ہوئی ہے۔ جب ملاح چاہتا ہے اسے کھول لیتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق جس طرف چاہے کھیتا چلا جاتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی انگریزوں کے احکام کے اس طرح مطیع ہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔

(17)

189

فرما رہے تھے شیخ طریق عمل پہ وعظ　کفار ہند کے ہیں تجارت میں سخت کوش

مشرک ہیں وہ جو رکھتے ہیں مشرک سے لین دین
لیکن ہماری قوم ہے محروم عقل و ہوش

ناپاک چیز ہوتی ہے کافر کے ہاتھ کی
سن لے اگر ہے گوش مسلماں کا حق نیوش

اک بادہ کش بھی وعظ کی محفل میں تھا شریک
جس کے لیے نصیحت واعظ تھی بار گوش

کہنے لگا ستم ہے کہ ایسے قیود کی
پابند ہو تجارت سامان خورد و نوش

میں نے کہا کہ "آپ کو مشکل نہیں کوئی
ہندوستاں میں ہیں کلمہ گو بھی مے فروش

*

معنی: سخت کوش: سرگرم۔ **حق نیوش**: سننے کا حق۔

زیر تشریح اشعار میں جہاں ایک مخصوص صورت حال اور رویے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں آخری شعر میں بات ایک انتہائی خوبصورت طنز پر ختم کی گئی ہے چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے واعظ کہہ رہا تھا کہ ہندوستان میں جو غیر مسلم تاجر ہیں وہ لین دین اور تجارت کے سلسلے میں بڑے سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ یہ جان لو۔ کہ وہ لوگ جو مشرک سے لین دین رکھتے ہیں وہ بھی مشرک ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی ہماری قوم عقل و ہوش سے محروم ہے۔ امر واقعہ ہے کہ کافر جس چیز کو چھولے وہ ناپاک و نجس ہو کر رہ جاتی ہے چنانچہ اے مسلمانوں اگر تم میں حقائق کا سامنا کرنے کی جراءت ہے تو یہ بات کان کھول کر غور سے سن لو۔

اقبال کہتے ہیں کہ واعظ کی اس محفل میں ایک شرابی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس شرابی نے واعظ کی اس ناصحانہ تقریر کو سنا تو اسے یہ بات بڑی ناگوار گزری اس نے اٹھ کر بیساختہ کہا کہ حضرت آپ تو کھانے پینے کی اشیا پر جس طرح پابندی عائد کر رہے ہیں یہ طرز فکر تو بڑی افسوسناک ہے۔ بھلا تجارت میں اس نوعیت کی پابندیاں جو آپ عائد کر رہے ہیں وہ کس طرح روا رکھی جا سکتی ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں نے اس شرابی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ گھبرایئے نہیں آپ کو اپنے شغل میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ یہاں مسلمان شراب فروش بھی موجود ہیں۔

(18) 190

دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک
شیشہ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے

ہے مداوائے جنوں نشتر تعلیم جدید
میرا سرجن رگ ملت سے لہو لیتا ہے

*

191

(19)

گائے اک روز ہوئی اونٹ سے یوں گرم سخن
نہیں اک حال پہ دنیا میں کسی شے کو قرار

میں تو بدنام ہوئی توڑ کے رسی اپنی
سنتی ہوں آپ نے بھی توڑ کے رکھ دی ہے مہار

ہند میں آپ تو از روئے سیاست ہیں اہم
ریل چلنے سے مگر دشت عرب میں بیکار

کل تلک آپ کو تھا گائے کی محفل سے حذر
تھی لٹکتے ہوئے ہونٹوں پہ صدائے زنہار

آج یہ کیا ہے کہ ہم پر ہے عنایت اتنی
نہ رہا آئنۂ دل میں وہ دیرینہ غبار

جب یہ تقریر سنی اونٹ نے شرما کے کہا
ہے ترے چاہنے والوں میں ہمارا بھی شمار

رشک صد غمزۂ اشتر ہے تری ایک کلیل
ہم تو ہیں ایسی کلیلوں کے پرانے بیمار

ترے ہنگاموں کی تاثیر یہ پھیلی بن میں
بے زبانوں میں بھی پیدا ہے مذاق گفتار

ایک ہی بن میں ہے مدت سے بسیرا اپنا
گرچہ کچھ پاس نہیں چارہ بھی کھاتے ہیں ادھار

گوسفند و شتر و گا و پلنگ و خرلنگ
ایک ہی رنگ میں رنگیں ہوں تو ہے اپنا وقار

باغباں ہو سبق آموز جو یک رنگی کا
ہمزباں ہو کے رہیں کیوں نہ طیور گلزار

دے وہی جام ہمیں بھی کہ مناسب ہے یہی
تو بھی سرشار ہو، تیرے رفقا بھی سرشار

"دلق حافظ بچہ ارزد بہ میش رنگیں کن
وانگہش مست و خراب ازرہ بازار بیار

*

معنی: حذر: دور بھاگنا۔ **صدائے زنہار:** خدا کی پناہ کی آواز۔ **گوسفند:** بکری۔ **پلنگ:** چیتا۔ **خرلنگ:** لنگڑا گدھا۔

یہ نظم عملاً حافظ شیرازی کے ایک شعر پر تضمین ہے۔ موضوع کے اعتبار سے تو اسے قدرے اہمیت دی جا سکتی ہے کہ یہ انگریز کے عہد میں ہندو اور مسلمانوں کے باہمی روابط اور ان کے سیاسی نظریات کی آئنہ دار ہے۔ اس نظم کو ایک تمثیل قرار دیا جا سکتا ہے جس کے کردار ہندو اور مسلمان ہیں۔ اقبال نے علی الترتیب ان کرداروں کو گائے اور اونٹ کی علامتوں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ تاہم تکنیکی سطح پر یہ انتہائی کمزور نظم ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ اسے ظریفانہ کلام میں شامل کیا گیا ہے جب کہ اس میں نہ تو ظرافت ہے نا ہی طنز موجود ہے۔ محض ہندو کو گائے اور مسلمان کو اونٹ کی علامت سے تعبیر کرنا تو ظرافت نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ یہ اصلاح کے زمرے میں بھی نہیں آتی۔ بے شک اقبال بہت بڑے شاعر اور نظم نگار تھے لیکن محض اسی بناء پر تو اس نظم کو اہمیت نہیں دی جا سکتی کہ یہ اقبال کی نظم ہے۔ یہ امر بھی بڑی حد تک حیرت کا سبب ہے کہ اقبال نے اسے اپنے مجموعے میں شریک کیسے کر لیا جب کہ ان کی مسترد کی ہوئی بہت سی نظمیں اور اشعار جو "باقیات اقبال" میں موجود ہیں اس نظم سے کہیں بہتر ہیں۔

تاہم چونکہ یہ نظم "بانگ درا" میں شامل ہے اس لیے ضرورتاً اس کی تشریح بھی ناگزیر ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک روز گائے نے اونٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ حالات بے شک ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے میں تو اپنی رسی توڑ کر بدنام ہوئی تھی۔ اب سنا ہے کہ آپ بھی اپنی مہار تڑا بیٹھے ہیں۔ ہندوستان میں تو آج بھی اہمیت حاصل ہے لیکن صحرائے عرب میں ریل کا وجود ناکارہ ہے کل تک آپ گائے کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے تھے اور جسے ہم گواس ضمن میں آپ سے کچھ بات ہوئی ہرگز نہیں،

ہرگز نہیں کی صدا آتی تھی لیکن آج یہ کیسا انقلاب آگیا کہ ہم پر یہ عنایت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کے دل میں ہمارے خلاف کسی قسم کا کینہ باقی نہیں رہا۔

اونٹ نے گائے کی یہ تقریر سنی تو قدرے شرما کر بولا! سچ تو یہ ہے کہ تیرے چاہنے والوں میں ہمیشہ ہمارا شمار رہا ہے اور جب تو مستانہ وار چلتی ہے تو ہم تیری ہر ادا پر فدا ہونے کو تیار رہتے ہیں اور تو نے اب جو ہنگامے برپا کیے ہیں تو جنگل کے دوسرے بے زبان جانوروں میں بھی شعور پیدا ہو گیا۔ ہم اور تو آخر ایک عرصے سے اس جنگل میں یکجا رہتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ہم چارہ بھی ادھار کھاتے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ جنگل کے تمام جانور ایک سے خیالات اختیار کر لیں تو ان کا وقار بحال ہو سکتا ہے۔ باغ کا مالک اگر سب کو باہمی اتحاد و یک رنگی کا درس دے تو باغ کے سارے پرندے محبت اور یگانگت کے لہجے میں گفتگو کرنے لگیں گے۔ سوائے گائے! بہتر یہی ہے کہ باغ کا مالک ہونے کے ناطے ہمیں بھی کچھ دے تاکہ ہم بھی خوش رہیں اور ہمارے رفقاء بھی خوش رہیں۔

آخری شعر حافظ شیرازی کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حافظ کی گدڑی کو جس قیمت پر بھی ہو رنگین کرو۔ اور اس انداز میں اسے شراب سے بدمست کر کے بازار جاتے ہوئے پکڑ لاؤ۔

اقبال کی یہ تمثیل گائے (ہندو) اور اونٹ (مسلمان) دو کرداروں کے حوالے سے اس امر کی غماز ہے کہ ہندوستان میں مغلوں کے زوال اور انگریز کے تسلط کی بنا پر ہندوؤں نے انگریزوں سے خوشگوار تعلقات قائم کر لیے۔ دوسری طرف چونکہ انگریز کو بھی یہاں اپنی حمایت درکار تھی اس لیے انہوں نے بھی مسلمانوں کے مقابلے پر ہندوؤں کی پذیرائی کی لیکن جب اول الذکر نے اقتدار کے خلاف تحریک چلائی تو مسلمانوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے انگریز سے تعاون کیا۔ حتیٰ کہ تحریک خلافت کے سبب ان کا بھی انگریز سے شدید اختلاف ہو گیا۔

اس صورت حال میں بیشتر ہندو اور مسلمان رہنماؤں نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کی کہ دونوں متحد ہو کر آزادی کے لیے انگریز کے خلاف تحریک چلائیں جب کہ ماضی کے تجربات کی روشنی میں بعض مسلم رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ ہندو چونکہ تعداد کے اعتبار سے اکثریت میں ہیں اس لیے اقلیت ہونے کے ناطے مسلمانوں کے حقوق کو تسلیم کریں۔ یہی داستان اس نظم کی لب لباب ہے۔

(20)

192

رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے ماجرا اپنی ناتمامی کا
مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بسوہ دار بے زحمت پی گیا سب لہو اسامی کا

*

معنی: **ناتمامی:** ناکامی۔ **بسوہ دار:** یعنی زمیندار۔ **اسامی:** کاشت کار۔

اقبال کہتے ہیں کہ رات ایک مچھر نے مجھ سے کہا کہ میں تو انتہائی تگ و دو کے بعد انسان کے جسم سے لہو کی ایک بوند حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہوں جب کہ زمیندار ہاتھ پیر ہلائے بغیر کاشتکار کا تمام

مال و متاع ہڑپ کر جاتا ہے۔ اس قطعہ میں جاگیرداری نظام پر کھری چوٹ کی گئی ہے کہ محنت کاشتکار کرتا ہے اور پیداوار سمیٹ کر جاگیردار لے جاتا ہے اور غریب کاشتکار ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔

193 (21)

یہ آیۂ نوجیل سے نازل ہوئی مجھ پر — گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا
کیا خوب ہوئی آشتی شیخ و برہمن — اس جنگ میں آخر نہ یہ ہارا نہ وہ جیتا
مندر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے بدری — مسجد سے نکلتا نہیں ضدی ہے مسیتا

*

معنی: آشتی: صلح۔ شیخ و برہمن: مراد ہے مسلمان اور ہندو۔ بدری: یعنی ہندو۔ **مسیتا:** مراد ہے مسلمان۔

زیرِ تشریح قطعہ کا پس منظر ایک روایت کے مطابق یہ ہے کہ انگریز کے خلاف ترکِ موالات اور تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد گاندھی کو زیرِ حراست رکھا گیا تو انہوں نے جیل سے اپنے اخبار "نوجیون" کو ایک مضمون اشاعت کے لیے بھجوایا جس میں بنیادی بات یہ تھی کہ میں نے قرآن اور گیتا دونوں کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ دونوں کی تعلیمات میں یکسانیت ہے۔

اقبال نے جب یہ مضمون پڑھا تو طنزیہ انداز میں زیرِ تشریح قطعہ لکھا جس میں گاندھی کے اس نقطہ نظر کا ذکر کرتے ہوئے کہ قرآن اور گیتا کی تعلیمات میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہو گی کہ اسلام اور ہندومت کے مابین یکسانیت پیدا کی جا رہی ہے اور شیخ و برہمن کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہے کہ دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو تو اپنے عقائد سے بہت عرصے قبل بیزار ہو چکا ہے جب کہ گاندھی مسلمانوں کو بھی اسی سطح پر لانا چاہتے ہیں کہ وہ بھی اپنے مذہب سے لاتعلق ہو جائیں۔

194 (22)

جان جائے ہاتھ سے جائے نہ ست — ہے یہی اک بات ہر مذہب کا تت
چٹے بٹے ایک ہی تھیلی کے ہیں — ساہوکاری، بسوہ داری، سلطنت

*

معنی: ست: سچ۔ تت: روح۔ بسوہ داری: زمینداری۔

اس قطعے میں کہا گیا ہے کہ صحیح کردار کا انسان وہ ہے جو اس امر کا پوری طرح قائل ہو کہ بے شک جان جاتی ہے تو چلی جائے لیکن سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ کہ سچائی ہی کائنات میں بنیادی حقیقت کی حامل ہوتی ہے۔ یہی اصول دنیا کے ہر مذہب اور عقیدے کا سب سے اہم جزو ہے چنانچہ اس حقیقت کا اظہار بلا تامل کیا جا سکتا ہے کہ ساہوکاری، جاگیرداری اور حکومت ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ تینوں علی الترتیب مقروض، کاشتکار اور عوام کا خون چوستے ہیں۔

(23)

195

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے
دیکھیے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون

حکمت و تدبیر سے یہ فتنہ آشوب خیز
ٹل نہیں سکتا "وقد کنتم بہ تستعجلون"

کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرف "ینسلون"

شام کی سرحد سے رخصت ہے وہ رند لم یزل
رکھ کے میخانے کے سارے قاعدے بالائے طاق

یہ اگر سچ ہے تو ہے کس درجہ عبرت کا مقام
رنگ اک پل میں بدل جاتا ہے یہ نیلی رواق

حضرت کرزن کو اب فکر مداوا ہے ضرور
حکم برداری کے معدے میں ہے درد لایطاق

وفد ہندوستاں سے کرتے ہیں سر آغا خاں طلب
کیا یہ چورن ہے پے ہضم فلسطین و عراق؟

*

معنی: صف آرا: صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ **فتنہ آشوب خیز:** طوفان بپا کرنے والا فتنہ۔ **یاجوج اور ماجوج:** دو قوموں کے نام ہیں۔ **درد لایطاق:** شدید درد۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال ہر نوع کے سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف تھے۔ اس حقیقت کے اظہار ان کے اشعار میں جابجا ہوتا ہے چنانچہ زیر تشریح قطعہ میں بھی انہوں نے اسی حوالے سے ایک نکتہ اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ عصری صورتحال یہ ہے کہ محنت کش اور سرمایہ دار اب ساری دنیا میں ایک دوسرے کے مقابلے پر صف بستہ ہو گئے ہیں۔ بالفاظ دگر سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک ایک دوسرے کے خلاف صفیں باندھے کھڑے ہیں۔ اقبال قرآنی آیات کے حوالے سے یہ مفہوم پیدا کرتے ہیں کہ اس کا تو علم نہیں کہ ان دونوں طاقتوں کے مابین جو جنگ ہو گی اس میں کون جیتے گا اور کون ہارے گا البتہ یہ طے ہے کہ اس جنگ میں دونوں طاقتوں کی بہت سی تمناؤں کا خون ہو جائے گا۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمانوں یاد رکھو کہ یہ طاقتیں خدا کے وعدوں پر شک کرتی ہیں ان پر خدا کا عذاب جلد ہی نازل ہونے والا ہے اور یہ دونوں نظام ایک دوسرے کو نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔ قطعے کے ایک مصرع میں اقبال نے یاجوج ماجوج کا جو حوالہ دیا ہے تو ایک روایت کے مطابق زمانہ قدیم میں یاجوج ماجوج دو جنگجو قومیں ہوتی تھیں جو ہر لمحے تباہی مچاتی رہتی تھیں۔ حکم خداوندی کے پیش نظر ایک پیغمبر نے ان کے درمیان بلند دیوار تعمیر کر دی جس کو یہ لوگ دن بھر چاٹتے رہتے ہیں لیکن رات کو یہ دیوار پھر سے بلند ہو جاتی ہے تاہم روز قیامت کے نزدیک یہ قومیں دیوار کو چاٹ لیں گی اور پھر سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو کر دنیا بھر کی تباہی کا سبب بن جائیں گی۔ ایک طرح سے اقبال نے سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک کو یاجوج ماجوج سے تعبیر کیا ہے۔

یہ قطعہ ایک مخصوص سیاسی پس منظر کی روشنی میں خاصا اہم ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دور میں ترکی ایک وسیع مملکت شمار ہوتی تھی۔ عرب بھی اس کے زیر نگیں تھے۔ انگریزوں نے ترکی کو کمزور کرنے کے لیے عرب ممالک کو اکسایا کہ وہ ترکی کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ اس بغاوت کو انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ حجاز کی سلطنت شریف حسین کے حصے میں آئی۔ شام کی مملکت امیر فیصل کو تفویض ہوئی۔ امیر عبداللہ شرق اردن اور عراق امیر زید کے زیر تسلط آ گیا۔ فلسطین کو انگریزوں نے اپنے زیر انتظام رکھا بلکہ عراق اور فلسطین کے لیے ایسا نظام حکومت طے کیا جسے سیاسی اصطلاح میں "منڈیٹ" یا

حکم برداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ عراق اور فلسطین کے حکمران دونوں انگریزی کی زیر کفالت نظام حکومت چلائیں گے۔

گر یہ تجویز پوری طرح سے کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ شام کے باشندوں نے امیر فیصل کی حکمرانی کو مسترد کر دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا اور اس میں شرکت کے لیے فرانس کو شام سے اپنی افواج بلوانی پڑیں۔ یہ سلسلہ یوں تو جنگ عظیم کے بعد بھی جاری رہا لیکن اقبال نے زیر تشریح قطعہ شام سے فرانسیسی فوج کی واپسی کے پس منظر میں ہی لکھا ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ۔

فرانسیسی عساکر جو ہمیشہ شراب میں بدمست رہا کرتے ہیں اب مجبور ہو کر شام کی سرحدوں سے واپس جا رہے ہیں۔ رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے پسپائی کے وہ اطوار بھی نظرانداز کر دیے ہیں جو مبارزت کے حوالے سے پیش آیا کرتے ہیں۔ بہرکیف فرانسیسی افواج شام سے فرار ہو گئی ہیں۔ یہ بڑا عبرت انگیز مقام ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات کس طرح تغیرپذیر ہوا کرتے ہیں۔ لارڈ کرزن جو ان ایام میں برطانیہ کا وزیر خارجہ تھا اور بعد میں ہندوستان کا وائسرائے بنا اسے عراق و فلسطین میں حکم برداری کا نظام ناکام ہوتا نظر آیا تو سر آغا خاں کے مشورے سے ہندوستان کے سرکردہ مسلمانوں کا ایک وفد انگلستان طلب کیا۔ اس ضمن میں اقبال استفسار کرتے ہیں کہ کیا یہ وفد اس لیے ترتیب دیا جا رہا ہے کہ اس کی وساطت سے انگریز عراق و فلسطین کو باسانی ہضم کریں۔ اس قطعے سے اقبال کی سیاسی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔

196 (24)

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز — دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ، کرے جو زراعت اسی کا کھیت — کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو — بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے — جو زیر آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

*

معنی: مزارع شوریدہ حال: بدحال کاشت کار۔

زمین کی ملکیت کے پس منظر میں اقبال نے ایک اہم اور دلچسپ نکتہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز مالک اور مزارع کے مابین یہ تکرار ہو رہی تھی کہ زمین کا مالک کون ہے؟ دونوں ہی اس امر کے دعویدار تھے کہ زمین اس کی ملکیت ہے مزارع کا کہنا تھا کہ جو بھی زمین پر کاشت کرے وہی شخص اس کا مالک بھی ہوتا ہے۔ مالک نے جواباً کہا کہ شاید تیری عقل ٹھکانے نہیں ہے۔ زمین پر چونکہ قبضہ میرا ہے اس لیے میں ہی اس کا مالک بھی ہوں۔

اقبال کہتے ہیں کہ مزارع اور مالک کی تکرار اور استدلال کو سن کر میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس ضمن میں زمین سے ہی پوچھ لیا جائے کہ آخرکار تو کس کی ملکیت ہے۔ زمین نے چند لمحے سوچ کر جواب میں کہا کہ اے اقبال! مجھے تو صرف اس امر پر ہی یقین ہے کہ یہ مزارع و مالک کی تکرار قطعی بے معنی ہے۔ میں تو بس اسی قدر جانتی ہوں کہ نہ مزارع ہی میرا آقا ہے نا ہی مالک کو میری ملکیت سے کچھ سروکار ہے۔ اس

کے برعکس حقیقت بس اسی قدر ہے کہ جو اس آسمان کے نیچے بود و باش رکھتا ہے۔ وہ میرا ہی مال ہے یعنی یہ کہ بالاخر ایسے ہر شخص کا مقدر موت ہے اور فنا ہونے کے بعد اسے یقیناً زیرِ زمین ہی دفنایا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ کون کس کا مال ہے۔

197

(25)

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

الکشن، ممبری، کونسل، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

•

اس قطعہ میں اقبال انگریز کی لائی ہوئی تہذیب پر شدید طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تہذیب جدید تو گندے انڈوں کی مانند ہے۔ اور یہ گندے انڈے چونکہ استعمال نہیں کیے جا سکتے اس لیے ان کو باہر گلی میں پھینک کر ضائع کر دینا چاہیے۔ مراد یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریز کی آمد کے ساتھ ساتھ ایک نئی تہذیب بھی آ گئی ہے اور ہمارے نوجوان اس تہذیب سے متاثر ہو رہے ہیں تو انہیں بتا دینا چاہیے کہ یہ تہذیب کسی طور پر بھی ان کے لیے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔

انتخابات، ممبری، کونسل اور صدارت یہ سب اسی تہذیب کے پیدا کردہ ہیں۔ جن کو انگریز نے ہندوستانیوں پر آزادی کے نام سے مسلط کیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حقیقی آزادی نہیں بلکہ ان کے ذریعے آزادی کو دور تر لے جانے کا ذریعہ ہیں۔ دراصل یورپی استعمار نے آزادی کے نام پر جو عیاریاں مقامی رہنماؤں کو سکھائی ہیں کہ جب وہ ان کو بروئے کار لاتے ہیں تو خود ہی ان عیاریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

زیرِ تشریح قطعہ کے آخری شعر سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ یورپ میں نئی ایجادات کے حوالے سے جو مشینری یہاں ہندوستان میں بھیجی جاتی ہے مقامی ماہرین جب ان کو استعمال کرتے ہیں تو بات اس مشینری تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ وہ یورپی تہذیب کے اثرات بھی قبول کرتے نظر آتے ہیں۔

198

(26)

کارخانے کا ہے مالک مردک ناکارہ کار
عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار

حکمِ حق ہے لیس الانسان الا ما سعی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

•

معنی: لیس للانسان الا ما سعی انسان اسی چیز کا حقدار ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔

اقبال کا یہ قطعہ بھی ظرافت اور طنز دونوں سے یکسر عاری ہے۔ نہ جانے انہوں نے اسے اپنے ظریفانہ کلام میں کس لیے شریک کیا ہے جب کہ اس سے قطعی طور پر یہ عناصر غائب ہیں۔ بہرحال اس قطعے میں اقبال کہتے ہیں کہ کارخانے کا سرمایہ دار مالک ناکارہ اور عیاش ہے کہ مالک ہوتے ہوئے کوئی کام بھی

اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا اور شب و روز چین کی بنسری بجاتا رہتا ہے جب کہ قرآن کریم کی رو سے خدائے پاک کا یہ حکم ہے کہ انسان اسی شے کا حقدار ہے جو اس نے ذاتی کوشش اور جدوجہد سے حاصل کی ہو اس حکم کے پیش نظر کارخانے دار جو مزدور کی محنت کا پھل ہڑپ کر جاتا ہے اس کا بھلا کیا جواز ہے؟

دراصل اس قطعہ میں اقبال نے اسلام اور قرآن کے نقطہ نظر سے محنت و سرمائے کے مسئلے کا جائزہ لیا ہے اور محنت کش کے حقوق کو واضح کیا ہے۔ اقبال نے بعض دوسری نظموں اور اشعار میں بھی اس موضوع پر بڑے واضح اور جرأت مندانہ انداز میں بات کی ہے۔

199

(27)

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں	پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانا دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا	کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

●

اقبال کہتے ہیں کہ میرے علم یہ بات آئی کہ کل کارخانے میں محنت کشوں کے مابین یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ہم لوگ تو خیر پرانے اور بوسیدہ جھونپڑوں میں رہائش پر مجبور ہیں اور وہیں کسی ایک جھونپڑے میں ضرورت کے وقت اکٹھے ہو کر اپنے برے بھلے مسائل پر گفتگو کر لیتے ہیں لیکن سرکار نے یہ بہت اچھا کیا کہ کونسل ہال تعمیر کروا دیا۔ اس لیے کہ سرمایہ داروں کے پاس ہماری طرح مذاکرات کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

دراصل اقبال نے یہ طنز اس کونسل ہال کے تعمیر کے حوالے سے کیا ہے جو انگریزوں نے جمہوریت کا فریب دینے کے لیے ہندوستان میں تعمیر کرایا تھا تاکہ لوگ انتخابات میں کامیاب ہو کر جب وہاں پہنچیں تو دنیا پر یہ امر واضح کیا جا سکے کہ مقامی سطح پر عوامی نمائندے ملکی و قومی مفادات کو زیر بحث لانے کے لیے یہاں جمع ہو سکتے ہیں۔ جب کہ اس نوع کے عوامی نمائندوں کی حیثیت محض خوشامدیوں کی تھی اور وہ انگریز حاکموں کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہہ سکتے تھے۔

200

(28)

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے	من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا
کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا	تو نام و نسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں، پر کیا لذت اس رونے میں	جب خون جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے	گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی نہ بنا

●

معنی: اپدیشک: معلم، ناصح

اس غزل کے چار اشعار میں سے تیسرے شعر کے علاوہ باقی اشعار میں طنزیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ پہلا

شعر تقسیم سے قبل ایک خاص واقعہ کی نشاندہی کرتا ہے جس کے مطابق شاہ عالمی کے قریب دو سڑکوں کے قریب ایک قطعہ زمین پر مقامی مسلمانوں نے راتوں رات مسجد تعمیر کر دی تھی۔ یہ مسجد آج بھی اسی طرح موجود ہے بلکہ اس شعر کے سبب بھی اسے تاریخی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس پس منظر میں اقبال طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایمان کی حرارت رکھنے والوں نے راتوں رات مسجد تو تعمیر کر دی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے دل تو پرانے گناہگار ہیں۔ برسا برس گزرنے کے باوجود نماز کے عادی نہ ہو سکے۔

بعض شارحین اور نقاد حضرات کا خیال ہے کہ پہلے مصرعے میں اقبال نے ان مسلمانوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے جنہوں نے جوش ایمانی کی مدد سے متنازعہ علاقے میں مسجد تعمیر کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ تاہم پورے شعر سے واضح طور پر بات سامنے آتی ہے کہ یہ وضاحت درست نہیں۔

اس شعر میں اقبال نے حبشہ کے حکمران سنوسی کے ایک پیغام کے حوالے سے بات کی ہے جو اس نے والی حجاز امیر فیصل کو بھجوایا تھا اور وہ پیغام یہ تھا کہ تو محض نام و نسب کے اعتبار سے حجازی یعنی عرب ہے جب کہ تجھ میں قلبی سطح پر عربوں والی کوئی بات نہیں۔ اس کے برعکس تو تو فرنگیوں کا حاشیہ بردار بنا ہوا ہے۔ اس پیغام کا پس منظر یہ ہے کہ افریقی باشندہ ہوتے ہوئے بھی سنوسی نے ترک جرنیل انور پاشا کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا تھا۔ جب کہ فیصل اور دوسرے عرب حکمرانوں نے انگریزوں کی اعانت کی تھی چنانچہ یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ عربوں اور ترکوں کے باہمی آویزش کی بنا پر انگریز اور دوسرے یورپی ممالک نے بڑا فائدہ اُٹھایا اور ادھر ترکی ہی نہیں بلکہ خود عرب حکومتیں بھی کمزور اور غیر مستحکم ہوتی گئیں۔

تیسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ اسلام کا نام سنتے ہی ہماری آنکھیں تو آنسو بہانے لگتی ہیں لیکن اس نوعیت کے رونے میں آخر کیا لطف ہے۔ رونا تو وہ ہوتا ہے جب جگر کا خون بھی آنسوؤں میں شامل ہو اور ان کا رنگ پیاز کی مانند گلابی ہو جائے۔ جس سے یہ اندازہ بھی ہو سکے کہ رونے والے کے دل میں انتہائی خلوص شامل ہے۔ بصورت دیگر اسلام کے نام پر آنسو ٹپکانے والے اور عملاً اسلام کے لیے کچھ نہ کرنے والے حقیقتاً اسلام کی کوئی خدمت نہیں کرتے۔

چوتھے اور آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ وعظ و نصیحت کے سلسلے میں تو اقبال بے شک لاجواب ہے۔ وہ اتنے خوبصورت انداز میں نصیحت کرتا ہے کہ سننے والوں کے دل مٹھی میں لے لیتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ گفتار کا غازی تو بن گیا مگر اپنے ذاتی کردار کے حوالے سے بلند نہ ہو سکا۔ دراصل اس شعر میں اقبال نے تمثیلی سطح پر تو اپنا نام بنالیا ہے لیکن اس کا اشارہ مذہبی اور قومی رہنماؤں کی طرف ہے کہ محض باتیں ہی باتیں کرتے ہیں عملی سطح پر ان کا کردار منفی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی بے عملی نے ہی مسلمانوں کو بحیثیت قوم بے حد نقصان پہنچایا ہے لطافت اور لفاظی میں ان کا جواب نہیں لیکن عمل سے بے بہرہ ہیں۔

پیشکش:مجلس اقبال
نشر و توزیع:محمد اسلم باقر

شارح: اسرار زیدی

تشریح الفاظ: نثار اکبر آبادی